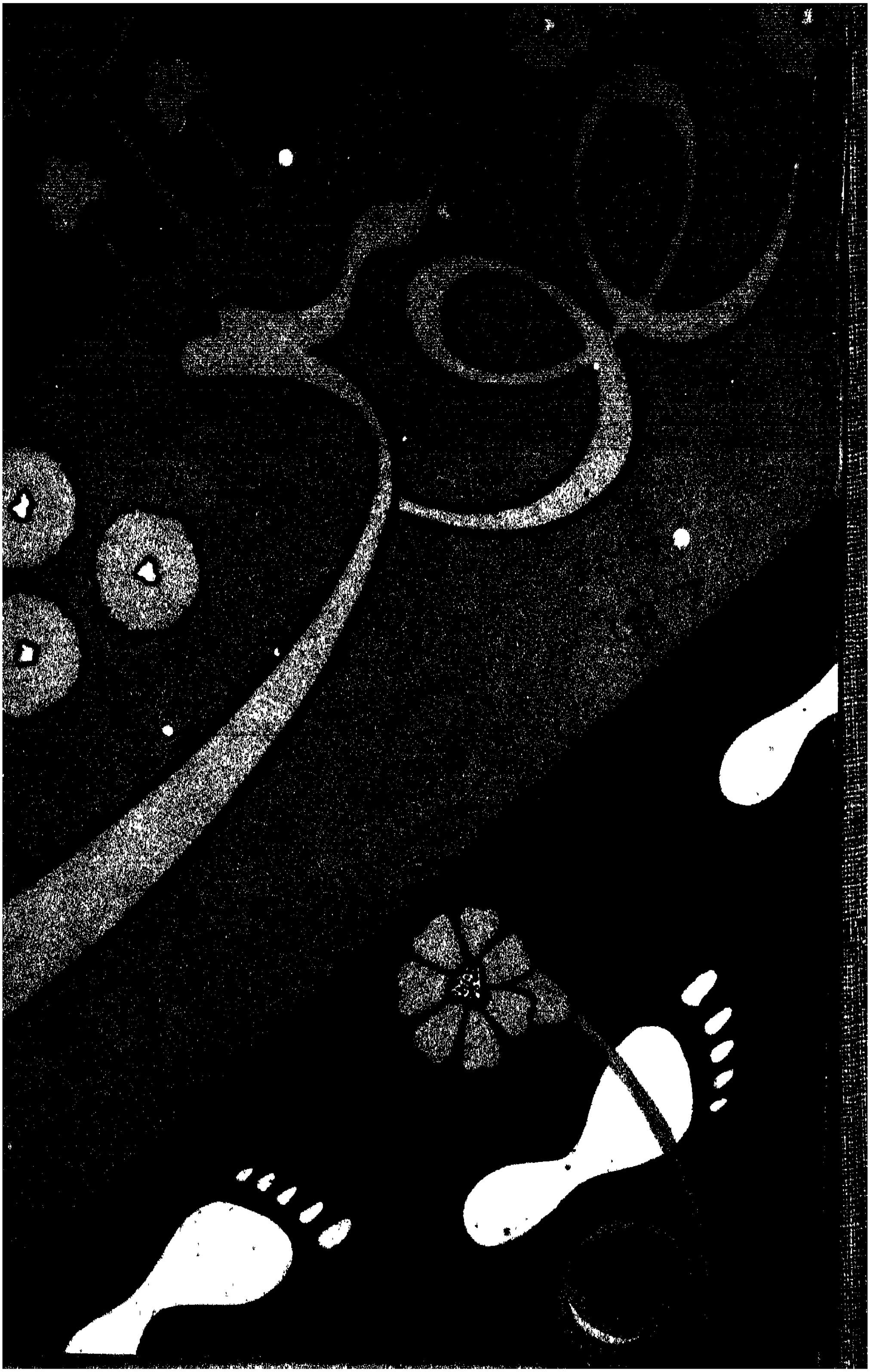


زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

جون ۱۹۵۷ء

۶۳، ۶۴

مرتب

محمد طفیل

قیمت
۳/-

سالانہ چندہ
بیس روپے

ادارۂ فروغِ اردو - لاہور

ترتیب

افسانے

ڈرامے

نظمیں، غزلیں

مضامین

محمد طفیل، پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

اب کے کچھ ایسی بے ڈھب مصروفیت رہی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ یہ چند سطریں بھی لاہور سے پشاور جاتے ہوئے ٹرین میں لکھ رہا ہوں۔

اس شمارہ کی تدوین کے سلسلے بارے میں اتنا ہی عرض کروں کہ یہ سرسری جلد بہ جلد زیادہ اہل علم کی عنایتوں کا مرہون منت ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

فراق صاحب کی خدمت میں مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ہاں آپ کا وہ خط نہیں چھاپا، جو آپ نے اثر صاحب کے بارے میں لکھا ہے اور نہ آئندہ اثر صاحب کا کوئی اس نوعیت کا خط چھپے گا۔

فراق صاحب اور اثر صاحب جب دونوں ہی میرے کرمفرما ہیں تو کیوں نہ ان کی خدمت میں گزارش کروں کہ اس سلسلے کو ختم ہی کر دیں۔ اور مصحفی و انشا کی یاد پھر تازہ نہ کریں کہ ہم اس حادثہ کو بھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

نقوش کا آئندہ شمارہ مکاتیب نمبر ہوگا۔ جو کچھ میں دو ڈھائی برس میں کر سکا وہ پیش کر دوں گا۔

مدت سے آرزو تھی کہ نقوش اپنا پریس قائم کرے۔ الحمد للہ کہ اب یہ شمارہ نقوش پریس میں چھپ کر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے ہم پرنٹنگ کے معیار میں بھی کچھ اضافہ کر سکیں۔

ابھی میں نے یہ چند سطریں ہی لکھی ہیں کہ ایک صاحب نے کہا ہے "مہربانی کر کے لائٹ آف کر دیجئے"

محمد طفیل



فراق گورکھپوری



ابو سعید قریشی



اے حمید





نقوش پریس کے افتتاح پر

گُل مہر

کرشن چندر

الیکشن کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ پولنگ کا دن آ گیا۔ میں نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"اے نیک بخت تم کسے ووٹ دو گی؟"

ہمارے حلقہ میں سے پانچ امیدوار تھے۔ حاجی عبدالرزاق کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے تھے۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ کسی ٹکٹ پر بھی کھڑے ہوں باندرہ اور کھار کے علاقوں میں رہنے والے تیس ہزار مسلمانوں کے ووٹ انہی کو جائیں گے کیونکہ وہ باندرہ کی بوہرہ برادری کے رہنما مانے جاتے تھے۔ دوسرے امیدوار شانتی لال ڈیسائی تھے جنہوں نے کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور جب اس میں ناکام ہوئے تو جھٹ سے پرجا سوشلسٹ ٹکٹ لے لیا۔ بڑے نیک دل اور دیانت دار سرمایہ دار تھے۔ ہمارے حلقہ کے پینتالیس ہزار گجراتیوں کے ووٹ گویا ان کی جیب میں تھے۔ باقی ٹکٹ مل بھی تو کوئی چیز ہے بھئی اس دنیا میں۔

تیسرے جن سنگھی امیدوار پروفیسر مول چند مولوانی۔ چہرہ لامبا بلکہ لمبوترا بلکہ بالکل مولی کا سا۔ رنگ بھی مولی کی طرح سپید۔ آنکھیں بھید بھری اور بڑی پھرتی سے ادھر ادھر گھومتی ہوئیں۔ بات کرنے پر آ جائیں تو سارے امیدواروں کو چپ کرا دیں۔ الیکشن میں ایسے آدمی ہی بالعموم اپنی ضمانت ضبط کرایا کرتے ہیں۔ چوتھے امیدوار چیئرمین چترویدی آنا تو کے رہنے والے تھے۔ ان کا آدمی عرصہ سے میرے ہاں دودھ دینے آتا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے، انہیں ووٹ دینا گویا ایک چوتھائی دودھ میں تین چوتھائی پانی کو ووٹ دینا ہے۔ ویسے اپنے علاقہ کے سب بھیے لاٹھی لنگوٹ سمیت ان کے حق میں تھے ٹکٹ انہیں رام راجیہ پریشد کا مل گیا تھا جو ایک عرصہ سے ایک ایسے اونٹ کی تلاش میں تھے جس کی گردن میں وہ الیکشن کی گھنٹی باندھ دیں۔ پانچواں امیدوار ہمارا یار غار جان نوبل فرنینڈ بیزڈی سوزا تھا جو وقت بے وقت ہمیں سودیشی شراب سپلائی کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں اپنے علاقہ کی سب سے بڑی قومی انڈسٹری کا نمائندہ ہوں۔ اس کا الیکشن کا نشان ٹائر تھا جس میں وہ شراب بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا۔ علاقہ کے پچیس ہزار رومن کیتھولک ووٹ اس کی پشت پناہ تھے۔ جان نوبل فرنینڈ بیزڈی سوزا آزاد امیدوار تھا۔ کیونکہ گو اس کی شراب ہر سیاسی پارٹی کے لوگ پیتے تھے مگر شراب پینا اور بات ہے اور ٹکٹ دینا اور بات ہے۔

یہ پانچوں امیدوار ہمارے گھر آ چکے تھے۔ شری شانتی لال ڈیسائی کے تو مکان میں ہم رہتے تھے اور پانچ ماہ کا کرایہ باقی تھا انہوں نے کرایہ تو معاف نہیں کیا ہاں چلتے چلتے الیکشن کے بعد گٹر ٹھیک کرانے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ میں نے بھی ووٹ گٹر [illegible] میں

بلانے سے میرا مطلب ہے انہیں دینے کا وعدہ کر لیا۔ پھر ایک روز حاجی عبدالرزاق آئے۔ ایک تو حاجی پھر کانگریسی پھر لوچڑ۔ میں نے انہیں ہاتھ جوڑ کے کہا۔ آپ تو ہماری حکومت کے نمائندے ہیں میں آپ کو ووٹ نہ دوں گا تو کسے دوں گا؟

حاجی جی نے مسکرا کر کہا "ہاں سرکاری بات تھی اہم کہ تمہارا ووٹ منگتا!"

ان کے ایک حواری نے میری طرف انگلی گھماتے ہوئے کہا "یہ اردو میں لکھتے ہیں۔"

اردو کا نام آتے ہی حاجی جی کی باچھیں کھل گئیں حالانکہ وہ خود اردو اسی طرح بولتے تھے جس طرح وہ بکرے کے گلے پچھری پھیرتے تھے مگر بے حد خوش ہو کر بولے "تمی اردو نا لکھاری چھے!"

حواری نے لقمہ دیا "موٹو لکھاری!" (بڑا لکھاک)

بس حاجی جی گویا میرا ووٹ اپنی موٹی توند میں ڈال کر چلے گئے۔

پروفیسر مول چند مولوانی کا انداز کچھ اس طرح کا تھا:

"سائیں تم پنجابی ہیں سندھی؟ کیوں؟" انہوں نے آنکھ مار کر میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا —— میں نے کہا بالکل ٹھیک ہم دونوں ہیں جی! دونوں ہاں سنا ہیوں کے سناتے ہوئے! ہا ہا ہا۔ مولوانی زور سے میرے منہ کے قریب آ کر اس طرح ہنسا کہ اس کے منہ کا لعاب میری آنکھوں میں جا گرا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر سوچا کیا معلوم کل کلاں کو یہی صاحب اسمبلی کے ممبر ہو جائیں اس لئے میں نے بھی ان کی ہنسی میں ہنسی ملائی اور اپنے تھوک کا فوارہ ان کے رخساروں پر بکھیر دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک ہم دونوں جیب سے رومال نکال کر اپنا اپنا چہرہ صاف کرنے میں مصروف رہے۔

اس کے بعد پروفیسر مولوانی صوفہ سے اٹھا اور بولا "مگر تم یونیورسٹی کے لئے ٹیکسٹ بک کیوں نہیں لکھتے ہو۔ سینٹ میں تمہاری مہربانی سے میرا اتنا رسوخ تو ہے کہ ——"

میں نے کہا الیکشن کے بعد لکھوں گا۔

"آل رائٹ۔ تو ووٹ جن سنگھ ——" مولوانی نے لہرا کر کہا۔

"جے اکھنڈ بھارت!" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔

چنز سین چنز ویدی کے ووٹ مانگنے کا طریقہ ہمیں سب سے زیادہ پسند آیا۔ ایک روز دودھ بہت عمدہ تھا۔ میں نے حیرت میں آکر اپنی بیوی سے پوچھا۔ اس نے اور بھی حیران ہو کر دودھ والے سے پوچھا:

"ہم نے تمہارا پچھلا حساب تو صاف کر دیا ہے نا؟"

"ہاں کر دیا ہے۔"

"پھر بھی دودھ اس قدر عمدہ کیوں آ رہا ہے؟"

دودھ والا مسکرایا۔ بولا "بی بی جی! اگر چنز سین چنز ویدی جی کو ووٹ دو گے تو دودھ ایسا ہی عمدہ ملا کرے گا۔"

بڑا نا بڑا لالچ تھا کہ ہم لوگ انکار نہ کر سکے مگر اس کے دوسرے دن بعد ہی ٹڈی سوڈا شراب کی ایک بوتل لے کر میرے پاس آ گیا۔

"اصلی تا تیرہ الامال ہے۔"

"واقعی مال تو بہت عمدہ ہے" میں نے چکھ دے کر کہا "بے حد عمدہ ہے۔"

ڈی سوزا خوش ہو کر بولا "اب تو فارن ایجنسی کے لوگ بھی یہی پینے ہیں۔ کہتے ہیں یہ تو انڈین جن ہے اور جو اس کے نشے میں رنگ ہے، وہ اور کسی ملک کی شراب میں نہیں ہے۔ پیو!"

مجھ میں یہ بہت بُری بات ہے کہ جتنا پیتا جاتا ہوں اتنا سنجیدہ ہوتا جاتا ہوں۔ چوتھے پیگ پر میں نے ڈی سوزا کا ہاتھ روک کر پوچھا "جان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی جب ملک کانگریس ہے، پروہیبشن ہے۔ پھر تمہیں الگ سے اپنا نمائندہ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟"

جان پورا پیگ پی گیا۔ اُلٹے ہاتھ سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا "سنو پیارے! پروہیبشن کے اندر جو دھاندلی یعنی دھندا چلتا ہے اس کا کچھ اندازہ کانگریسیوں کو ہونا چاہتا ہے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ بس اس چیز کو روکنا چاہیے اور پروہیبشن کو اسی طرح کامیاب سے کامیاب تر بنانا چاہیے ——— ورنہ ———؟"

"ورنہ ———" میں نے پوچھا۔

"ورنہ مجھے واپس گوا جانا ہوگا۔" ڈی سوزا نے بڑے اُداس لہجہ میں کہا۔

"نہیں دوست تم واپس گوا نہیں جاؤ گے۔ ٹائیبر والا مال زندہ باد۔" میں نے ٹھک کر کہا۔

اس طرح ہم نے پانچوں امیدواروں کو خوش کر دیا مگر پولنگ کے دن ایک ووٹ کے لئے ایک ہی پرچی ملتی ہے پانچ تو ملتی نہیں کہ ہر ایک امیدوار کو خوش کیا جا سکے۔ اس لئے پولنگ کے دن گھر سے چلتے وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ ووٹ آخر دیا جائے تو کسے دیا جائے؟ اس لئے میں نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"اے نیک بخت کسے ووٹ دو گی؟"

وہ خوش خصال اپنے دوپٹہ کو سر پر ڈال یوں گویا ہوئی "میں تو کانگریس کو ووٹ دوں گی۔"

"کیوں؟"

"میں کہہ جو دیا کہ کانگریس کو ووٹ دوں گی۔ کانگریس تو کانگریس ہے۔"

اس کے بعد جو اس نے بیلنا اٹھایا تھا کہ مجھے سر یاد آیا اور میں دونوں کان لپیٹے کچن سے باہر مگر وہ بیلنا اٹھائے میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور پوچھنے لگی:

"اور تم کسے ووٹ دو گے؟"

"میں تو اپوزیشن کو دوں گا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں؟" اس نے بیلنا ہوا میں گھمایا۔

میں نے کہا "ملک کے کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ اپوزیشن مضبوط ہو۔"

"بکواس!" میری بیوی فیصلہ کن لہجہ میں بولی اور کچن کے اندر چلی گئی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ اجی صاحب ووٹ دینا کوئی آسان کام ہے خاص طور پر ایک شادی شدہ آدمی کے لئے۔ پھر جا کے حلقہ سے ایک نہ دو پورے پانچ امیدوار کھڑے ہو جائیں؟ سرکار ووٹ دینے کا حق تو دیتی ہے، ووٹروں کی جان کی سلامتی کے لئے کیا کرتی ہے؟ ——— میں پوچھتا ہوں ......؟

ہم لوگ گھر سے نکلے اور گلیوں میں سے گذرتے ہوئے باندرہ کے چوک پر آ گئے۔ لوگوں کی ٹولیاں ووٹ دینے پولنگ بوتھ کی طرف بڑھ رہی تھیں جسے ایک پارسی خیرات خانے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس بوتھ سے ادھر سڑک پار کر کے بس کا سٹینڈ تھا جس کے پیچھے گل مہر کا ایک بہت بڑا درخت کھڑا تھا۔ اس کے سب پتے جھڑ چکے تھے لیکن ہر شاخ سُرخ سُرخ پھولوں کی شمعیں روشن کئے تھی۔ مردوں کا الگ کیو تھا، عورتوں کا الگ کیو تھا۔ میری بیوی تو عورتوں کے کیو میں چلی گئی، میں مردوں کے کیو میں کھڑا ہو گیا جو اتنا لمبا تھا کہ خیرات خانہ سے بس سٹینڈ کے پیچھے گل مہر کے پیڑ تک آ گیا تھا۔ کیو میں میں آخری آدمی تھا اور بالکل پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ اس پیڑ کے تنے پر کسی من چلے نے سفید پینٹ سے لکھ دیا تھا "مجھے ووٹ دو!"

درخت کو ووٹ دو؟ یہ کیا حماقت ہے، میں نے سوچا۔ پھر خیال آیا ممکن ہے کسی امیدوار کا انتخابی نشان پیڑ ہو اور کسی نے اس پیڑ کے تنے پر یوں لکھ دیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو پبلسٹی کا بہت عمدہ طریقہ ہے!

کیو بہت لمبا تھا۔ میری باری بہت بہت دیر میں آئے گی جب تک کیا کروں؟ ووٹ دینے تو آ گیا مگر اب تک یہ معلوم نہیں ووٹ کسے دوں؟ پانچوں امیدوار اپنے اپنے لیبلوں کے ہمراہ میرے سامنے گھومنے لگے۔

یکایک ایک بھاری پاٹ دار آواز سنائی دی ——— "مجھے ووٹ دو!"

میں نے گھبرا کر درخت کے تنے کی طرف دیکھا۔ واقعی یہ درخت بول رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں ووٹ دوں؟"

"ہاں!" گل مہر کا درخت بولا۔

"تم اس الیکشن میں امیدوار کھڑے ہو؟ کہ تم کسی کے انتخابی نشان ہو؟"

گل مہر کا درخت بولا "میں امیدوار ہوں اور یہی میرا انتخابی نشان ہے۔"

میں نے پوچھا "میں تمہیں ووٹ کیوں دوں؟"

"اس لئے کہ تم شانتی لال ٹریساڈی کے گھر رہتے ہو وہ تم سے ایک چھت کے تلے رہنے کے لئے پچھتر روپے کرایہ وصول کرتا ہے اور میری چھت تلے درجنوں گداگر، غریب آدمی، بیکار، مسافر آ کر سوتے ہیں اور میں ان سے ایک پیسہ کرایہ وصول نہیں کرتا۔ حاجی عبدالرزاق بکریوں کو قتل کرتا ہے۔ میں انہیں اپنے سایہ تلے پناہ دیتا ہوں۔ بکریوں کو بھی اور ان تھکے ہارے انسانوں کو بھی جو دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں سورج کی بے پناہ حدت سے گھبرا کر ٹھنڈک کی تلاش میں میری گود میں آتے ہیں۔ میرے ہرے ہرے پتے ان کے لئے پنکھا جھلاتے ہیں۔ تمہارے بجلی کے پنکھے کا کیا بل آتا ہے ———؟"

"ساڑھے تین روپے کبھی چار روپے۔"

"میں صرف خدمت کر کے خوش ہوتا ہوں اور اپنے گاہکوں سے کچھ نہیں لیتا۔ پروفیسر مول چند مولوانی کے دل میں ایک خاص قوم، ایک خاص ملک، ایک خاص مذہب کے لئے کتنی نفرت بھری ہے۔ مگر میں تو کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب، کسی رنگ اور نسل کے انسان سے نفرت نہیں کرتا۔ میرا سایہ ہر ایک کے لئے ہے، میں تو ہر ایک کو اپنی گود میں لے لیتا ہوں، ہر ایک سے یکساں پیار کرتا ہوں اور ہر ایک پر اپنی محبت یکساں تقسیم کرتا ہوں، میں کسی جات برادری کے تفرق کا قائل نہیں ہوں۔ ہر دیانت دار آدمی کو مجھے ووٹ دینا چاہیئے۔"

درخت اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "تمہیں الیکشن میں کھڑے ہونے کا خیال کیسے آیا؟"

گل مہر کے پیڑ نے انتہائی رازدارانہ لہجہ میں مجھ سے کہا "چند روز ہوئے چاندنی رات تھی۔ ایک آشفتہ مزاج پریشان حال شخص میرے پاس آیا اور میرے تنے سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ شاعر تھا اور اس نے محبت کی تھی اور جب کہیں پر اسے اپنی محبت کا سنگم نہ ملا تو وہ میرے تنے سے آکر لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنا محبوب جانا۔ اس نے میرے قامت کی تعریف کی، میری زلفوں کی بلائیں لیں، اس نے میری شاخوں کو کسی کی بانہیں جانا جن کی انگلیوں کی پوریں سُرخ پھولوں سے مزین تھیں۔ رنگ حنا کی صورت اور آخر میں اس نے ان سُرخ غنچوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ انسان کا بوسہ کس قدر حسین ہوتا ہے ——— پھر شاعر نے نگاہیں اٹھا کر میری شاخوں، میرے پتوں، میرے پھولوں سے اوپر آسمان کو دیکھا اور اس کا لہجہ بدل گیا اور اس کا گیت اونچا ہو گیا اور اس نے اس پیڑ کا راگ گایا۔ وہ پیڑ جو ایک دن ساری دنیا کو اپنی پُرامن آغوش میں لے لے گا۔ جب سائے سب کے لیئے ہوں گے اور پھل اور پھول سب کے لئے ہوں گے اور کوئی ہونٹ ترسے ہوئے نہ رہیں گے اور کوئی نگاہ تشنہ نہ رہے گی اور کوئی آواز نغمگی سے خالی نہ جائے گی ——— اس لئے آؤ! مجھے گل مہر کے پیڑ کو ووٹ دو! کیونکہ میں صرف ایک پیڑ نہیں ہوں۔ میں تو ایک خواب ہوں، ایک وعدہ ہوں، ایک تعبیر ہوں، ایک بشارت ہوں۔"

بہت دیر کے بعد جب میری باری آئی تو کسی نے میری چھنگلیا پر ووٹ دینے سے ایک سیاہ شناختی نشان لگایا تاکہ میں دوبارہ ووٹ دینے نہ آسکوں، پھر ایک صاحب نے ووٹ کی پرچی میرے ہاتھ میں تھما کر مجھے بوتھ کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ بوتھ کے باہر ایک چپراسی بیٹھا تھا۔

میں بوتھ کے اندر داخل ہوا۔ وہاں پانچوں امیدواروں کے بیلٹ باکس تھے۔ ہر صندوقچہ پر امیدوار کا انتخابی نشان چسپاں تھا۔ لیکن پیڑ کا نشان مجھے کہیں نہ ملا، میں اپنی پرچی واپس لیتے ہوئے بوتھ کے باہر آیا اور پوچھنے لگا "گل مہر کا بیلٹ باکس کہاں ہے؟"

"گل مہر کون؟ گل مہر نام کا یہاں کوئی امیدوار نہیں ہے۔"

"ہے!" میں نے غصہ سے چلّا کر کہا۔

"کہاں؟" پولنگ آفیسر نے برافروختہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔ باہر گل مہر کا پیڑ، جس کے تنے پر لکھا ہے مجھے ووٹ دو، میں اسی کو ووٹ دینا چاہتا ہوں۔ میں اسی کو ووٹ دینا چاہتا ہوں۔ اس کا بیلٹ باکس لاؤ۔ کدھر ہے اس کا بیلٹ باکس؟"

پولنگ آفیسر نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اس نے پولیس کے دو سنتریوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس پاگل آدمی کو بوتھ سے باہر لے جاؤ۔

باہر گل مہر کا درخت مضبوطی سے اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس کے پھولوں کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم تھا اور اس کی شاخوں کی بانہوں میں ایک عجیب سا بلاوا تھا ———

وہ شاعر سچ کہتا تھا!

آسرے

خدیجہ مستور

"اُوہ!" آج وہ اتنی اداس تھی کہ بڑی مدت بعد اس کے پھیکے پھیکے زرد رخسار آنسوؤں کی گرمی سے تمتما اٹھے۔ آج وہ اپنی زندگی کی تنہائی اور ویرانی سے بالکل اکتا گئی تھی ——— "اللہ میاں اگر اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا" ——— اس نے بلکتے ہوئے سوچا ——— کوئی حسرت، کوئی ارمان، کوئی تڑپ تو ہوتی اور ——— وہ سوچے چلی جا رہی تھی ——— اب اس سے بھلا کون پوچھتا کہ چند سال پہلے وہ شادی کے لئے کس قدر بے چین پھرا کرتی تھی۔ محلے ٹولے میں جب اس کی ہم عمر لڑکیوں کی شادیاں ہونے لگیں تو وہ بولائی بولائی پھرتی ——— اللہ میاں اب اس کے سہرے کے پھول بھی کھلا دے ——— تنہائیوں میں صرف یہی ایک دعا یاد رہ گئی تھی۔ شادی کے ارمان میں پڑھنے لکھنے سے جی اچاٹ، دس درجے پڑھ کر کالج جانے سے انکار کر دیا۔ رات دن پلنگ کے بان توڑ توڑ کر اماں باوا کو اپنے بھاری بوجھ کا احساس دلانے لگی اور اب جبکہ اس کی شادی ہو گئی تو پھر پیچھے کی طرف بھاگنا چاہ رہی تھی۔ کوئی ارمان نہ رہا تھا۔ کوئی کام نہ تھا۔ سخت فضول اور کاہل زندگی کے ساتھ ایڑیاں رگڑ رہی تھی ——— شادی کے سال چھ مہینے یوں گذر گئے جیسے ریل ایک اسٹیشن سے دوسرے قریبی اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ سفر کے شوق میں ایسی مگن کہ کبھی کھڑکی سے سر نکال کر کچھ دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی۔ شاید اسے وہ ویرانی نظر آتی جو ریل کے گذر جانے کے بعد اسٹیشن پر جھاڑو بن کر پھر جاتی ہے۔ ویرانی کا پتہ اس وقت چلا جب وہ خود بھی ایک ایسے ہی چھوٹے سے اسٹیشن پر پڑی رہ گئی۔ ریل اس کے سامنے سے گذر گئی اور کانوں میں انجن کی سنسناہٹ چھوڑ گئی۔ یہاں تو اب ٹکٹ کے دام ہی ختم ہو گئے تھے بھلا اب سفر کیسے جاری رہتا ——— تین بچے پیدا کر کے صورت پر ٹھیکرے ٹوٹ گئے ——— میاں کی مصروفیت حد سے بڑھنے لگی۔ سارا سارا دن گذرنے کے بعد کہیں رات گئے اس کی صورت دکھائی دیتی۔ بہت روتی گاتی تو پیار کے دو بول پلے پڑ جاتے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہونے لگا۔ گورنمنٹ سے عہدے جھٹکتے جھٹکتے اب اس کا میاں خاصا بڑا عہدے دار بن گیا تھا۔ اب بھلا وہ اس کی اعلیٰ سوسائٹی کا کب ساتھ دے سکتی تھی۔ خواب تو اس نے بہت دیکھے کہ افسروں کی دوسری بیبیوں کی طرح وہ بھی اپنے میاں کے ساتھ چہکتی پھرے گی مگر نہ تو اس کا برقعہ اترا اور نہ میاں نے لفٹ دی۔ ایسے خواب دیکھتے وقت وہ یہ بھول جاتی تھی کہ عہدہ اس کے شوہر کو ملا ہے نہ کہ اس کو۔ وہ تو اسی طرح ایک چھوٹے سے گھر کی لڑکی ہے صرف دس درجے تک پڑھی ہوئی ہے اور ناجز تو تین بچے پیدا کر کے اپنے منہ پر ٹھیکرے توڑ لیتے ہیں، جسم پھول کر آٹے کی بوری بن گیا ہے ——— پکا رنگ خوبصورت سہی پر جب زیادہ پکا ہونے لگے تو پھر کسی کسی کے کان برداشت کرتے ہیں۔ تیس سال کی عمر بھرپور جوانی سہی، مگر اس کا میاں بیچارہ اتنی موٹی اور جاہل جوانی کو اعلیٰ سوسائٹی میں لیجا کر کیا اپنی کرکری کرا لیتا ——— یہی کیا کم تھا کہ وہ اسے اپنے تین عدد بیٹوں کی ماں سمجھتا تھا سجے ہوئے گھر، بیرے اور خانساماں پر حکمرانی کرنے کے لئے بڑے آرام سے

اس کو گھر میں بٹھا دیا تھا ——— پر اس کا عجیب حال تھا۔ سجا ہوا گھر اور خانساماں کے ہاتھوں پکا ہوا کھانا دوزخ کی یاد دلا دیتا۔

چلو وہ بھی اچھے دن تھے جب اس کے بچے ذرا ذرا سے تھے۔ ان دنوں وہ مصروف تو رہتی۔ وقت کچھ آسانی سے گذر جاتا لیکن یہ بچے بھی کتنی جلدی بڑھ گئے، پھر کیسی جلدی سے ماں سے بیگانے بھی ہو گئے۔ اسکول سے آکر تینوں بچے آپس ہی میں کھیلتے رہتے۔ اللہ میاں نے اسے ایک لڑکی ہی دے دی ہوتی جس کا جہیز ہی سی کر اپنا دل بہلا لیا کرتی۔ زندگی ایسی بیکار اور سنسان تو نہ ہوتی۔ شوہر کی بڑائی کا جھوٹا غرور اور بھی ستم ڈھاتا، محلے ٹولے میں آنا جانا بھی ایک آنکھ نہ بھاتا۔ گھر ہی پر پڑی ایڑیاں رگڑا کرتی۔ چپ چڑے پڑے منہ سے بو آنے لگتی۔ بچے ایک ذرا دیر کو پاس آتے اور پھر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے۔ لڑکے ذات بھلا اس کے کولہے سے لگے بیٹھے رہتے۔ پھر کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بچے جذبات کے ابال کو ٹھنڈا کر دیں۔ آخر ایک دن وہ خود کو بہلانے کی خاطر محلے ٹولے کا سہارا ڈھونڈھنے لگی۔ بلڈنگ کے ہر فلیٹ میں جانا شروع کر دیا۔ ابھی اس فلیٹ میں بیٹھی ہے تو ابھی دوسرے میں۔ اغوا سے لے کر کپڑے سلنے تک کے موضوع ختم ہو جاتے پر سر رکھنے کا نام نہ لیتا۔ اس طرح وہ ہر وقت کے سوچ بچار اور دکھوں سے بچ گئی تھی۔ مصروفیت چاہے کتنی ہی بیکار سی ہو مگر سچی بات ہے کہ دکھوں کی آگ کو راکھ تلے دبا دیتی ہے۔

ایک دن یہ مصروفیت بھی ختم ہو کر رہی۔ اس کے شوہر کا عہدہ ذرا اور آگے سرک گیا۔ ساتھ ہی تبادلہ بھی ہوا اور کراچی کو چھوڑ کر اب وہ سب یہاں آ گئے۔ گورنمنٹ آفیسر کی نئی آبادی تھی۔ پیلی پیلی کوٹھیاں اسے پکتے پھوڑے کی طرح ٹپکتی معلوم ہوتیں۔ وہ چھپ چھپ کر پہروں روتی لیکن صبر نہ آتا۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد جیسی جیسی آبادی بڑھتی ویسے ویسے کماتے پیتے لوگوں کے لئے ویرانوں کی قسمت جگائی گئی۔ کل جہاں ڈھور ڈنگر چرا کرتے تھے آج وہاں نیلی پیلی اور سفید کوٹھیاں کھڑی تھیں مگر یہ حقیقت تھی کہ مدتوں کے ویرانوں پر لاکھ آبادیوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے پر وہ اپنی ویرانی کی مہذب نشان چھوڑنے سے نہ چوکے تھے۔ یہاں ذرا بھی تو زندگی کی بیباک ہما ہمی نہ تھی۔ کراچی کی طرح نہ تو ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی نہ بسوں کا شور، نہ خوانچے والوں کی چیخ و پکار، نہ محلے ٹولے کی فضا۔ چوڑی شفاف سڑک پر وقفے وقفے سے کاریں زن سے گذر جاتیں یا پھر بیرے اور خانساماے اپنی سائیکلیں دوڑاتے کوٹھیوں کے پھاٹکوں میں غائب ہو جاتے۔ ویرانی کس ٹھاٹ سے سڑک پر لوٹیں لگاتی پھرتی۔ شام کو سڑک پر ذرا سی چہل پہل ہو جاتی۔ بنی ٹھنی عورتیں اپنے شوہروں اور جھبرے جھبرے کتوں کے ساتھ چہل قدمی کرتی نظر آ جاتیں اور بس۔ اس بیچاری کو یہ بھی نصیب نہ تھا۔ رات دن اس پیلی کوٹھی میں پھوڑے کی طرح ٹپکا کرتی۔ کوئی ہمدرد نہیں، کوئی دوست نہیں کوئی محبت سے بولنے والا نہیں۔ چھ مہینے یوں ہی چپ چاپ گزر گئے۔ کراچی کی یاد ہوک بن کر کلیجے میں اٹھا کرتی۔ چلو اس نے وہاں خود کو بہلا تو لیا تھا یہاں تو اس کے شوہر نے ہدایت کر دی تھی کہ کوٹھیوں کا معاملہ ہے۔ اِدھر اُدھر مارے مارے نہیں پھرنا ہے۔ یہ کراچی کے فلیٹ نہیں ہیں اور نہ کراچی والا عہدہ ہے ——— وہ تو ظاہر ہے کہ اِدھر اُدھر ماری ماری نہ پھر سکی اور بُری شے کی طرح گھر کے گوشوں میں چھپی پڑی رہی مگر اس کے خوبصورت، صاف ستھرے، معصوم جذبات ماتمی لباس پہنے ہر طرف آوارہ بھٹک رہے تھے۔ وہ رو رہے تھے، بین کر رہے تھے ——— ارے ہم بھی زندہ ہیں، ہمیں بھی جینے دو، ہمیں بھی کوئی سینے سے لگا لو، کوئی ہمارے ساتھ قدم اٹھاؤ اور زندگی کے کڑھے کو بس ختم کر دو، ہمیں بھی کوئی عہدہ دے دو ———

بین تو خیر ہوتے ہی رہے مگر اسے عہدہ نہ ملنا تھا نہ ملا ———

روتے روتے تھک کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ گھاس پر پڑی ہوئی شبنم دھوپ کی تیزی سے خشک ہو گئی تھی۔ لان میں ایک چھوٹی سی چڑیا بڑی آزادی سے پھدکتی پھر رہی تھی۔ زیادہ دیر تک دھوپ سینکنے سے اس کے جسم میں چنگیاں سی لگنے لگی تھیں ——— پیر ہاں پر چڑھا ہوا گرم

شال ممبٹ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن سامنے پھاٹک پر ایک میلی کچیلی عورت کو کھڑے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے ۔ وہ پھر کرسی میں دھنس گئی ۔ عورت ڈرتے جھجکتے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

"اے آجاؤ نا !" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ پورے تین مہینے بعد کوئی اس کے پھاٹک پر کھڑا تھا ۔ وہ عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی ۔ چلو ذرا دیر باتیں کر کے دل بہلا لے گی ۔ عورت جھجکتی ہوئی آئی اور اس کے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی ۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ۔

"سلام بیگم صاحب !" عورت اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی ۔

"کہاں سے آئی ہو ؟" وہ ذرا سی مسکرائی ۔

"بیگم صاحب ! ہمارے آدمی چھپن نمبر کوٹھی میں خانساماں ہیں ۔ وہیں کوارٹر میں رہتی ہوں ۔ ہم لوگ غریب آدمی ہیں کوٹھیوں میں نہیں جاتے اس وقت ادھر سے گذری تو پھاٹک پر ذرا دیر کو اٹک گئی ۔ معافی دے دیجئے ۔" عورت کی گھبراہٹ ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی ۔

"کوئی بات نہیں !" اس نے ذرا جھینپ کر کہا ۔ جیسے کوٹھیوں میں جانے کی اجازت نہیں وہ اس کے پاس بیٹھی ہے ۔ ایک لمحے کو عہدیدار کی بیوی جاگی اور پھر سو گئی ۔ اسے اپنی بے بسی پر ترس آگیا ــــــ "کوئی بات نہیں تم ادھر آجایا کرو ۔" وہ آہستہ سے بولی اور اب عورت نے ذرا اطمینان کی سانس لے کر اپنے سکڑے ہوئے جسم کو گھاس پر آرام سے پھیلا دیا ۔

"کیسا اچھا مزاج ہے بیگم صاحب کا ۔" عورت نے تعریف کی ۔

"تمہاری بیگم صاحب کیسی ہیں ؟" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا باتیں کرے ۔

"پتہ نہیں کیسی ہوں گی مزاج کی ، صورت تو بڑی اچھی ہے ، صاحب کے ساتھ روز ہی گھومنے پھرنے جاتی ہیں ، ہزار بار دیکھا ہے پر کوٹھی میں جانے کی اجازت نہیں ۔"

"ہوں !" جسے اپنے صاحبوں کے ساتھ گھومنا نصیب ہوا انہیں ایسی عورتوں کی کیا ضرورت ــــــ ۔ وہ لمبی سانس بھر کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئی ۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے ؟"

"پانچ بچے ہیں بیگم صاحب !" عورت نے بہت خوش ہو کر بتایا ۔ ویسے صورت سے بھی معلوم ہو رہا تھا کہ کم از کم آدھی درجن بچوں کی ماں ہو گی ۔ سر سے پاؤں تک جھلنگا کھاٹ معلوم ہو رہی تھی ۔

"تم بھی کوئی کام کرتی ہو ؟"

"نہیں بیگم صاحب ۔" عورت نے لمبی سانس بھری ۔

"تمہیں کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے تمہارا آدمی جو روزگار سے لگا ہے ۔"

"ہاں بیگم صاحب !"

"تمہیں اچھی طرح رکھتا ہے تمہارا آدمی ؟"

"ہاں بیگم صاحب ، بہت اچھی طرح ــــــ" عورت جیسے مارے دکھ کے ایک دم کھڑی ہو گئی ــــــ "اب مجھے جانا ہے

بیگم صاحب، میرے بچے بھوکے ہوں گے۔ سودا لانا ہے، بڑی دیر ہو گئی، ابھی تو میل جانا اور میل آنا ہے۔"

"تمہارا آدمی خود سودا نہیں لاتا؟ کیا اس کے پاس سائیکل نہیں؟"

"ہے تو بیگم صاحب پر میں ہی جاتی ہوں۔" عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چلنے کے لئے مڑی۔

"اچھا پھر آنا!" اسے پھر آنے کی دعوت دے کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ عورت نے اسے حیرت اور ممنونیت سے دیکھا۔

"ضرور آؤں گی بیگم صاحب!" وہ تیزی سے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ اور بھی دکھی ہو گئی۔ ہائے اب وہ اس لائق رہ گئی تھی کہ ان بڑی بڑی عورتوں سے دل بہلایا کرے جنہیں لوگ کوٹھیوں کے اندر گھسنے بھی نہیں دیتے۔ وہ بڑی دیر تک بے سدھ سی پڑی ہری ہری گھاس تکتی رہی۔

دوسرے دن جب وہ لان میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر دراز تھی تو وہ عورت آ گئی۔

"سلام بیگم صاحب!" آج وہ بغیر جھجک کے اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے رات بھر روتی رہی ہے۔ دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سوجن کی وجہ سے ذرا نمایاں ہو گئی تھیں۔ گھائل کی گت گھائل ہی خوب جانتا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ بیچاری عورت خوش نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ عورت سے کیا بات کرے۔

"کیسی ہو؟" ذرا دیر بعد اس نے پوچھا۔

"اچھی ہوں بیگم صاحب! آپ کو دیکھنے کے لئے بڑا دل چاہا، کوئی میٹھی زبان سے بولے تو میں دیوانی ہو جاتی ہوں۔ دنیا میں سب کچھ زبان ہی تو ہے بیگم صاحب۔ ہم سے تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، غریب جو ہوں۔" عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے روتی کیوں ہو؟" وہ ایک دم بے چین ہو گئی۔ اب وہ کیسے کہتی کہ کوئی اس سے بھی بات کرنے والا نہیں۔

"اپنے جلے نصیبوں کو روتے ہیں بیگم صاحب! آدمی نہ روٹی دے نہ کپڑا، نہ بچوں کی پروا کرے، سب بھوکے مرتے ہیں۔"

"بڑا بدذات مرد ہے، تم خود نوکری کر لو نا۔"

"پر بیگم صاحب پانچ بچے ہیں، کون دے گا نوکری؟ بڑا سرمایہ کوئی نہیں رکھتا، سب ڈرتے ہیں کہ کہیں میں باورچی خانے میں چوری چوری اپنے بچوں کا پیٹ نہ بھر دوں۔ مہنگائی کا زمانہ ہے، امیروں کے دل سے بھی رحم اٹھ گیا۔ میں ایسی نہیں ہوں بیگم صاحب، اللہ اس گھڑی موت دے جب چوری سے کسی کی چیز اٹھاؤں۔" عورت سسک کر روئی۔

"نہ رو بھئی، اگر میرے پاس جگہ ہوتی تو تمہیں رکھ لیتی۔" اسے بھی پانچ بچوں کا خیال آ گیا ورنہ میرے گھر ہٹا کٹا اسے رکھ لینا کیا مشکل تھا۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے ——" عورت نے آنسو پونچھ ڈالے —— "بیگم صاحب کوٹھیوں میں تو اب میں خود بھی کام نہ کروں گی پچیس تیس روپے میں کیا بنتا ہے، بچوں کو سوکھی روٹی بھی نہ ملے گی۔ بڑے اسپتال میں آیا کی جگہ کی کوشش کر رہی ہوں، تنخواہ ساٹھ سے شروع ہوتی ہے، بس کوئی سفارش کرنے والا نہیں جو کام بن جائے۔" اس نے لمبی سانس بھری۔

"اوہ! وہاں میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر ہیں، انہیں خط لکھ دوں گی شاید تمہاری نوکری کا انتظام کر دیں۔" اسے اچانک خیال آیا تھا کہ کراچی کی ایک سہیلی کا بھائی یہاں اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی سہیلی بڑے چاؤ سے اپنے بھائی کا ذکر کیا کرتی تھی۔

"زندگی بھر غلامی کروں گی آپ کی۔" عورت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ بیرے سے قلم اور پیڈ منگا کر وہ جلدی جلدی خط لکھنے لگی۔

سہیلی کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا اور عورت کے لئے پُرزور سفارش کی۔

خط لیتے ہی عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ مارے خوشی کے ہاتھ کانپ رہے تھے "کوئی کام ہو تو آدمی ہزار دکھ بھول جاتا ہے، بیگم صاحب گھر پر پڑے پڑے تو بس رویا کرتی ہوں۔ میرا کام لگ گیا تو زندگی بھر آپ کی خدمت سے منہ نہ موڑوں گی۔"

"کوئی بات نہیں!" عورت سلام کر کے چلی گئی مگر جاتے جاتے کیسی بات کہہ گئی تھی کہ سیدھی اس کے کلیجے میں جا لگی۔ کوئی کام ہو تو آدمی ہزار دکھ بھول جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دکھ کیسے بھولے۔ وہ تو کوئی کام بھی نہیں کر سکتی، وہ تو صرف دس درجے تک پڑھی ہوئی ہے، بڑے افسر کی بیوی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں جنہیں نہ وہ چھوڑ کر جا سکتی ہے اور نہ باپ ——— کیسا اچھا ہوتا جو وہ بھی ایک غریب عورت ہوتی ——— اس نے بہت سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا ——— پھر وہ بھی کوئی محنت مزدوری کرتی۔ اس کے سارے دکھ محنت کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتے۔ پھر وہ یوں ہی گھر میں پڑے پڑے سناٹوں، ویرانیوں اور اپنے لاوارث بوجھ کے سلسلے میں نہ سوچا کرتی ——— عورت کے جانے کے بعد وہ دیر تک آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔

عورت دو دن تک نہ آئی۔ اس نے دن میں کئی بار اس کے لئے سوچا اور جب دھوپ میں جا کر بیٹھی تو بار بار نظریں پھاٹک کی طرف اٹھ جاتیں۔ تیسرے دن جب وہ اپنے بچوں کو اسکول کے لئے رخصت کر کے دھوپ میں آ بیٹھی تو عورت تیز تیز قدم ڈالتی آئی اور آتے ہی اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

"خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے، خدا آپ کے مالک کو اور ترقی دے ———" پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ بولے چلی جا رہی تھی ——— "کل سے میرا کام لگ گیا ہے، اب میرے بچے بھی آپ کے طفیل میں پل جائیں گے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" اتنی جلدی ملازمت مل جانے پر وہ خود بھی خوش اور حیران تھی۔ اس نے تو عورت کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اور اس آس پر خط لکھا تھا کہ اگر وہ نوکر ہو گئی تو روز آیا کرے گی، اس طرح اس کا دل بھی بہل جائے گا۔ ویسے قطعی یقین نہ تھا کہ اس کے خط کا ضرور اثر پڑے گا۔

"ایمان کی قسم بیگم صاحب، ڈاکٹر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھ سے بڑے میٹھے سے بولے اور کہا کہ ایک جگہ خالی ہے کل آ جانا۔ آپ کی خیریت بھی پوچھتے تھے۔ میں نے کہا بالکل اچھی ہیں ہماری بیگم صاحب۔"

"آج اچھا" اسے عجیب سی مسرت محسوس ہوئی۔

"کہتے تھے بیگم صاحب بڑا اچھا خط لکھتی ہیں ——— اسی لئے تو انہوں نے فٹافٹ نوکر رکھنے کو بلا لیا۔"

"اسے اچھا!" وہ زور سے ہنس دی اور پھر ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔ شادی کے چند دن بعد تھوڑے دن کی جدائی میں اس نے اپنے شوہر کو بھی خط لکھے تھے۔ اس کے خطوں کی اس نے اتنی تعریف کی تھی کہ وہ سچ مچ شرمندہ ہو ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ کتنی فضول سی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ اب اس کی کوئی بات بھی تو اسے پسند نہ تھی۔ پرانی چیز کی بھلا کون قیمت لگاتا ہے۔ اس وقت اس نے خوش ہو کر خود ہی اپنی قیمت بڑھا لی ——— دوسرے تو اب بھی اس کے خط پسند کرتے ہیں ———

"ڈاکٹر صاحب تو ادھر بہت آتے ہوں گے؟" عورت اسے دیر سے چپ دیکھتے دیکھتے پھر بولنے لگی۔

"ہاں آتے رہتے ہیں۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔ بھلا وہ یہ کیسے کہتی کہ جس شخص نے اس کے ایک خط پر ملازمت جیسی

چینز دلائی وہ اس سے ملنے بھی نہیں آتا۔

"ہاں ابھی کہہ رہے تھے کہ بس دو ایک دن میں تمہاری بیگم صاحب سے ملنے جاؤں گا۔" عورت بڑی چالاکی سے اپنی ہنسی ضبط کرنے لگی۔

"اوہ! اچھا"۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی حیرت چھپا سکی ——— "ہاں اِدھر چھ سات دن سے نہیں آئے۔" کیسا اچھا لگ رہا تھا یہ سارا جھوٹ۔ وہ کیسے بے جھجک بول رہی تھی۔

"وہ خود بھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے ہفتے گیا تھا پھر نہ جا سکا۔" عورت نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن پھر ایک دم کانپ کر رہ گئی۔

"ہوں" ——— چند لمحوں کے لئے وہ غصے سے تلملا گئی یعنی کہ یہ حرام زادی بھی جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ بوٹیاں نوچ ڈالے مگر صبر کر کے رہ گئی۔ محلوں کا کیا ٹھیک ابھی کھڑے ہیں ابھی ڈھا دیئے گئے۔ یہ حقیقتوں سے بھری ہوئی دنیا ایک قدم آگے بھی تو نہیں جانے دیتی۔ عورت نے دو تین بار خوف سے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ ایسا سناٹا چھا گیا جیسے وہ جیتے جاگتے انسانوں کے بجائے پتھر کے دو ٹکڑے رکھے ہوں عورت نے اس کا دیا ہوا خط چپکے سے کھول کر پڑھوا لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صرف اس کی سہیلی کا بھائی ہے۔ وہ زمانہ دیکھے ہوئے تھی اور اسی لئے خوشامد میں جھوٹ بولتے بولتے آگے بڑھنے لگی، یہ جہالت کی وجہ سے ذرا ہی میں دھوکا کھا گئی۔ وہ ڈری ڈری نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھی جیسے ابھی کہیں سے بڑا یا خانساماں آنکلے گا اور بیگم کے اشارے پر اس کی کھال ہڈیوں سے جدا کر دے گا۔ مگر اس کی بیگم صاحب بھی تو جھوٹ بول رہی تھیں اور وہ ان کے جھوٹ پر خوش تھی۔

"میرا تو دماغ خراب ہے ———" عورت آہستہ سے بولی ——— "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگلے ہفتے جاؤں گا اور مجھے خیال آیا کہ وہ کہہ رہے تھے: پچھلے ہفتے گیا تھا۔"

"اچھا ———" اس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنی بے بسی پر ہنس دی۔ وہ اس عورت کو بھلا کچھ کہہ سن کر اپنے ہاتھوں سے نکال سکتی تھی ——— "دیکھو اب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو تو کہنا کہ ضرور آئیں۔"

"جی ضرور کہوں گی۔" عورت کے پیلے منہ پر سُرخی دوڑ گئی۔ شاید عورت اپنی چالاکی پر نازاں تھی جبھی اس کی آنکھیں دھنسے ہوئے حلقوں میں اِدھر اُدھر ڈھا رہی تھیں ——— "اچھا اب چلوں بیگم صاحب بچوں کے کپڑے دھونا ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھو بھی!" اس نے بڑی محبت سے اصرار کیا تاکہ عورت خوب خوش ہو کر جائے۔ اگر وہ نہ آئی تو پھر کس سے باتیں کرے گی، وہ تو آج کتنے دن سے اس کے گونگے پن کا علاج بنی ہوئی تھی۔

"کل آؤں گی پانچ بجے پھر خوب بیٹھوں گی۔ کل نوکری پر جانا ہے اس لئے اپنے کپڑے بھی تو دھونا ہیں۔"

"اچھا ضرور آنا۔"

"ضرور!" عورت سلام کر کے چلی گئی۔ وہ دیر تک تمام باتوں کو سوچ سوچ کر کبھی ہنستی اور کبھی اپنی بے بسی پر ہانپ کر رہ جاتی۔

دوسرے دن وہ اسپتال سے سیدھی اس کے پاس آگئی۔ یہاں تو واقعی چار بجے سے اس کا انتظار ہو رہا تھا۔

"اچھا تو آج سے تم نوکر ہو گئی ہو۔" اس نے ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانی ہے بیگم صاحب!" عورت پلتھی مار کر قالین پر بیٹھ گئی اور کمرے کے ساز و سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

"کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" وہ ہنسی۔

"اچھے ہیں، آپ کو بہت پوچھ رہے تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ بیگم صاحب کے پاس روز جایا کرو۔"

"اچھا تو پھر آیا کرو نا۔" وہ برابر مسکرا رہی تھی۔

"بیگم صاحب آپ کے پاس نہ آؤں گی تو پھر کہاں جاؤں گی؟ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ابھی تو میری کچی ملازمت ہے، اب آپ ہی پکّی بھی کرائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب آپ ہی کی بات مانیں گے۔ آپ کے ایک خط پر ملازم رکھ لیا، آج بھی آپ کے خط کی تعریف کرتے تھے، کہہ رہے تھے کہ یہ سب انہیں کے خط کا اثر ہے جو تجھے یہاں نوکری مل گئی ورنہ یہاں تو روز ہی عورتیں ماری ماری پھرتی ہیں اور کوئی جگہ نہیں دیتا۔"

"بات تو سچی ہے، وہ مجھے بہت مانتے ہیں۔" اسے اس جھوٹ میں کیسا مزا آرہا تھا۔ پیلے چہرے پر ہلکی ہلکی گلابی پھوٹ رہی تھی۔

"اب آپ کہہ رہی ہیں تو سچی بات کہہ دوں کہ ڈاکٹر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ میں انہیں بہت پسند کرتا ہوں۔" عورت نے نظر بچا کر اسے دیکھا۔

"ارے واقعی کیا وہ یہ کہہ رہے تھے؟"

"ہاں بیگم صاحب! اگر جھوٹ بولوں تو اپنے بچوں کا خون پیوں۔" عورت کے چہرے پر عجیب سا کرب چھا گیا۔

"ارے بھئی ایسے مت کہو، بیچ میں بچوں کو کیوں لاتی ہو، مجھے تو سب معلوم ہے۔" وہ بچوں کے خون کے خیال ہی سے کانپ گئی۔

"بس بیگم صاحب آپ ایک خط اور لکھ دیں تو میری نوکری پکّی ہو جائے گی۔"

"لکھ دوں گی، ابھی کیا جلدی ہے۔"

"ہاں ہاں! میں نے کہا کہ آپ کو یاد دلا دوں کہ یہ کام بھی آپ کو کرنا ہے، ساری زندگی آپ کے بچوں کو دعائیں دوں گی۔"

"ایک آدھ مہینے کام کرو پھر خط لکھ دوں گی۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے، سچ کہتے تھے ڈاکٹر صاحب کہ آپ جیسی نیک بیگم اور کوئی نہ ہوگی۔"

"اری چل جھوٹ نہ بول۔" وہ بن کر شرمائی۔

"ہائے جھوٹ بولوں تو خدا مجھے ابھی ابھی موت دے دے۔"

"لے اب مرنا نہیں ورنہ تیری جگہ کسی اور کو مل جائے گی۔" وہ زور سے ہنسی۔

"اب میں جاؤں بیگم صاحب؟"

"ہاں جاؤ مگر دیکھو روز آنا ہوگا ورنہ سفارش کا خط نہیں لکھا جائے گا۔" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا اور عورت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"ایسا کب ہو سکتا ہے بیگم صاحب! چاہے میرے بچے بھوک کے پیاسے بیٹھے رہیں پر میں آپ کے پاس ضرور آؤں گی اور پھر اللہ قسم آپ کو دیکھے بغیر تو چین ہی نہیں پڑتا۔"

"ڈاکٹر صاحب کو سلام کہہ دینا۔" عورت جب کمرے سے نکل رہی تھی تو اس نے کہا۔

"ضرور کہوں گی بیگم صاحب۔"

شام بہت زیادہ اداس نہ لگ رہی تھی۔ وہ ساری باتیں سوچ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ رات اس کے شوہر نے کسی ہوٹل میں اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں کو ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا۔ مگر آج وہ اس خیال سے کچھ زیادہ نہ کڑھی۔ ذرا دیر تک بچوں کے کمرے بیٹھ کر انہیں کہانیاں سناتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں جاکر سو گئی۔

مہینہ سوا مہینہ یوں ہی گذر گیا۔ عورت روز آتی اور پورے پورے افسانے سنا کر چلی جاتی۔ پہلی کوٹھی کا پھوڑا پن اب کسی قدر کم ہو گیا تھا۔ سینے پر دھری ہوئی غموں کی بھاری سل جیسے کسی نے اپنے ہاتھوں پر روک لی تھی۔ ان جھوٹے افسانوں سے وہ کس قدر بہل گئی تھی ــــ اور کچھ نہیں تو ایک مذاق ہی ہاتھ آ گیا تھا ــــ اگر یہ سب سچ ہوتا ــــ وہ کبھی کبھی سوچتی اور عجیب سی مسرت محسوس کرتی۔

شام کو عورت آئی اور ایک ہی سانس میں پوری کہانی سنا گئی۔ "بیگم صاحب! آج میں آپ کی جان نہ چھوڑوں گی، بس اب تو بہت دن ہو گئے، آج میرے سامنے ہی خط لکھئے۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں الگ ترس رہی ہیں آپ کے خط کے لئے۔"

"اچھا بھئی ابھی لکھے دیتی ہوں مگر یہ تو بتاؤ سب تم کرے میں گئیں تو ڈاکٹر صاحب بہت رنجیدہ تھے؟"

"ہاں بیگم صاحب بہت رنجیدہ تھے، مجھے دیکھتے ہی پوچھا کہ بیگم صاحب کیسی ہیں جب میں نے کہا کہ بالکل اچھی ہیں تو پھر منہ پر رونق آئی۔"

"اچھا تو اس رونق کی خوشی میں تیرا خط لکھے دیتی ہوں۔" وہ ہنستی ہوئی اٹھی اور میز پر سے قلم اٹھا کر خط لکھنے لگی۔ کم بخت قلم مذاق ہی مذاق میں پھسلا جا رہا تھا۔ کئی خط پھاڑنے کے بعد وہ سنجیدگی سے ایک اچھا خط لکھ سکی۔ خط لفافے میں بند کر کے عورت کو دے دیا اور پھر باتیں کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

"اچھا تو آج میری طرف سے خوب پوچھیو۔"

"کیا کیا کہوں؟"

"جو جی میں آئے۔" وہ زور سے ہنسی۔

"بیگم صاحب تو ہنستی ہیں اور وہ بیچارے پیاسا سا لئے پھرتے ہیں۔" عورت اٹھ کھڑی ہوئی، خط اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

"ارے ابھی سے؟"

"بچوں کو روٹی کھلانی ہے بیگم صاحب!"

"آج بہت خیال آ رہا ہے بچوں کی بھوک کا۔" وہ ذرا سی بگڑی۔

"اللہ قسم کل آؤں گی تو رات تک بیٹھوں گی۔"

"اچھا جاؤ، ڈاکٹر صاحب کو بہت سے سلام کہنا اور پوچھنا۔

"خوب پوچھوں گی، اللہ آپ کا بھلا کرے، میری نوکری پکی ہو گئی تو عمر بھر خدمت کروں گی۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی بات فوراً مانیں گے کل کہتے تھے کہ وہ کہیں تو سب کچھ کرنے کو تیار رہوں۔"

"تو کہنا کہ بس یہی کام کر دیں۔"

"اچھا، کل آؤں گی بیگم صاحب، سلام!" وہ بے حد خوش تھی اس لئے تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔

چار پانچ دن گذر گئے لیکن وہ نہ آئی۔ وہ روز شام کو اس کا انتظار کرتی ــــ دن پھر سے بوجھل معلوم ہونے لگے، وہ ہر آہٹ

پر چونک پڑتی، مزے دار باتیں سننے کے لیے اس کے کان ترس رہے تھے ——— کہاں مر گئی فطامہ، حرامزادی ——— اس نے جھلا جھلا کر عورت کو کتنی بار گالیاں دیں ——— کئی دن اور گزر گئے، اب مارے بے چینی کے وہ تلملائی ہوئی پھرتی، انتظار ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا ——— اری کمینی اب ڈاکٹر صاحب کا کوئی پیغام نہیں جو ادھر آ مرے ——— دس بارہ دن بعد تو واقعی اس کے ضبط نے جواب دے دیا۔

"پتہ نہیں وہ عورت بیچاری کیوں نہیں آئی، کہیں غریب بیمار نہ پڑی ہو" کھانا کھاتے ہوئے اس نے بیرے سے کہا مگر اس طرح جیسے بالکل معمولی سی بات ہو، اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اتنی ذلیل سی عورت کے لئے اپنے بیرے کو خیریت معلوم کرنے کے لئے بھیجے۔

"وہ بیمار تو نہیں بیگم صاحب ———" بیرا گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہنے لگا ——— "وہ مجھے راستے میں ملی تھی۔ کہتی تھی کہ اس کی ملازمت بھی پکی ہو گئی اور سرکوارٹر بھی رہنے کو مل گیا، وہ تو کب کی اپنے بچوں کو لے کر چلی گئی"

"اچھا! ہاتھ دھلاؤ" چند لقمے کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات سوتے میں وہ لمبی لمبی آہیں بھرتی رہی اور باہر سڑک پر کوئی آوارہ کتا تھوڑی تھوڑی دیر بعد روتا رہا۔

رات، چور اور چاند

(پانچویں قسط)

بلونت سنگھ

کوئی نامعلوم سا احساس تھا جس کے زیر اثر پالا سنگھ نے شروع ہی سے جوالا سنگھ کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے۔ جوالا سنگھ کو بھی اس بات کا کچھ کم احساس نہیں تھا یعنی دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ یا پھر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے کے مصداق چونکہ وہ دونوں درحقیقت ایک ہی قماش کے انسان تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی دوستی کی خواہش ایک قدرتی امر تھا۔

ہر چند پالی کو جوالا سنگھ سے اور جوالا سنگھ کو پالی سے اندرونی طور پر لگاؤ تھا لیکن بظاہر پالا سنگھ نے اس سے زیادہ میل جول سے پرہیز کیا۔ اس کی تہہ میں سرنوں کا خیال کارفرما تھا۔ ادھر ان کا گھرانہ شرافت کا دعویدار تھا اور ادھر پالی کے آباؤ اجداد کے کارنامے اس کے قطعاً برعکس تھے۔ اب اس کے بھائی بہنوں کی حیثیت ایک معمولی کاشت کار کی سی تھی۔ لیکن باپ کی موت کے بعد ان کے گھر کے کسی فرد نے کوئی قابل اعتراض حرکت نہیں کی تھی۔ گاؤں والوں میں سے بیشتر کو اس بات کا رنج تھا وہ اس کے باپ کے کارناموں کو فخریہ دہراتے اور سر دھنتے تھے۔ نرنجن سنگھ کی یہ مجال ہی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ان کے خیالات کی تردید کرے۔ البتہ وہ اپنی لڑکی سرنوں کی شادی تو اپنی مرضی کے مطابق جہاں بھی چاہے کر سکتا تھا۔ اس میں روک ٹوک کرنے کا کسی کو کیا حق حاصل تھا۔ پالی کو معلوم تھا کہ زیر غور لڑکوں میں اس کا نام پیش پیش ہے۔ اور وہ اس بات سے بھی بے خبر نہیں تھا کہ نرنجن سنگھ اور اس کی بیوی کے خیالات کیا ہیں۔ ان حالات میں اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مفت میں بدنام ہونے سے وہ جس قدر بھی احتراز کرے اسی قدر اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اسی لیے وہ باوجود دلی لگاؤ کے جوالا سنگھ اور اس کے واقف کاروں سے کچھ پرے پرے ہی رہتا۔

رفتہ رفتہ پرتھی پال سنگھ کا نام بھی اس کے کان میں پڑنے لگا۔ وہ ایک مالدار اسامی تھی پھر خوبصورت اور باروزگار نوجوان۔ وہ سرنوں کے ہاں دو چار مرتبہ جا بھی چکا تھا۔ اس لیے اس کا نام پالا سنگھ کے دل میں کھٹکنے لگا۔ اس کی صورت دیکھے بغیر اور اس کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے ہی پالی نے اسے اپنا حریف متصور کر لیا۔ ایک طرف اس نے اپنی شرافت کا ڈھونگ بھی رچا لیا تھا اور دوسری طرف چپکے چپکے جوالا سنگھ سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔

پالا سنگھ کی صورت اور تیور ہی ایسے تھے کہ کسی کو اس کی شرافت کا یقین نہیں آتا تھا تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں تک بن پڑا سفید پوش شرفا کے اوصاف پیدا کیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جوالا سنگھ سے تعلقات بڑھانے میں نہ معلوم کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ خود اس کے ذہن میں یہ بات مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی تھی محض انجانے طور پر اس نے محسوس کیا کہ اسے جوالا سنگھ سے تعلقات

بڑھانے چاہئیں خواہ وہ پس پردہ ہی ہوں۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سرنوں کی ماں اس کی بھابی سے پوچھتی رہی تھی کہ وہ اور زمین کب خرید رہے تھے۔ پالی نے تو یونہی گپ ہانک دی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ سرنوں کی ماں اسے پلّے ہی سے باندھ لے گی۔ لیکن عورتیں ان معاملات میں بھلا کب چوکتی ہیں اور پھر بھابی کی بات کے ذکر نے اسے اور فکرمند کر دیا۔

دیوالی کے دن قریب آ رہے تھے۔ ان دونوں گھرانوں نے امرت سر جانے کی تجویز قریب قریب پختہ کر لی تھی۔ پال کے دل کو اس بات پر یقیناً بڑا اطمینان حاصل ہوا کہ سرنوں نے اس کی دست درازی کا بُرا نہیں منایا تھا۔ اس واقعہ کے بعد چند روز تک تو وہ جان بوجھ کر سرنوں کے گھر نہیں گیا بلکہ اگر کہیں راستے میں وہ دکھائی دیتی بھی تو وہ کترا کر نکل جاتا البتہ بھابی کو بھیجتا رہا۔ تاہم بھی ان معاملات میں بڑی ہوشیار تھی یوں بھی ہنس مکھ چلبلی اور باتونی عورت تھی اس لئے سرنوں کے دل میں گھر کرنے کے لئے اسے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب اس سے اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے تو بھلا اس کے دیور کی بابت وہ اپنے دل میں بُری بھلی بات کیوں کر رکھ سکتی تھی۔ پالی نے چاہا کہ بھابی اس کی اس حرکت کا ذکر کر کے اظہار افسوس کر دے تاکہ اس کے دل کی کدورت دور ہو جائے لیکن تاباں کو اس بات سے اختلاف تھا وہ کہنے لگی کہ سرنوں کو یہ بات جتلا کر خواہ مخواہ اس کے دل میں یہ وہم کیوں پیدا کیا جائے کہ بات پھیل رہی ہے اگر اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ گاؤں بھر میں کسی اور شخص کو اس واقعہ کی کچھ بھی خبر نہیں تو اور اچھا ہے۔ اتنی سی بات کا بھلا بُرا منانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خصوصاً جب اور کسی نے دیکھا ہی نہ ہو۔ اور ممکن ہے اسے پالی سے تھوڑی بہت محبت بھی ہو اس صورت میں اس کے دل پر یہ بات گراں گزرنے کا امکان اور کم ہو جاتا ہے۔ پالی نے بھابی کی تجویز منظور کر لی اور اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا .... بالآخر جب اس کی سرنوں سے ملاقات ہوئی تو اس کے بشرے اور حرکات سے اس بات کا قطعاً اظہار تک نہ ہوتا تھا کہ اسے اس سے کسی قسم کی شکایت ہے۔

یہ دیکھ کر پالی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ آئندہ کے لئے اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ پھر کبھی ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنے کا۔ وہ سن چکا تھا کہ پرتھی پال سنگھ کس قدر چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو کہیں وہ سرنوں کے کان میں میٹھی میٹھی باتیں پھونک کر لے اُڑے اور وہ منہ تاکتا ہی رہ جائے۔

ایک روز پالی صحن میں بیٹھا کمان کی رسیاں از سرِ نو کس کر باندھنے میں مصروف تھا۔ جب کمان ٹھیک ہو گئی تو اس نے پیپل پر بیٹھے ہوئے چند کوّوں کو مٹی کے غلے کھینچ مارے۔ کمان کو پہلے کی نسبت بہتر پا کر اس نے مارے خوشی کے منہ ڈھیلا چھوڑ دیا اس کے دانت نمایاں ہو گئے۔ پھر اس نے کمان ایک طرف رکھ دی۔ روٹیاں لپیٹنے والے جھاڑن سے ہی جوتوں کی گرد جھاڑنے لگا۔ اتنے میں سنداں آ نکلی۔ اُس نے یہ ماجرا دیکھا تو برس پڑی۔

"ارے دیکھتا نہیں ......"

"ہو ماں کیا بات ہے؟"

"روٹیوں والے جھاڑن سے جُوتے صاف کر رہا ہے تو تو پچھلے جنم کا بھنگی ہے بھنگی۔"

بیچارا پالی حیران تھا طویل بحث مباحثے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ماں بیٹے کا جھگڑا سن کر چھت سے تاباں اُچک کر جھانکنے لگی۔ پالی نے یہ بات تو تسلیم کر لی کہ اس کی بیوقوفی تھی کہ وہ ایک عام کپڑے اور روٹیوں کے جھاڑن میں تمیز کرنے سے قاصر تھا۔ لیکن

مکمل شکست تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

"یہاں تیری بھی تو بیاکرچی ہے جھاڑن روٹیوں کے چھکو (ٹوکری) میں ہونا چاہیئے نہ کہ دیوار پر پھینک دینا چاہیئے ......"

"ہائے ہائے اسے تو دھو کر دیوار پر سوکھنے کے لئے ڈال دیا تھا تو کیا اب اسے دھونا بھی نہیں چاہیئے ......"

"دھونے میں تو کوئی برائی نہیں پر اسے دیوار پر آدمی کیوں ڈالے ....."

"دیوار پر نہیں تو کیا اسے اپنے سر پر ڈالوں"

"ہاں سر پر ہی ڈال لیا کر .... یہ جو سر پہ دوپٹہ ڈالے پھرتی ہے وہ اس جھاڑن سے زیادہ صاف تو نہیں۔"

اس پر سنداں نے جان بوجھ کر چمٹا اس انداز سے پھینکا کہ نشانہ ادھا پڑے۔ بالا سنگھ نے ازراہِ مذاق بارہ سنگھے کی طرح اتنی بڑی چھلانگ لگائی جیسے اس پر چمٹا نہیں بھالا پھینکا گیا ہو ...... اس پر تاباں ہنسنے لگی اور سنداں بناوٹی خفگی میں لیکن زیر لب مسکراتی ہوئی پسار میں چلی گئی۔

بالی نے پگڑی کے شملے کو درست کرتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور بھابی کو ہنستے پاکر بولا۔

"لو بھابی ذرا کی ذرا باہر گھوم آؤں"

"جاؤ" بھابی نے ہاتھ جھٹکا کر جواب دیا "گھر پر کونسا کولھو کے آگے جتے ہوئے ہو"

"اچھا بھابی یہ باتیں ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ چھت پر بیٹھی ہو تو میں وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا ......"

"اچھا جی کیسے پہنچو گے سیڑھیوں کے دروازے کا کنڈا چڑھا دوں گی"

"چڑھائے رکھو۔ مجھے اگر کوئی بانس مل جائے ذرا بڑا سا تو پھر دیکھو ایک ہی جست میں چھت پر پہنچتا ہوں یا نہیں ....."

یہ کہہ کر وہ بانس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

بھابی نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔

"اچھا بھئی مان لیا ہم نے کہ تم بڑے استاد ہو۔ لو ہاتھ جوڑتے ہیں جان بخشو ہماری اور سیدھے باہر کا راستہ لو اب۔ ہاں اور نہیں تو کیا ...."

بالا سنگھ نے بھی اس معاملے کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور باہر جانے کے لئے پر تولنے لگا۔ پھر حسب عادت کہنے لگا۔

"نہیں واکھی بھابی کوئی کام ہو تو بتا دو"

"واکھی؟" بھابی کی چندھی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں ہاں واکھی"

"شاباش! بس اس طرح بڑوں کا کہنا مانا کرو۔ اچھا اب جاؤ تمہیں بخش دیا ہم نے۔"

جب وہ صحن سے ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہونے ہی کو تھا کہ بھابی کی بلند آواز سنائی دی۔

"ارے بالی ...... بالی رے"

"ہو بھابی رے"

اُس نے صحن میں آکر بھابی کی طرف دیکھا۔

"تو نے بھی کام کام کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لے دیکھ آ کے بالگو رو نے سُن لی ہے تیری۔"

"بات کیا ہے؟"

"ارے بڑی بھاری آندھی اُٹھی ہے۔ کیا معلوم بارش بھی ہونے لگے۔ ذرا چھت پر رکھی منجھٹی (کپاس کی چھڑیاں) اُتار کر ڈیوڑھی میں رکھ دے۔ اگر بھیگ گئیں تو تنور گرم کرنے کی مشکل ہو جائے گی۔"

پالی فوراً چھت پر چڑھ گیا۔ اور پھر تین چار پھیروں میں اس نے ساری منجھٹی ڈیوڑھی میں جا پھینکی۔ اور واقعی یہ کام اس نے بہت پھرتی کے ساتھ کیا تھا۔ اسے ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی پگڑی کو درست کیا اور نتھنے پھُلا کر فخر سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"ہو بھابی!"

"ہو دیور!" نابان نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی اور کام ہو تو بتاؤ۔"

"نہیں بس بھیّا!"

"بتا دے اب پھر طعنے وانے مت دینا!"

"نہیں بھئی بس اب اور کوئی کام نہیں۔"

اس پر پالا سنگھ ٹانگیں چوڑی کئے اینٹھ اینٹھ کر قدم اُٹھاتا ہوا شاداں اور خراماں گلی گلی چل دیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص بھوسے کا بڑا گٹھڑ ادھر سے لے کر گزرا تھا۔ کیونکہ زمین پر بھُس کی لمبی سی لکیر گلی میں دور تک چلی گئی تھی۔

وہ تنگ گلی میں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک تو گلی تنگ اور پھر ہر مکان کے دروازے کے آگے بڑھا ہوا چبوترا۔ چلنے کے لئے راستہ اور بھی زیادہ تنگ ہو گیا۔ بعض مکان جو ذرا اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے بنوائے ہوئے تھے ایسے بھی تھے جن کے ہر دروازے کے آگے دائیں بائیں دو دو چبوترے بنے تھے۔ ان چبوتروں پر عام طور پر یا تو ننھے ننھے بچے کھیلا کرتے جو ہر آنے جانے والے شخص کو حیرت سے دیکھتے اور ان کے کھُلے ہوئے منہ سے رال ٹپکے جاتی یا گھر کے بہت ہی ضعیف آدمی پاؤں کے بل بیٹھے اپنی لمبی لمبی سپید ڈاڑھیوں میں کنگھا کیا کرتے۔ اپنی دانست میں ننھوں کی رکھوالی بھی کرتے لیکن ان کی پیلی پیلی گدلی اور کمزور آنکھوں کو بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ انہیں کسی ہونے والے حادثے کی خبر اس وقت ہوتی تھی جب کوئی بچہ چار پاؤں سے چلتا ہوا دھڑام سے گلی کی کیچڑ میں جا گرتا۔ اس وقت بد مزاج بہو رانیاں بھاگی بھاگی آتیں اور چھوٹے چھوٹے گھونگھٹوں کے پیچھے سے بڑبڑاتیں۔

"اتنا بھی تو نہیں کہ بچے کو دیکھتے رہیں بس کھاٹ پر بیٹھ گئے۔"

بوڑھوں کی عمر کا یہ حصہ بڑا ہی صبر آزما ہوتا تھا۔ بہوؤں کو کون سمجھائے کہ بھلا ان بچاروں کو سجھائی ہی کہاں دیتا ہے جو وہ بچوں کی رکھوالی کرتے پھریں اور اگر کبھی دیکھ بھی لیں تو بیشتر اس کے کہ ان کی لرزتی ہوئی کمزور ٹانگیں انہیں وہاں تک پہنچائیں سپاہیوں کی طرح تیز رفتار بچے دم بھر میں پھسل کر نیچے جا گرتے۔

پالی اُونچے نیچے چبوتروں سے گزرتا اور سڑے ہوئے کیچڑ کو پھاندتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ آگے گلی کشادہ ہو گئی تھی۔ وہاں چند دکانیں

بھی تھیں۔ جہاں ضروریات کی معمولی چیزیں مل سکتی تھیں۔

اس وقت دکانوں کے چبوتروں پر چند بڈھے بوڑھے بیٹھے تھے۔ ان میں تایا ہر پرشاد اور کرم دین وغیرہ بھی شامل تھے۔ کرم دین حسب معمول حقہ پی رہا تھا حقے کی آدھی چلم سے نکلی ہوئی کٹھی ہوائیں جھول رہی تھی۔ پالی نے سوچا کہ اگر وہ ادھر سے گزرا تو وہ اسے روک لیں گے۔ کرم دین اور ہر پرشاد بحث شروع کر دیں گے اور اسے ثالث مقرر کر کے اس کا مغز بھی چاٹیں گے۔ حالانکہ وہ اس وقت دینو کی دکان کی طرف جانے کے ارادے سے نکلا تھا۔ جہاں چہ کترا کر وہ بغل والی گلی میں گھس گیا۔

یہ گلی اندر والے رہٹ پر جانکلتی تھی۔ رہٹ گاؤں کے عین سرے پر ہی تھا۔ گاؤں والوں کے ایک حصے کو اس کی بہت بڑی سہولت تھی۔ عورتوں کے نہانے کا یہاں کوئی انتظام نہ تھا البتہ مردوں کے لئے کوئی دقت نہ تھی۔ پالی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا سامنے آسمان پر نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ گرد آسمان کی وسعتوں پر چھا گئی تھی۔ ایک مٹیالا دھبہ جس کی وسعت دم بدم بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بارش کا امکان بھی تھا کیوں کہ چیلوں کے جھنڈ پر پھیلائے آندھی کے آگے آگے پرواز کرتے چلے آ رہے تھے۔

فضا پر عجب قسم کا سکوت طاری تھا۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا بند تھی۔ گاؤں کے سرے کے مکانوں کو چھوتا ہوا ایک جوہڑ تھا جس میں بھرے ہوئے بدبودار، گدلے اور مٹیالے پانی کی سطح پرسکون تھی۔ ایسے سمے ہی ردل ردل کر کے تیزی سے چلتا ہوا رہٹ آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اوپر تلے گھومتی ہوئی ٹنڈ مال کی طرف دیکھتا رہا۔ کنویں کے پانی کی سطح دم بھر کو ہموار نہ ہوتی تھی۔ ٹنڈیں بڑی تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے پانی میں غوطہ لگاتیں اور پھر بھری بھرائی، مال سے جکڑی ہوئی اوپر چڑھنے لگتیں۔ اوپر پہنچنے تک پانی ان کے کناروں سے چھلکتا رہتا۔ پالی سوچنے لگا کہ پرانے زمانے میں اس آدمی کا بھی کیا دماغ ہو گا جس نے کنویں سے پانی نکالنے کی یہ تجویز سوچی ہو گی۔ پانی ادو میں گر کر تلملاتا، کلبلاتا اور جھاگ اڑاتا آڈ (نالی) میں بہہ نکلتا تھا۔ کھیتوں کو پیچ و خم کھا کر جاتی ہوئی آڈ بھی آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پانی کی شفاف سطح پر اونچے اونچے درختوں کے عکس جھلملاتے اور آڈ کے ہموار کناروں پر ایک خاص قسم کے گچھے دار چھوٹے چھوٹے پودے اُگتے تھے۔ لڑکے بالے انہیں اکھاڑ لیا کرتے تھے اور کہتے یہ ہمارے بٹیر ہیں اور پھر وہ انہیں آپس میں کھڑ کھڑا کر لڑاتے۔

رہٹ دیکھ کر پالی کو پیاس بھی لگ گئی۔ وہ جوتا اتار کر ادو میں گھس گیا اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر جھال کی طرف بڑھا دیا۔ پانی کے ننھے ننھے چھینٹے اڑ اڑ کر اس کے ہونٹوں اور کھضوروں پر گرتے رہے اس کے پاؤں تلے پانی کی تہ بیٹھی ہوئی نرم نرم ریت اور چکنی چکنی ٹھیکریاں پھسلتی رہیں۔ پانی پی کر اس نے پاؤں جھٹکا جھٹکا کر جوتوں میں ڈال دئے۔ عین اس وقت رکھی پانی بھرنے کے لئے وہاں آن پہنچی۔

رکھی ایک بچے کی ماں بائیس سالہ حسین عورت تھی۔ اس کی بھابی کی طرح وہ بھی بڑی ہنسوڑ تھی۔ دانت صاف کبھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے زردی مائل دانت دوسروں سے کم حسین دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر اس کی ناک کے ایک نتھنے پر چپکی ہوئی چھوٹے سے ہیرے والی میخ کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ اس وقت گہرے نیلے رنگ کا تہبند اور لال رنگ کا چھینٹ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے تھی۔ کرتے کے کپڑے کی سرخ زمین پر چھپے ہوئے سپید سپید آم بہت دلکش دکھائی دیتے تھے۔ اس کے کرتے عام طور پر ڈھیلے ڈھالے ہی ہوتے تھے لیکن اس کے متناسب جسم یعنی کمر، پیٹ، چھاتیوں کے خطوط کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ وہ تاباں کی سہیلی تھی اور ان کے گھر میں عام طور پر آیا کرتی تھی۔ پالی نے اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا اور اس سے باتیں کی تھیں۔ اسے اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ یہ نازک عورت نہ معلوم کیسے چار چار گھڑے اٹھائے بے خطر چلی جاتی تھی اور اب جو اس نے رکھی کو پانی بھرتے دیکھا تو اسے خیال آیا کہ کم از کم تین گھڑے تو ضرور ہوں گے اس کے پاس۔ اور واقعی تین گھڑے

پھر کر اس نے کنوین کی منڈیر پر رکھ لیئے۔ اور جب پالی مڑ کر اپنی راہ چلنے لگا۔ تو پیچھے سے آواز سنائی دی۔

" وے دیرا گھڑے تو اٹھوا دے۔"

پالی نے گھوم کر دیکھا وہ سر پر ایک گھڑا رکھے کچھ ہنس رہی تھی کچھ جھینپ رہی تھی۔ پالی نے ماتھے پر مصنوعی غصے کے بل ڈالکر کہا۔

" اور تجھے کس نے کہا تھا کہ درجن درجن گھڑے سر پر رکھ کر چلا کر۔"

یہ کہہ کر وہ شتر مرغ کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ جان بوجھ کر شیخی بگھارنے کے لئے گھڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی ہاتھ کے زور سے ہوا میں اٹھا کر جو اس کے پہلے گھڑے پر رکھا۔ تو دھچکے سے کچھ تو پانی چھلک کر رکھی کے چہرے اور سینہ پر گرا اور کچھ اس کے سر پہ دھمک پڑی۔ اس پر رکھی چیخ کر بولی۔

" میری گردن توڑے گا کیا؟"

پالی نے ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے نتھنے پھول کر سرخ ہو گئے۔ مسخرے پن سے بولا۔

" میں تیری گردن کیا توڑوں گا تو خود ہی تلی ہوئی ہے ——— نہ اٹھایا کر اتنے گھڑے۔"

رکھی نے ہونٹ سکیڑ کر جواب دیا۔

" تیرا کیا بگڑتا ہے کیا تجھے اٹھانے پڑتے ہیں گھڑے؟"

" اٹھانے نہیں پڑتے تو اٹھوانے تو پڑتے ہیں۔"

اس پر رکھی ناک پر انگلی جما کر بولی۔

" ارے ایک ہم ہیں کہ اتنے بڑے بڑے چار گھڑے اٹھائے بلا تکان چلے جاتے ہیں اور ایک تم ہو کہ .... اچھا اب لاؤ وہ گھڑا میری بغل میں دے دو۔"

پالی نے منہ ڈھیلا چھوڑ کر اپنی زبان منہ میں ادھر ادھر گھمائی اور شرارت سے مسکرا کر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور تیسرے بڑے پیٹ والے گھڑے کے کنارے کو انگوٹھے اور صرف ایک انگلی کی گرفت میں لے کر اوپر اٹھا دیا۔ گھڑا ہوا میں جھولنے لگا۔

" کیوں کیا ہم کم ہیں؟"

رکھی کا کلیجہ حلق کو آ گیا۔

" کبھی لاؤ ہمارا گھڑا۔ کنارا ٹوٹ گیا تو مفت میں گھڑا گر کر پھوٹ جائے گا۔ ... ... تھوڑا سا کام کہہ دیا تو مار کے کھپا دیا مجھے"

پالی نے گھڑا اس کی بغل کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے کوئی شخص کتے کے پلے کو ایک کان سے پکڑ کر اٹھا دے اور پرے پھینک دے۔ خدا خدا کر کے جب گھڑا اس کی بغل میں پہنچ گیا تب کہیں چین آیا اسے۔

" بڑا سا کام کہہ کر پچھتائے" یہ کہہ کر رکھی نے کمر ٹھمک دی تاکہ گھڑا ٹھکانے سے بیٹھ جائے اور پھر جانے سے پہلے وہ سر تو اوپر اٹھا نہ سکی محض ہونٹ اٹھائے اور چپ چاپ مسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو "شکریہ"

وہ چل گئی اور پالی کچھ دیر تک اسے پیچھے سے دیکھتا رہا۔ اس کی لمبی چوٹی کا سرخ رنگ کا پراندا ادھر ادھر لہراتا رہا اور پھر گلی کے موڑ پر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

رہٹ کے آگے تھوڑی دور تک ڈھلوان تھی وہ بڑھا تو خواہ مخواہ اس کے قدم کھنچتے چلے گئے۔ اس کے پاؤں کی چاپ کی آواز سے ڈر کر ایک بڑا سا کچھوا جو جوہڑ کے کنارے پر بیٹھا تھا رینگ کر پانی میں غوطہ مار گیا۔ شِن کے درخت کی ایک بلند اور مضبوط شاخ سے جھولے کی رسی لٹک رہی تھی۔ غالباً گاؤں کی لڑکیاں اس پر جھولتی رہی تھیں۔

اب وہ گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر ہی باہر چکر لگاتا ہوا دینو کی دکان پر پہنچ جائے۔ وہ گوبر اور کیچڑ سے بچ بچ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور ابھی وہ پنڈت گیان کے باڑے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے تیز مردانہ لہجے کی ایک باریک آواز سنائی دی۔

"ہو پالی!"

اس کے قدم رک گئے۔ اس نے پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا کہ چنتو کھڑی ہے۔ وہ حسبِ معمول سر بلند سپاہیانہ انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی

"ست سری اکال"

"ست سری اکال"

چنتو اس کے قریب پہنچ گئی۔ اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لمحہ بھر اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد بولی۔

"کہاں جا رہے ہو"

"اوہ کہیں نہیں ....."

"چھپاؤ مت آخر یہ جو چپکے جا رہے ہو۔ تو کچھ دال میں کالا ضرور ہے"

پالی نے بے پروائی سے قہقہہ لگایا۔

"سچ کہتا ہوں کسی کام سے نہیں جا رہا تھا۔ بیکار بیٹھا تھا۔ سوچا ذرا چکر لگا آؤں ....."

"آخر ہمی ہم سے کیا چھپانا ....."

"یہی دینو کی دکان تک جانے کا ارادہ تھا۔ بھلا اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے میرے جانے کی"

چنتو کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے پالی کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے اس کے شانے کو قدرے ہلا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"دیکھو آج آندھی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ شاید بارش ہو اولے بھی پڑیں ...."

اس بات پر پالی نے ایک مرتبہ پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ آندھی کا غبار پھیل کر تقریباً سارے آسمان پر چھا گیا تھا۔ اڑتی ہوئی چیلیں بھی قریب آن پہنچی تھیں۔ چکور کھیتوں کے سلسلے دور پہنچ کر آپس میں بالکل کھچڑی ہو گئے تھے۔ بہت پرے کچھوؤں کی مانند دکھائی دینے والی بھُس کی دھڑوں کے اوپر ہلکی ہلکی گرد اڑنے لگی تھی۔ پالی کی تیز نظریں اُن کو چھو کر واپس چلی آئیں اور پھر چنتو کے چہرے پر گڑ گئیں۔

چنتو نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"پالی ہمارے یہاں نہیں آتے تم"

پالی نے پیشانی کے اُوپر پگڑی کو ذرا آگے کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ یہ تم کیسے کہتی ہو۔ کیا میں تمہارے ہاں کبھی نہیں جاتا"

اس پر جنتو کے لبوں پر مسکراہٹ پھوٹ نکلی۔ اس کے حساس نتھنے پھڑک اٹھے اور آنکھوں کے گوشوں کے خطوط نسبتاً گہرے ہو گئے
"آتے تو ہو پر بہت کم۔"

اس اعتراف پر پالی کو مسرت حاصل ہوئی۔ اور اس نے اس مسرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"تو پھر کیسے کہتی ہو کہ میں کبھی آیا ہی نہیں؟"

"بھئی آج چلو تو جانیں۔"

"کیوں آج کیا ہے؟"

"ذرا آسمان کی طرف دیکھو کیسی آندھی آرہی ہے تھوڑی دیر بعد شاید بارش بھی ہونے لگے۔ پھر دیکھنا کیسا سماں بندھتا ہے ....
...... ایسے میں تم دینو کی دکان پر جا کے کیا کرو گے؟"

پالی نے دل میں سوچا کہ واقعی دینو کی دکان پر کوئی خاص بات تو ہو گی نہیں۔

"لیکن تمہارے ہاں کیا ہو گا۔ تم ہو گی یا چاچا جوالا سنگھ۔ ہم کریں گے کیا؟"

"نہیں آج تو ہمارے ہاں کچھ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں کچھ پینے پلانے کا انتظام بھی ہے۔ اچھا جلسہ رہے گا۔ تمہارا چاچا کہہ رہا تھا کہ اگر پالی آجائے تو بس کیا ہی مزا ہو۔ اور سچ پوچھو تو میں اس خیال سے نکلی تھی کہ جو تم نظر آجاؤ تو ساتھ لے چلوں تم راستے میں نہ ملتے تو میں تمہارے گھر جاتی ....   .. اوپر سے آندھی کا ڈر بھی تھا اچھا ہوا جو تم یہاں مل گئے۔"

پالی سر جھکا کر سوچ میں ڈوب سا گیا۔ جنتو نے اس کی کہنی کو ہاتھ سے تھپتھپا کر کہا۔

"کیوں ایسی گہری سوچ بچار کیسی؟"

پالی کے ذہن میں سرنوں کے گھر والوں کا خیال تھا۔ لیکن اب وہ جوالا سنگھ سے تعلقات بھی رکھنا چاہتا تھا۔ سوچا کہ تھوڑی دیر بعد آندھی کے شور اور گرد کی گھٹا میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا۔ مجھے کون دیکھنے آئے گا کہ میں اپنے گھر پر ہوں یا دینو کی دکان پر ہوں۔ یا جوالا سنگھ کے گھر میں اور پھر جنتو کے قول کے مطابق سماں بھی بہت اچھا تھا۔ ایسے موقعے پر شراب کی بوتل اور مرغ کی بھری ہوئی ٹانگیں کھانے کو ملیں تو انسان اور کس چیز کی تمنا کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسی برمحل دعوت کے لئے اسے جنتو کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ جنتو کا سوال سن کر وہ بظاہر لاپرواہی سے ہنس پڑا!

"نہیں سوچ بچار کا کیا کام! اور پھر اپنا گھر ہی تو ہے۔ اور نہیں تو چار گھڑی ہنس بول ہی لیں گے۔"

جب وہ دونوں جوالا سنگھ کے گھر کی طرف لوٹے تو ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ یہاں تک کہ جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو دیوار کے اوپر دھرے ہوئے اپلوں میں پھنسے ہوئے بھوسے کے تنکے بھی ہوا کے تند جھونکوں سے ہلنے لگے۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے کچی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ چار دیواری کے اندر بھی دھریک کے تین چار درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں کے سائے تلے عام طور پر ان کی بکریاں مے مے کرتیں یا مرغیاں کڑکڑاتیں۔ اس جگہ آٹا پیسنے کا خراس بھی تھا۔ اب لوگ مشین کا آٹا کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ پھر بھی خراس کی آمدنی معقول تھی۔ بھلا جوالا سنگھ کو اس کا بوجھ کیوں معلوم ہوتا۔ وہ ایک بوڑھی سانڈنی خراس کے آگے جوت دیا کرتا تھا۔ سانڈنی مزے مزے میں چلتی رہتی لوگوں کا اناج پس جاتا اور جوالا سنگھ کے پیسے کھرے ہو جاتے۔ آمدنی کے حقیقی ذرائع تو کچھ اور ہی تھے۔ لیکن ظاہرداری کے لئے کوئی نہ کوئی معقول پیشہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

چار دیواری سے گزر کر وہ دونوں صحن میں داخل ہوئے۔ پالی نے صحن کے گوشے میں کلغیدار مرغوں کے بہت سے سر اور نُچے ہوئے پر پڑے دیکھے تو اُسے اندازہ ہو گیا کہ آج وسیع پیمانے پر دعوت کا سامان ہو رہا تھا۔

جیتو پالی کے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ وہ چار قدم پیچھے پیچھے تھا۔ جیتو نے پسار میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ جوالا سنگھ قدرے غصیلے لہجہ میں بول اٹھا۔

"اری تو کہاں کو چل دی تھی۔ ..."

"گئی تھی کھیت میں اپنے یار سے ملنے کے لئے ...." جیتو نے تنک کر جواب دیا۔

اتنے میں جوالا سنگھ کو پالی دکھائی دیا۔ پسار میں چونکہ چند نئی صورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس لئے پالی دونوں ہاتھ جوڑ کر اُوپر اُٹھائے اور قدرے بلند آواز میں بولا۔

"واہگورو جی کا کھالصہ ......"

"شری واہگورو جی کی فتح" اب دوسروں نے بھی اس کی سُر کے ساتھ سُر ملائی۔

حاضرین کی آوازوں سے گرم جوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ پالی کو دیکھتے ہی جوالا سنگھ کی باچھیں کھل گئیں۔

"آہا بیٹا پالی! تم آگئے بھئی یہ تو بہت ہی اچھا کیا تو نے .... آ اِدھر بیٹھ جا چارپائی پر۔" جیتو کا مزاج ابھی تک بگڑا ہوا ہی تھا۔ وہ تیکھی نظروں سے جوالا سنگھ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"اب لگے بیٹا پالی، بیٹا پالی کہنے ...... اسی کو بلانے کے لئے تو گئی تھی۔"

جوالا سنگھ نے یہ بڑا منہ بے معنی انداز میں کھول دیا اور لمحہ بھر تک اسے کھلا ہی رہنے دیا۔

"بھئی بہت اچھا کیا، مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ تو پالی کو بلانے کے لئے گئی ہے۔"

"معلوم کیسے نہیں تھا۔ کیا تم نے ہی نہیں کہا تھا کہ پالی آجاتا تو بڑا مزا آتا ... اور اب لگے مجھی کو جھوٹا بنانے پالی کے سامنے"

"ارے بابا تو تو مفت میں ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے میرے پیچھے آخر میں نے کیا کہہ دیا تجھے۔ گھر پر اتنے کام کرنے کو پڑے تھے۔"

"بھاڑ میں گئے کام۔ کیا میں ہی کاموں کے لئے رہ گئی ہوں۔ بڑے کام لئے پھرتا ہے ......"

اس پر جوالا سنگھ نے چپ ہی بھلی سمجھی۔ وہ جانتا تھا کہ جیتو کا یہ بڑبڑانا محض اوپری دل سے تھا۔ اگر اس نے مفت میں چوں چراں کر کے بنا بنایا کھیل نہ بگاڑا تو وہ خود ہی سب کاموں سے نپٹ لے گی۔ چنانچہ اس نے جیتو کی جلی کٹی باتوں کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

اس دوران میں پالی نے بھی حاضرین کا آنکھوں ہی آنکھوں میں جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں تین مرد تھے اور ایک عورت۔ انہیں اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے گاؤں کے باشندے تو خیر وہ تھے ہی نہیں۔ ان میں ہر ایک نے چارخانے کا کھیس اوڑھ رکھا تھا صرف عورت کا کھیس سادا تھا لیکن اس کے دونوں کناروں پر سرخ رنگ کا چوڑا حاشیہ موجود تھا۔

ہوا تو ابھی ابھی چلنی شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے کھیس کیوں لپیٹ رکھے تھے۔ تینوں مردوں کی صورتیں اچھی طرح دکھائی نہ دیتی تھیں۔ البتہ عورت نے کھیس چھاتی سے اوپر کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی تہ میں ذوقِ نمائش کارفرما تھا ورنہ وہ بھی ساتھیوں کی طرح کھیس لپیٹے گُپ چُپ بیٹھی رہتی۔

پالا سنگھ کے لئے یہ بات تعجب انگیز ضرور تھی لیکن اس وقت اس کی حقیقت دریافت کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔

چنتو کی باتوں سے کان ہٹا کر جوالا سنگھ نے خاصی بلند آواز میں مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ اپنا ہی لڑکا ہے بچپن ہی سے سیر کرنے کا شوقین تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں یہ گھر سے بھاگ نکلا۔ اور پھر کئی برس تک گھر سے غائب رہا۔ آخر لمبے عرصے کے بعد گھر پر منہ آن دکھایا۔۔۔۔ جب یہاں سے گیا تھا تو یہ بالکل ننھا سا تھا۔ اب جو واپس آیا تو صورت میں زمین و آسمان کا پھرک پیدا ہو گیا"

حاضرین میں سے کسی کے بشرے سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اسے دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے۔ وہ چپ چاپ جس انداز سے پہلے بیٹھے تھے۔ اسی انداز میں بیٹھے رہے اور سرد نگاہوں سے پالی کی طرف دیکھتے رہے۔ کیسوں میں ان کی داڑھیاں تو چھپی ہوئی تھیں البتہ ان کی ادھ کھلی آنکھیں کبھی بہت خطرناک معلوم ہونے لگتیں اور کبھی بالکل معصوم۔ محض عورت تھی کہ اس نے پالی کا نام سن کر ذرا سا رخ بدلا۔ پالی نے دیکھا کہ عورت کی ناک اور آنکھیں بہت ہی دلکش تھیں۔

پالی بھی جوالا سنگھ کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لیکن ان سب کی پُر اسرار خاموشی کی وجہ سے اسے کوفت سی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ہوا تیز چلنے لگی۔ پالی نے دروازے میں سے دیکھا کہ ہوا لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور گرد اس قدر پھیل چکی تھی کہ صحن سے پرے کوئی چیز بھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ آخر جب گرد اندر بھی داخل ہونے لگی تو پالی نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ جوالا سنگھ اٹھا اور دیوار کی کھونٹی کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین کا بٹن دبا کر چمنی اوپر اٹھا دی اور پھر جیبیں ٹٹولنے لگا۔ دو تیلیاں خالی گئیں تیسری جل اٹھی اور اس نے لالٹین روشن کر ہی دی یہ کام ختم کر لینے کے بعد سب کی طرف اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے ایک گہرا سانس اندر کھینچا اور پھر بلند آواز کے ساتھ منہ سے ہوا اس طرح چھوڑ دی جیسے اس نے بڑے معرکے کا کام کر ڈالا ہو۔

کچھ دیر تک جوالا سنگھ بلند آواز میں باتیں کرتا رہا لیکن گفتگو میں اور کسی نے حصہ نہ لیا۔ یونہی ان پُر اسرار آدمیوں میں سے کسی کے نتھنوں میں سے درندے کی غراہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی اور مونچھیں نامعلوم طور پر متحرک ہو کر رہ جاتیں۔

اتنے میں چنتو اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے آبخورے تھے۔ اس نے آبخورے ایک بڑے آلے میں رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں دوسری عورت کے چہرے پر جا کر رک گئیں۔ حسب معمول بے تکلفانہ لہجے میں بولی۔

"کیا نام تمہارا۔۔۔۔۔۔ پیارو جرا اٹھ کر یہ کچے (آبخورے) ہی دھو ڈال۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی آپس میں بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ اجنبی عورت نے چنتو کی اس بات پر فوراً اٹھنے کی بجائے ان میں سے ایک مرد کی طرف دیکھا۔ اس مرد کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے خصوصاً اس کی اونچی ناک کی نوک پر بیشمار چھوٹے چھوٹے دانوں کی جالی سی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ابروؤں کا ہلکا سا اشارہ پا کر عورت نے کھیس اتار کر پرے رکھ دیا۔ وہ تہبند سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی تو پالی نے دیکھا کہ وہ خاصی تگڑی عورت تھی اور پھر جب اس نے پیٹ کھینچ کر تہبند کے پلو کسے تو اس کی آگے کو بڑھی ہوئی سڈول چھاتیوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگ سکتا تھا کہ قدرے موٹاپے کے باوجود اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا نہیں تھا۔ خدوخال بھی واہی تھے۔ اس کے چلنے پھرنے اور اوڑھنی سنبھالنے کا انداز ایسا دلکش تھا کہ مرد کے دل میں خواہ مخواہ پیار پیدا ہوتا تھا وہ خاصی کھاتی کھیلی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کا بھرپور بدن اور ناز و ادا اس بات کے ضامن تھے کہ وہ اپنے مقابل مضبوط سے مضبوط مرد کو پوری تسکین دے سکتی تھی۔

اس نے آبخورے بسار کے اندر ہی دھو ڈالے کچے فرش پر پانی کی لکیریں سانپوں کی طرح بل کھاتی بہہ نکلیں۔

جوالا سنگھ نے پالی کو سرگوشی میں بتایا کہ چیچک کے داغوں والے آدمی کا نام میت سنگھ ہے۔ پرانا خرانٹ ہے۔ عورتوں اور نوعمر لڑکیوں

ِسے بھگا کر لے جانا اور پھر انہیں کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالنا اس کا خاص پیشہ ہے۔ وہ اس فن میں استاد ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ صورت خراب ہے تو عورتیں سے نفرت کرتی ہوں گی۔ نہ معلوم اس میں کیا بھید ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ بعض آدمیوں کے ہاتھ پر ہر بھینس بیٹھ جاتی ہے یعنی خواہ کتنی بھی اڑیل منہ دی کتنی ہو جہاں اس نے تھن پر ہاتھ رکھا اور وہ رام ہو گئی یہی حال مِت سنگھ کا ہے۔ ایسے مزے مزے میں لڑکیوں اور عورتوں کو پھسلاتا اور انہیں غ دکھاتا ہے کہ بس وہ اسی کی ہو رہتی ہیں۔ لیکن صرف اتنی سی بات نہیں ہے۔ وہ دیگر فنون میں بھی ماہر ہے۔ لڑنے بھڑنے میں بھی بہت شہرت ل ہے اسے۔ بلکہ اپنی اس صفت پر اسے ناز بھی بہت ہے۔ دیگر نیک کاموں مثلاً چوری ڈاکے وغیرہ میں بھی حصہ لے لیا کرتا ہے . . . . "

پیارو نے آبخورے دھو ڈالے تو ان تینوں میں سے ایک اُٹھا اور اس نے کونے میں پڑا ہوا ایک پرانا ٹرنک تینوں چارپائیوں کے ، فرش پر رکھ دیا اور وہ آبخورے ٹرنک کے اوپر بغیر کسی قرینے کے دھر دیئے گئے ——— پالی چونکہ انہیں غور سے دیکھ رہا تھا اس لئے ، وہ آدمی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو اس نے جانچ لیا کہ وہ اکہرے بدن اور ادھیڑ عمر کا شخص ہے۔ جوالا سنگھ نے کھسر پھسر جاری رکھی۔ . . . . .

" . . . . اور اس آدمی کا نام سادھو سنگھ ہے۔"

یہ نام سن کر پالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹنے لگی۔ نام سادھو سنگھ لیکن وہ صورت سے گرہ کٹ معلوم ہوتا تھا۔ دبلے پتلے ہاتھ پاؤں بلا جسم اور متجسس آنکھیں۔

پیارو جوتیاں پھٹپھٹاتی چارپائی کی طرف بڑھی اور مِت سنگھ کے ساتھ ہٹ کر بڑے ٹھسّے سے بیٹھ گئی۔ وہ اس انداز سے بیٹھی ں بھی بڑی بھلی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے موٹی آنکھوں کے نیچے قدرے بھونڈے پن سے پھیلا ہوا کاجل بُرا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ٹے مسکراہٹ اور سنجیدگی کا نہایت حسین سنگم دکھائی دیتے تھے۔

باہر آندھی چلنے لگی تھی۔ چند لمحہ پیشتر جو سکوت طاری تھا اب اس کی جگہ انتہائی شور و غل نے لے لی تھی۔ چنانچہ جنتو کسی کام سے ر آئی تو بولی۔

"گرد . . . . گرد ہی گرد۔ سورج ڈوبا نہیں اور باہر دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کالی رات۔"

جوالا سنگھ نے پالی کی ران میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

"کہو بیٹا! پسند ہے پیارو۔ چاہو تو مل سکتی ہے۔"

پالی بھاری آواز میں ناک ہی ناک میں ہنسا۔

جوالا سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں کلّوں سے نیچے لٹکے ہوئے گوشت کو جنبش دی۔

"بڑی چلبلی اور حرام جادی ہے یہ عورت۔ ظالم ہے یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ مِت سنگھ کسی اچھے گھرانے کے رنڈوے مرد پر ڈورے ڈال س سے کچھ رقم لے کر پیارو کی اس کے ساتھ شادی کروا دیتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو بانج لوگوں کا کسی عیب کی وجہ سے بیاہ نہیں ہوتا ان کے گھر دں کو بہو کا بہت چاؤ ہوتا ہے۔ وہ بہو کو گہنوں سے لاد دیتے ہیں پھر ایک روز شام کے وقت پیارو کہتی ہے 'میں جوار چگنے جاؤں گی' ایک ی بوڑھی اس کے ساتھ بھیج دی جاتی ہے۔ کھیت میں پہنچ کر بڑھیا تو مینڈھ پر بیٹھتی ہے اور گہنوں سے لدی پھندی پیارو چپکے چپکے کھیت کے ہی اندر چلتی ہوئی پرے چلی جاتی ہے اور وہاں مِت سنگھ پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے اور وہ اسے اڑا کر لے آتا ہے. . . . . . ."

پالی کو یہ ترکیب سن کر بڑی خوشی حاصل ہوئی اور اس کی کسی حد تک دانتوں کی نمائش بھی کی۔

پھر بالی نے تیسرے مرد کی طرف جو پہاڑ کی مانند پوری چارپائی پر جا بیٹھا تھا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"چاچا وہ کون ہے؟"

جوالا سنگھ نے ناک کے نتھنے میں انگلی ڈال کر ایک لمبا سا "چوہا" باہر نکالا اور پھر اسے چارپائی کی پٹی کے ساتھ چھڑتے ہوئے کہنے لگا

"وہ جیل سنگھ ہے ...... تم نئے نئے آئے ہو تم اسے نہیں جانتے۔ اس کمبخت اس کے مقابلے کا ڈاکو پنجاب بھر میں نہیں ہو گا۔ پلس (پولیس) کا اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اپنے علاقے (ضلع) میں ڈاکہ نہیں ڈالتا ہے لیکن لائلپور، گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا، گیرہ (وغیرہ) میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے لوگوں نے اس کا نام سُن رکھا ہے پر بہت کم لوگ پہچانتے ہیں اسے۔ آج کل اس جہان تو یہی ہے۔ تمہارے باپ کے جُگ میں تو وہ چھوٹا ہی تھا۔ اس کی عمر تم سے چھ سات برس زیادہ ہو گی۔ دیکھو تو کیسا دیوکاد ہے ...... ہے بڑا نیک آدمی۔ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے گوردوارے میں متھا ٹیکنے کے لئے ضرور جاتا ہے اسی لئے تو اسے ہر کام میں سپھلتا ہوتی ہے"

چنتو نے مصنوعی غصے سے چلّا کر کہا۔

"یہ کیا دھیرے دھیرے کھسر پھسر کئے جا رہے ہو۔ بوتلیں تو نکالو کہاں رکھی ہیں ......"

جوالا سنگھ نے منت کہا۔

"دیکھو اب میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوں تم کندھی نکال لاؤ۔ ڈھارے کے نیچے اپلوں میں دبی پڑی ہیں بوتلیں۔"

چنتو تھی ہنس مکھ اور باہمت عورت۔ لیکن سب کا بڑے آرام سے بیٹھے رہنا اور اسے ادھر اُدھر بھاگنے پر مجبور کرنا اس کے دل کو بُری طرح کھلتا تھا۔

خیر بوتلیں بھی ٹرنک پر رکھ دی گئیں۔

اب محفل میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اپنی جگہ پر پہلو بدل بدل کر لعاب دہن نگلنے لگے۔

گھر کی کشید کی ہوئی ناجائز شراب کی تیزی اور نشے کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور پھر اس میں پانی وغیرہ ملائے بغیر حلق سے اُتار لینا کچھ انہی لوگوں کا کام تھا۔

سادھو سنگھ نے بڑی متانت سے چالیس اونس کی بوتل کے منہ میں پھنسے ہوئے مضبوط کاک کو دانتوں میں دبا کر ایک جھٹکے سے کھینچا اور "بھاق" کی آواز سے کاک باہر نکل آیا۔ تھوڑی شراب اس کے ہاتھ پر گر پڑی۔ وہ اسے پگڑی کے شملے سے پونچھنے لگا تو چنتو نے بڑھ کر اس کی طویل ڈاڑھی کو مٹھی میں لے کر کہا "بھلا یہ ڈاڑھی کس کام کے لئے بڑھا رکھی ہے" یہ سُنکر اس نے ڈاڑھی ہی سے ہاتھ پونچھ ڈالا۔

چنتو کی اس بات پر حاضرین کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور بعض کے دانتوں میں سے مختصر سی ہنسی بھی نکل پڑی۔

جب چنتو نے ایک بڑا دیگچہ بھی فرش پر لا رکھا تو مسالوں اور شراب کی ملی جلی خوشبو سے سب کے نتھنے مہک اُٹھے۔ انہوں نے کھیس شانوں سے گرا دیئے اور تندرے آگے کو جھک کر چارپائیاں ایک دوسرے کے قریب گھسیٹ لائے۔ اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر شراب کے آبخورے تھامے اور پھر اسے حلق میں انڈیل کر باچھیں پونچھنے اور چٹخارے لینے لگے۔

ایک ایک آبخورہ چڑھا لینے کے بعد حاضرین میں سے ہر ایک کے لبوں پر فراخدلانہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے سے جان پہچان کرنے کی غرض سے پہلے کی نسبت زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔

جیلی سنگھ کے کندھوں سے چارخانے والا کھیس کھسک کر اس کی کمر کے گرد لپٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ کسی صورت بھی نہ ہوسکتی تھی۔ اس کی ڈاڑھی چھدری چھوٹی اور خوش وضع تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھی اصولوں پر سختی سے پابند تھا۔ اس کے بال بہت باریک اور ہلکے تھے۔ صورت بھی بُری نہ تھی۔ لیکن بدن دہرا تھا۔ بہت چوڑے کاندھے، ابھرا ہوا سینہ، موٹی گردن، اور میٹھی ہوئی آواز تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھوں کی لمبی اور بھرپور انگلیاں پھیلی رہتی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپس میں مل نہیں سکتی تھیں۔ جڑ کی طرف پہلے جوڑ کے نیچے نیچے اس نے انگلیوں پر باریک ستلی کی رسی خوب کس کر لپیٹ رکھی تھی۔ اس طرح غالباً ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہوتی تھی۔ جو کوئی ایک مرتبہ ان انگلیوں کی لپیٹ میں آجاتا مشکل ہی سے چھٹکارا پاتا۔

پہلا آبخورہ ختم کرنے کے بعد جیلی سنگھ نے شراب سے تر مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں نیچے جھکایا اور پھر انہیں زور سے چوس کر آزاد چھوڑ دیا۔

ایسے موقعہ پر چنتو بھی چوکنے والی نہیں تھی۔ وہ بھی کہنی آئے میں ٹیک کر اور دھڑ کا سارا بوجھ اسی پر ڈال کر ایک آبخورہ چڑھا گئی اور پیارو کو چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔

"اری پیارو . . . . . . "

پیارو نے چپ چاپ اس کی طرف دیکھا اور نازک انگلیوں سے نتھنے پر چمکتی ہوئی کیل کو ٹٹولنے لگی۔

"ہو پیارو . . . . تم بھی تو پیو ایک آدھ گھٹا"

پیارو نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی ادا سے ناک چڑھا کر بولی۔

"نا ہم نہیں پیتے"

چنتو نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر زور کی ہچکی لی۔

"اچھا جی؟ ـــــــ وہ کیوں؟"

"ہمیں اچھی نہیں لگتی"

اسی اثنا میں چنتو نے ایک آبخورہ شراب سے بھر دیا اور اسے چھلکاتی ہوئی پیارو کے قریب چلی گئی۔

"لو میری کٹو! ذرا چکھ کر تو دیکھو"

پیارو نے پھر ناک چڑھائی اور بڑھتے ہوئے آبخورے کو دور ہی سے روکتے ہوئے بولی۔

"بس جی بس ہمیں تو ابکائی آنے لگتی ہے"

چنتو کا ہاتھ رک گیا۔ اس کا منہ تندرتے کھلا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کھوئی کھوئی نظروں سے پیارو کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہے . . . . . جب اور سب پاپڑ بیل چکی ہو تو پھر اس میں ایسا حرج ہی کیا ہے؟"

ایسے موقعہ پر بھلا پیارو منہ توڑ جواب دیئے بغیر کہاں رہ سکتی تھی۔

"اجی یہ ایک پاپڑ تمہارے بیلنے کے لئے چھوڑ دیا ہے ہم نے"

پیارو کی حاضر جوابی پر سب مرد قہقہے لگا کر ہنس پڑے جیسے کوئی سیڑھیوں پر سے متعدد خالی کنستر لڑھکا دے۔

جوالا سنگھ نے ہاتھ پھینک کر داد دیتے ہوئے کہا۔

"آہا پیارو! قربان جائیے کیا بات کہی ہے"

مت سنگھ نے پیارو کی کمر بازو کے حلقے میں لینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پیارو، پیارو ہی ہے"

اس پر سادھو سنگھ نے ترنگ میں آکر کہا۔

"پر مت سنگھ تم بھی بس مت سنگھ ہی ہو ...... کوئی ہے تمہارا ثانی؟"

مت سنگھ نے دوسرے آبخورے کا کچھ حصہ خالی کرنے کے بعد سادھو سنگھ کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

"اور سادھو سنگھ تم بھی بس سادھو سنگھ ہی ہو" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف بڑی داد طلب نگاہوں سے دیکھا جیسے اس نے بڑے معرکے کی کوئی بات کہہ دی ہو" یار اپنا سادھو سنگھ بھی بڑا گھاگ ہے۔"

جوالا سنگھ نے سر کے چھوٹے سے جُوڑے کو چھو کر کہا۔

"اب تو سادھو سنگھ عیش کرتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور چین کی بنسری بجاتا ہے۔"

چنتو نے دیگچے کا ڈھکنا اوپر اٹھایا بھاپ کا بادل ایک بھبک کے ساتھ باہر نکلا اور کچھ دیر تک تو چنتو کو یہ بھی نظر نہ آیا کہ دیگچے میں بھاجی (گوشت) ہے بھی یا نہیں۔ جب بھاپ کم ہوئی تو اس نے کڑچھے سے بڑی بڑی بوٹیاں ایک طویل و عریض تھال میں ڈالنی شروع کر دیں۔

ہر مرغ کے صرف دو ٹکڑے کئے گئے تھے پیٹھ اور ٹانگیں ایک طرف اور سینہ اور بازو دوسری طرف شوربہ بہت گاڑھا تھا جب وہ بوٹیاں نوچتے تو شوربے کی بوندیں ٹپک ٹپک ان کی ڈاڑھیوں پر گرتیں اور پھر وہیں بالوں میں پھنس کر رہ جاتیں۔ وہ شراب پی رہے تھے اور زور زور سے باتیں کئے جا رہے تھے۔

اب پالی کو بھی لطف محسوس ہونے لگا تھا۔ کچوری سے گالوں والی پیارو سے بھی دو تین مرتبہ آنکھ لڑ چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ آج ادھر چلا آیا۔ ورنہ اس وقت وینو کی دکان پر کیا دھرا ہے۔ اور پھر باہر آندھی کے بعد بڑے زور کی بارش بھی ہونے لگی تھی۔ بھلا کسی کو کیا معلوم کہ وہ اس وقت کہاں بیٹھا ہے راز افشا ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اس قسم کے خیالات سے پالی کے دل کو از حد اطمینان محسوس ہوا اور وہ ٹانگیں سمیٹ سنبھل کر بیٹھا۔ پائی کے اوپر ہو بیٹھا۔

اب آپس میں ادھر ادھر کی بے تکی باتیں ہونے لگیں۔ کہاں تو ان میں سے ہر ایک چپ چاپ اپنی ہی دھن میں مگن بیٹھا تھا اور کہاں اب جو باتیں کرنے پر آئے تو ایک دوسرے کی بات تک سننے کا یارا نہ رہا۔

دفعتاً مت سنگھ کھیس لہراتا ہوا اُٹھا اور لمبے لمبے پَر پھڑپھڑاتے ہوئے گِدھ کی طرح چنتو کی طرف بڑھا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔

"میں شراب نہیں پیوں گا"

پالی نے جانچا کہ مت سنگھ ایک قد آور مضبوط ہاتھ پاؤں کا شخص ہے۔ داغوں بھرے چہرے اور سرخ آنکھوں کی وجہ سے وہ اور بھی خوفناک دکھائی دیتا تھا۔

چنتو کا دماغ بھی اس وقت عرش پہ تھا۔ اونچے بانس کی طرح لہرا کر بولی۔

"نہیں پیو گے شراب؟"

"نہیں"

پھر مت سنگھ نے ریچھ کی طرح نفی میں سر زور زور سے اِدھر اُدھر ہلایا۔ سر کے ساتھ اس کا دھڑ بھی ہل گیا۔

خاص شرابیوں کے سے مخلصانہ انداز میں چنتو اس پر جھکی اور آنکھوں کی پتلیاں گھما کر پوچھنے لگی۔

"کیوں نہیں پیو گے؟ کیا تم پر بھی پیار دکا اثر ہو گیا ہے؟"

"نہیں میں کچے (انگور ے) میں نہیں پیوں گا"

اس پر چنتو نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر جسم کا توازن ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو کاہے میں پیو گے"

"اوک سے پئے گا" جوالا سنگھ نے لقمہ دیا۔

"ناہیں" مت سنگھ نے پھر زور سے سر ہلا دیا۔

مت سنگھ جو ناچ کھڑا ہوا تو محفل میں اور گرما گرمی پیدا ہو گئی۔ اس دوران میں پالی کو محسوس ہوا کہ پیارو اس کی جانب میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

جیل سنگھ ہنس کر بھاری آواز میں بولا۔

"اوک سے نہیں وہ چھتّر (جوتے) میں پئے گا۔"

"ناہیں" مت سنگھ نے پھر زور سے سر ہلا دیا۔

چنتو لڑکھڑا کر پہلے تو بے اختیار پیچھے کی جانب ہٹی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ زور سے آگے بڑھی اور مت سنگھ کے سینہ پر انگلی رکھ کر بولی۔

"تو پھر تم کاہے میں پیو گے"

مت سنگھ پہلے تو لمحہ بھر سرخ سرخ آنکھوں سے چنتو کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے دفعتاً ہاتھ بڑھا کر بوتل اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اس سے منہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ بوتل خالی ہو گئی تو اس نے اسے منہ سے پرے کر کے اُوپر اُٹھا لیا اور اس میں سے ٹپکنے والی آخری بوند کے نیچے بھی اپنی زبان بڑھا دی۔ . . . . پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کی طرف ہٹا یہاں تک کہ اس کی پیٹھ گھڑونچی پر جا کر ٹک گئی اور وہ سر ہلا ہلا کر بڑی دردناک اور غیر مسلسل آواز میں وارث شاہ کی ہیر گانے لگا۔

"اساں وت نہ آن کے کھیڈنا ای"

تھوڑی دیر تک وہ گاتا رہا۔ پھر اس کی آواز محض درد میں ڈوب کر رہ گئی۔ بالآخر اس نے سست نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور پھر دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور سر جھکا کر بازوؤں میں چھپا لیا۔

اس کے خاموش ہو جانے سے فضا سوگی نہیں البتہ سنجیدہ ضرور ہو گئی تھی۔ وہ بڑے آرے میں دونوں ہتھیلیاں ٹکائے اس انداز سے کھڑی تھی جیسے اسے گر پڑنے کا خطرہ لاحق ہو۔

باقی چاروں کے حواس قائم تھے۔ وہ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جوالا سنگھ کو اپنی بے تحاشہ اُگی ہوئی داڑھی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اس نے فوراً تین چار انگلیاں جوں کی تلاش میں بالوں میں داخل کرتے ہوئے ہنس کر گم سم مت سنگھ کی طرف دیکھا۔

"جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو میت سنگھ میں اور گاؤں کے دیگر لڑکے لکن میٹی (آنکھ مچولی) کھیلا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی جوانی کے شروع ہی میں گاؤں سے بھاگ گیا اور اگر سچ پوچھو تو ایک طرح سے اب بھی بھاگا ہوا ہے۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار آن کر گاؤں والوں کو منہ دکھا گئے"!

جیل سنگھ نے ابرو سے پالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کون ہے؟"

"ارے اس کی بات تو کی تھی تم سے ایک دیکھے۔ جاد نہیں یہ سنتا سنگھ کا لڑکا ہے پالا سنگھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنتا سنگھ بھئی سنتا سنگھ، جانتے تو ہو اس کا نام"

"ہو ہو بھلا سنتا سنگھ کا نام کس نے نہیں سنا۔ اچھا آج کل کیا کرتا ہے یہ چھوکرا"

جیل سنگھ عمر میں پالی سے بڑا تھا۔ اس کا انداز گفتگو پسند نہیں آیا۔ وہ اس کا ذکر اس انداز سے کرتا تھا جیسے وہ اس کے سامنے کل کا بچہ ہو۔ اس کا حلق خشک سا ہونے لگا۔ وہ چارپائی کی پٹی پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اُٹھنے لگا۔ تو جوالا سنگھ نے پوچھا۔

"اٹھتے کیوں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"پیاس لگی ہے جرا پانی پیوں گا"

"میں لائے دیتی ہوں" پیارو نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے شراب نہیں پی تھی۔ چنانچہ گھڑونچی کی طرف چلی تو پالی کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ جوالا سنگھ اور جیل سنگھ باتوں میں مصروف تھے۔ میت سنگھ نے کسی اور کے جانے بغیر سر اوپر اُٹھایا اور خوابناک نظروں سے پالی کی طرف دیکھنے لگا۔ پالی کی نظریں پیارو کی نگاہوں کی متلاشی تھیں۔ پیچھے میں پانی انڈیلتے وقت پیارو نے گھوم کر دیکھا اور بے خبری میں گھڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور قلابازی کھا کر گھڑونچی سے فرش پر گرا، گرتے ہی ٹوٹ گیا اور سارے فرش پر جل تھل ہو گیا۔

پالی اس کی مدد کرنے کے لئے جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا تو دفعتاً میت سنگھ نے ان دونوں کے درمیان حائل ہو کر اسے کہنی کے ٹھوکے سے بڑے زور کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا۔ اور نشے میں ڈوبی آواز میں بولا۔

"سردار جی جرا ہوش کی دوا کرو"۔

پالی پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میت سنگھ کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ نہ معلوم نشے کی ترنگ میں اسے پالی پر کیا شک گزرا۔ وہ قدم بقدم بڑھتا ہوا پالی کے قریب پہنچا۔ پالی کو لمحہ بہ لمحہ اس کا داغوں بھرا چہرہ اپنی آنکھوں کے قریب آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہاں تک کہ اسے بے شمار داغوں سے بھری ہوئی ناک دکھائی دینے لگی اور پھر زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور اس کی پگڑی پرے جا گری ——— پالی نے لمحہ بھر کو چپ چاپ اس کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے کہا "میں لڑائی بھڑائی پسند نہیں کرتا اب تم اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ" لیکن میت سنگھ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اس کا پنجہ اس کے گریبان پر کس گیا۔ جوالا سنگھ بیچ بچاؤ کرنے کے لئے ان کے قریب پہنچا تو پالی نے نرمی سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ میت سنگھ نے ایک اور تھپڑ پالی کے منہ پر رسید کیا۔ اور پھر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی گردن دبانے لگا۔

اس پر پالی نے میت سنگھ کی ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھ کر زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا اور پھر جبڑے پر جو گھونسا رسید کیا تو وہ دروازے سے جا ٹکرایا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ آدھا باہر بارش میں اور آدھا اندر ڈھیر ہو گیا ——— جینتو اسے اٹھانے کے لئے بڑھی تو پالی نے کہا "جینتو ادھر آؤ پہلے میرے کرتے پر بٹن ٹانک دو"۔ جینتو اس کی طرف چلی آئی۔

سب دم بخود بیٹھے تھے۔ بنت سنگھ کے مسوڑھوں سے خون بہہ بہہ کر بارش کے گدلے پانی میں حل ہوتا رہا اور اس وقت ہولا سنگھ اور چنچل سنگھ نے ایک دوسرے کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا۔

(۷)

دیوالی قریب آئی تو ان لوگوں کے گھروں میں جو دیوالی دیکھنے کے لئے امرت سر جانے والے تھے بڑی چہل پہل دکھائی دینے لگی۔ وہ صرف پہلے جنداں ترنجن سنگھ کے گھر کے صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ سرنوں کی ماں اس وقت چوکے میں بیٹھی تھی۔ سنداں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"آؤ بہن دو دن سے شکل تک نہیں دکھائی؟"

"سکل کیا دکھائیں، میں ٹھہری بیکار اور تم"

جنداں نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے سنداں کی طرف دیکھا اور قدرے دکھی لہجے میں کہا۔

"اری کہاں کام وام کیا"

"لو اور سنو جب دیکھو کام۔ جب دیکھو کام"

جنداں نے مونڈا آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کوئی نبٹتا تو نہیں نا۔ تمہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں بڑے کام کرتی ہوں۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ کام بس ادھورے ہی پڑے رہتے ہیں۔ بڑی ہی پریشان رہتی ہوں۔"

"بہن کہوں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب چھوڑ دو دنیا داری کے جھنجٹ۔ اپنا پیڑھی پہ بیٹھ کر واہگورو واہگورو کیا کرو۔"

یہ جنداں کی دکھتی رگ تھی۔ اس نے لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ اب چونکہ روپیہ پیسہ زیادہ ہو گیا ہے اس لئے اس کا لوبھ بھی دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ خواہ سنداں نے یہ بات بھولپن ہی میں کہہ دی ہو لیکن جنداں نے دل میں اس کی چبھن کو بری طرح محسوس کیا۔ تاہم اس نے دلی کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔

"واہگورو واہگورو تو اٹھتے بیٹھتے منہ سے نکلتا ہے سچ پوچھو بہن واہگورو بغیر کوئی سہارا بھی کسی کا . . . . . ."

اس پر سنداں نے بڑی پہنچی ہوئی بھگتنی کی طرح ہاتھ کی پانچوں انگلیاں نفی کے طور پہ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نا بہن نا . . . . واہگورو بغیر کوئی سہارا نہیں —— تیرا بھانا میٹھا لاگے . . . . پالی کا باپو بھی یہی کہا کرتا تھا . . . . . ."

پالی کے باپو کے نام کا حوالہ تو سنداں نے اس طرح دیا جیسے وہ کوئی بڑا مہاتما ہو گزرا ہو اسی خیال سے جنداں کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، جسے زبردستی دباتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"بہن تم مزے میں ہو گھر میں بہو کام کرنے ہیں . . . . سارا سارا دن . . . ."

جنداں کہنے تو لگی تھی کہ سارا سارا دن بے کار گھومتی ہو لیکن دفعتاً یہ الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئے اور وہ بات کا پہلو بدل گئی۔

". . . . . سارا سارا دن . . . . واہگورو نام کا جاپ کرتی رہتی ہو . . . ."

سنداں نے جنداں کی بات کا سچ مچ یقین کر لیا۔ بڑی گمبھیرتا سے بولی۔

"ہاں جی . . . . اب کیا عالم ایک سانس آتے دوسرا نہ آئے۔ پالی کے باپو نے بھی (پھانسی پانے کے لئے جیل) جانے سے پہلے مجھے

اس بات کی پکی کر دی تھی۔ کہنے لگا بھاگوان! میں تو ہمیشہ یہی مت (نصیحت) دیتا آیا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ باگورو کا سمرن کیا کر......... اور میں نے بھی اس کی بات پلّے سے باندھ لی....... اور نہیں بہن یہ سب کچھ...... یہ مکان یہ کھیت یہ روپیہ (جو تم نے بٹورا ہے) اور یہ گہنے (جو تم نے بنوائے ہیں) سب کچھ اسی دنیا میں تو چھوڑ جانا ہے........."

جنداں نے جگتی رس میں ڈوبی لمبی چوڑی تقریر سُن کر سنداں کے مگرمچھ نما چہرے کی طرف دیکھا اور ایک ہلکی سی آہ بھر کر بولی۔

"بہن تم دھن (دھنیہ) ہو۔ دھن ہو تم جو روز واہگورو کی طرف دھیان لگاتی ہو......."

اسے اس قدر مطمئن لہجے میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتے دیکھ کر سنداں کے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ اس کے دل میں بڑی بھاری خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی منہ بولی بہن بھی باگورو کی طرف دھیان دے۔ لیکن کس طرح؟ یہ بات جلدی سے اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔

"لو بہن ایک پراٹھا ہی کھاؤ" جنداں نے رکابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نا بہن ابھی ابھی کھا کے چلی آ رہی ہوں......" سنداں نے لعابِ دہن نگلتے ہوئے جواب دیا۔

پھر اس نے کن انکھیوں سے پراٹھے کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت مکھن میں گڑ گچ ہو رہا تھا۔ اُدھر جنداں نے پراٹھا اُلٹنے کے لئے منہ پھیرا ادھر اس نے ہاتھ بڑھا کر رکابی اپنے آگے کھینچ لی۔ وہ کھانے پینے کی شروع ہی سے بہت شوقین تھی۔ ان باتوں میں شرم کرنا وہ محض حماقت سمجھتی تھی۔ پہلے جو دل بھاتا کھاتی۔ لیکن اب بال بچوں والے گھر میں اُسے بڑھیا سمجھ کر زیادہ خاطرداری نہیں کی جاتی تھی۔ اس لئے اتنا مزے دار پراٹھا نظر انداز کر کے وہ ناشکرے پن کا گناہ سر پر لینے کو تیار نہیں تھی۔ جب جنداں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے قول اور فعل میں یہ تضاد پا کر اسے کچھ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ یوں بھی سنداں کی عادت سے واقف تھی اور پھر وہ دوسروں کی کئی کمزوریاں نظر انداز کر دیتی تھی۔

سنداں نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر تندے ناک چڑھائی اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟"

"ڈیلوں کا اچار"

"اچھا... اچھا"

یہ کہہ کر گویا اس نے پراٹھا کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ دو چار نوالے کھا کر جو زبان نے پراٹھے کی نرمی اور مکھن کی خوشبو کا مزا پایا تو وہ پھر جنداں کی بھلائی کی باتیں سوچنے لگی۔

"میں کہوں ــــــ جنداں! اب تم ایک اور بہو لاؤ نا۔ گھر سے دو بہوئیں تو آہی چکی ہیں۔

یہ جنداں کا محبوب مضمون تھا۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔

"ہاں بہن!...... کوئی بہو ڈھونڈو نا ہمارے لئے؟

"تو بھلا تمہیں بہوؤں کا گھاٹا ہے کیا؟"

"گھاٹا تو نہیں پر تم سمجھو نا گھر گھاٹ بھی تو دیکھنا ہوا۔ ساری عمر کا سمبندھ ہوتا ہے۔"

یہ باریک بینی جنداں کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ اس نے آنچل سنبھال کر جواب دیا۔

"اری بہن! بیاہ ہونا چاہئے سمبندھ تو اپنے آپ ہی ہو جاتا ہے...... ساری عمر کا۔

جو بات سنداں نے بڑی معرکے کی سمجھ کر کہی تھی جنداں کو پسند نہ آئی۔ خیر اس نے اس کے الفاظ کو سنا اَن سنا کر کے کہا۔

"سنداں بہن اسی وجہ سے سرزوں کا معاملہ رکا پڑا ہے۔ جب تک بڑے بھائیوں کی شادی ہو جائے تو بہن کی بھی ہو...... ہے نا ...... یوں تو بہن کی پہلے ہونے میں بھی کیا ہرج ہے۔"

سنداں سرزوں کو تو اپنا ہی مال سمجھے بیٹھی تھی۔ مناسب موقعہ جان کر اس نے جنداں کو بھی کنا ئتہً یہ بات سنا دی۔

"سرزوں کی بات کیا کرتی ہو۔ اسے کس بات کا گھاٹا ہے وہ تو میری بیٹی ہے۔"

کسی زمانے میں جنداں کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ان کے پاس روپیہ آنے لگا تو میاں بیوی نے از سرِ نو اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ پھر انہیں اس بات کا پتہ چلا کہ پالی کلکتے میں خوب روپیہ کما رہا تھا۔ اس نے خود بھی گاؤں میں واپس آتے ہی اور زمین خریدنے کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن اتنے مہینے گزر گئے۔ زمین خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ اب جنداں کے دل میں شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ بہر دست اس نے نہ تو ہامی بھری اور نہ جنداں کی بات کی تردید سی کی۔

جب ایک مرتبہ سرزوں کا ذکر چھڑ ہی گیا تو پھر سنداں سے نہ رہا گیا۔

"میں کہوں سرزی رانی ہے کہاں ...... دکھائی نہیں دی۔"

"پڑی سوتی ہو گی۔"

"کیا ابھی تک سوتی پڑی ہے۔"

"بچاری بہت کام کرتی ہے رات کو سب لوگ سو جاتے ہیں تب جا کر گھر کے کاموں سے فرصت پاتی ہے...... لو اُترتی آ رہی ہے۔"

سنداں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ تیز دھوپ میں سرزوں کی آنکھیں بھی اچھی طرح نہ کھلی تھیں۔ وہ چندھیائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی سیڑھیوں پر سے اُتر رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چندریا کا ایک سرا شانے پر تھا دوسرا پیچھے گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ نیچے کی جانب جھولتا ہوا رنگین آزار بند غالباً کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اس لئے پاؤں کے نیچے شلوار کے پائنچوں میں بار بار پھنستے تھے۔

ماں نے یہ حال دیکھا تو قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"بیٹا سو کر اٹھتی ہے تو ذرا آزار بند کس کر باندھ لیا کر جو کبھی پاؤں پائنچے میں پھنس گیا تو دھڑام سے منہ کے بل گر پڑو گی۔"

اس پر سرزوں نے بھی منہ پھلا کر کہا۔

"بے بے میں تم سے ہر روز کہتی ہوں مجھے جگا دیا کرو۔ لیکن تم مجھے نہیں جگاتیں۔ جب دھوپ چڑھ آئے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

ماں نے سنداں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہے نا لاڈو رانی! بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ تو صبح اُٹھ کر کیا کرے گی۔ جب رات کو اتنی دیر تک جاگنا پڑتا ہے تو صبح خود ہی دیر سے اُٹھے گی"

سنداں نے سرزوں کو نظروں ہی نظروں میں اپنی بہو کی حیثیت سے جانچتے ہوئے کہا۔

"عمر بھی تو ہے سونے کی ——— ہائے اس عمر کی نیند!!"

"عمر تو خیر ہوئی ...... پر عادتیں بھی تو بچوں کی سی ہیں۔ جب دیکھو ہنسے جاتی ہے......"

اتنے میں سرزوں نیچے اُتر آئی اور ہنستی ہوئی سنداں کے قریب پہنچی۔ سنداں نے اس کے گداز جسم کو بازو میں سمیٹ کر بھینچا اور پھر اس

کے رخسار دں پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ جنداں سے مخاطب ہوئی۔

دیکھو بھئی ہماری بٹیا کو کچھ مت کہا کرو۔ تمہیں کیا معلوم وہ کیوں ہنستی ہے۔ دانت دیکھو تو کیا دودھ کی طرح سفید ہیں۔"

اس پر سرتوں نے ہونٹ بھینچ بھینچ کر دانت چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ بے اختیار نمایاں ہوئے جاتے تھے۔ بالآخر بلی کی طرح سمٹ کر اس نے اپنا چہرہ سنداں کے بڑے بڑے پستانوں میں چھپا لیا۔

سرتوں کی ماں نے ماتھے پہ بل ڈال کر کہا۔

"دیکھو نہ جھینپ رہی ہے بھلا کوئی پوچھے کہ یہ شرمانے کا کونسا موقعہ ہے۔ اری تائی کے ساتھ کوئی ادھر اُدھر کی بات کر۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن سمجھ کوڑی بھر نہیں ......"

سرتوں نے بڑی کوشش کے بعد سر اُٹھایا۔ چہرے پر ابھی تک شرم کی ہلکی سی سرخی اور آنکھوں میں نمی سی تھی۔ آخر اس نے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

"تائی اب کہ دیوالی پر تو چلو گی نا امرت سر؟"

سنداں کو جیسے کوئی بھولی بسری یاد آ گئی ہو۔ فوراً جنداں کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"ہاں خوب یاد آیا ...... کیا خیال ہے جنداں۔ امرت سر چلو گی یا نہیں۔"

بھلا جنداں اپنی گرویدگی کے جذبے کے اظہار کا یہ سنہرا موقعہ ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔

"ہاں بہن چلیں گے کیوں نہیں۔ ہم سبھی چلیں گے ساتھ ساتھ ...... سرتوں کا باپو گھر پر رہے گا۔ ہم سب چلیں گے اور تم لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا۔"

"ہاں ہاں جرور چلیں گے۔ لہنے کو گھر پر چھوڑ جائیں گے۔ اب کے وہ بک جھک جرور کرے گا۔ پار سال بھی تو اسے نہیں لے گئے تھے اسے ...... پر بھئی بالی کو گھر پر کیسے چھوڑوں اس بچارے نے امرت سر کی دیوالی پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں ...... ایسے تو شہر امرت سر بھی اچھی طرح جا دہنیں ...... جب واپس آیا نہ کالے کتے سے تو بھی امرت سر بہت تھوڑی دیر رکا۔ بخت کم تھا۔ ... سہر کیسے دیکھتا۔ وہ سہر جانے کو کہتا رہا۔ میں نے نہیں جانے دیا۔ میں نے کہا بس دیوالی پہ ہی چلیں گے۔ ایک پنتھ دو کاج ...."

سرتوں نے شریر چمکیلی آنکھوں سے سنداں کی طرف دیکھا "تائی تم نے بالی کو اسی ڈر کے مارے شہر نہیں بھیجا ہو گا کہ پہلے کی طرح کہیں پھر 'کالے کتے' نہ بھاگ جائے۔"

سنداں نے پیار سے اس کے گال پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو لاڈو رانی کو اب ہم سے مجاخ بھی کرنے لگی ہے۔"

لیکن جنداں اور ہی نصیحت کرنے لگی۔

"سرتی بٹیا! بالی مت کہو اب بھیا کہا کرو اسے۔"

اس کے بعد کچھ دیر امرت سر جانے کے لئے دیگر تفصیلات پہ غور ہوتا رہا۔ پھر جنداں اُٹھ کر گھر چلی آئی۔

ایک دو روز تو بڑی زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔ سرتوں، تاباں گاؤں کی دیگر لڑکیاں اور نوجوان عورتیں گاؤں سے کچھ پرے پیپل

کی قبر کے قریب صاف پانی کے جوہڑ پر کپڑے دھونے کے لئے گئیں، سارا دن اسی جگہ گزار دیا۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کپڑے بھی صاف ہوتے رہے اور نہانا دھونا بھی ہوتا رہا۔ تاباں، رکھی، آشاں، کرتارو وغیرہ تو خاصہ تیر لیتی تھیں۔ البتہ سرنوں کو پانی سے ڈر لگتا تھا۔ اگرچہ تھوڑا بہت تیر لیتی تھی۔ لیکن آٹھ دس ہاتھ مارنے کے بعد آپ ہی آپ گھبرا جاتی۔ "میں ڈوبی ...... میں ڈوبی ......"

اس پر اس کی کوئی سہیلی اسے چڑا کر کہتی۔

"اری سرنوں ڈوبنے سے پہلے ہی کیوں چلانے لگتی ہے۔ پہلے ڈوب لیا کر پھر چلایا کر ......"

سرنوں کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آسکی کہ آخر انسان ڈوبنے کے بعد کس طرح چلا سکتا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں نے دوپٹے رنگ لئے تو چھیل چھبیلے نوجوانوں نے اپنی پگڑیاں رنگ ڈالیں۔ رنگ کے ساتھ ساتھ کلف اور ابرک کے ٹکڑوں کے باعث نئی بہار نظر آنے لگی۔

غرض دیوالی سے دو روز پہلے خوب چہل پہل نظر آنے لگی۔ آخر دیوالی کے روز لوگ ہاگ تیار ہو کر منہ اندھیرے ہی ناشتہ کر کے اسٹیشن کی طرف چل دئے۔ گاؤں کے قریب تو انہوں نے اسٹیشن بننے ہی نہ دیا تھا۔ اب کوسوں دور اسٹیشن تھا۔ مرد یا تو پیدل چلتے یا گھوڑا، اونٹ گاڑی وغیرہ استعمال کرتے۔

گاؤں کے چھوٹے سے قافلے میں چھکڑے بھی شامل تھے۔ گھوڑیاں، سانڈنیاں اور ریڑیاں وغیرہ ہر قسم کی سواریاں موجود تھیں۔ بعض من چلے پیدل ہی لپکے چلے جا رہے تھے۔

جنداں اور سنداں کے خاندان کے افراد تو پہلے ہی سے ایک ساتھ جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ انہوں نے دو چھکڑوں کا انتظام کیا تھا۔ گھر کی گھوڑیاں تھیں۔ سرنوں کا ایک بھائی گھوڑی پہ سوار تھا دوسرا چھکڑے پر بیٹھا تھا۔ اور تیسرا ریڑی پر۔ چھکڑوں کے بیل ہانکنے اور پھر اسٹیشن سے چھکڑے واپس گاؤں کو لے جانے کے لئے لہنا سنگھ اور نرنجن سنگھ اور نرنجن سنگھ کا ایک نوکر مقرر ہوئے تھے۔ چھکڑوں کی سواریوں کی تقسیم یوں کی گئی تھی کہ ایک چھکڑے پر تو بزرگ یعنی جنداں، سنداں، نرنجن سنگھ کا ایک بھائی، جنداں کی بڑی بھاوج وغیرہ سوار تھیں اور دوسرے چھکڑے پر سرنوں، تاباں، سرنوں کا بھائی کرت سنگھ، پالا سنگھ، جنداں کی چھوٹی بھاوج اور اس کی بارہ سالہ بہن اور چند بچے وغیرہ بیٹھے تھے۔ درحقیقت یہ تقسیم تاباں نے پالی کی سازش پر کی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ دھوپ ابھی تیز نہیں ہوئی تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ سردی کی آمد آمد تھی۔ سب کے دلوں ہی دیوالی دیکھنے کا چاؤ۔ سال بھر میں دو یا تین مرتبہ ہی تو گھر سے باہر نکلنا نصیب ہوتا تھا۔ اس لئے سبھی کے دلوں میں امنگوں کے دریا امڈے آتے تھے۔

دونوں چھکڑے آگے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے لیکن دونوں کی فضا میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ بزرگوں کے چھکڑے کی فضا سنجیدہ تھی۔ گو اپنے لڑکوں بالوں کو خوش دیکھ کر دل ہی دل میں وہ بھی بہت خوش تھے۔ لیکن بظاہر اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ نوجوانوں کے چھکڑے میں تو بات بے بات پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ پالی دل ہی دل میں اپنی بھابی کا بہت شکر گزار تھا۔ اسے یہ امید نہیں تھی۔ کہ کبھی ایسا موقعہ بھی آئے گا جب وہ سرنوں کے ساتھ ایک ہی چھکڑے میں سوار ہو گا۔ اور دھچکے لگنے پر ان کے گھٹنے ایک دوسرے سے بھڑ جایا کریں گے۔

راستہ کچا اور ناہموار تھا۔ دوب گھاس پر شبنم کے قطرے ابھی تک چمک رہے تھے۔ جھڑبیریاں اور مدار کے پیڑ پہلے چھکڑوں کے قریب پہنچ کر دفعتاً پرے کو بھاگتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ببول کے کانٹے دار شاخوں پر بھولی بھالی فاختائیں سراسیمی سے اس قافلے کی اڑائی ہوئی گرد کو تک رہی تھیں۔

لیکن اس وقت پالی کا دھیان ان چیزوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس وقت سرنوں کی طرف متوجہ تھا۔ تاباں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ سرنوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھے تاکہ کسی کو کچھ اور شبہ نہ ہو جائے لیکن پالی نے باتوں باتوں میں ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ کسی کو اور کوئی ہوش ہی نہ رہی تھی۔

سرنوں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پرانے فیشن کے کپڑے کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے حسن پر سب کچھ کھل رہا تھا۔ خصوصاً اس کے اودے رنگ کی اوڑھنی تو غضب ڈھا رہی تھی۔ اس سے اس کا چہرہ اور دمک اٹھا تھا۔ اوڑھنی پر لگے ہوئے ابرک کے چند باریک ٹکڑے اس کی پیشانی اور کمان سی ابروؤں میں آن پھنسے تھے جس سے اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگ گئے تھے۔

دوسروں کے دلوں کو موہ لینے والی باتیں کرنے میں تو یوں بھی پالی کو مہارت حاصل تھی لیکن آج کے روز تو بہت خوش تھا۔ اس شام کے بعد جب کہ پالی نے سرنوں کو چھیڑا تھا اسے اس سے کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔ اسے اس بات کا یقین تو آ گیا تھا کہ سرنوں اس سے خفا نہیں ہوئی تاہم چند روز تک تو وہ خود ہی اس کے روبرو جانے سے کتراتا رہا۔ اور پھر جب کبھی سامنا ہوا بھی تو کھل مل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ لیکن اب وہ چند گھنٹوں کے لئے بالکل آزاد تھے۔ بلکہ اسے یقین تھا کہ بھابی کی برکت سے امرت سر تک کھل کر بات چیت کرنے کے موقعے میسر آتے رہیں گے۔ اس لئے اس نے سفر کے آغاز ہی میں سرنوں کا دل مٹھی میں لے لینے کی مہم جاری کر دی۔

باتوں باتوں میں سادھوؤں سنتوں اور بھگتی کے قصے شروع ہو گئے۔ پالی نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ آج (بعض) سنت تو واکھی پرمیشر تک پہنچے ہوتے ہیں۔ لیکن اب تو کل یگ کا زمانہ ہے اب کئی سنت ایسے ہیں کہ مہاتما بن کر دوسروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ بس رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا۔"

تاباں اس بات پر بڑے زور سے ہنس پڑی۔ عموماً ہنسنے میں وہی پہل کرتی تھی۔ اور باقی لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے۔

پالی کی اس بات پر سرنوں کے بھائی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ پالی کی بابت اس کی رائے ہر آن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ پالی نے داڑھی میں انگلیاں پھیر کر معلوم کیا کہ کہیں اس میں کوئی تنکا وِنکا نہ پھنسا ہو اور پھر ہنس کر بولا۔

"ایک دفعے کی بات ہے کہ چوروں کے ایک ٹولے نے ایک امیر آدمی کا گھر تاڑا . . . . . "

اس پر بارہ سالہ لڑکی بولی۔

"کیا دمودر سیٹھ کا گھر تاڑا تھا؟"

"دُر" تاباں نے نرمی سے ڈانٹا "بھلا یہاں دمودر سیٹھ کا کیا مطلب . . . . " دمودر ان کے گاؤں کے سیٹھ تھے۔

"بس کوئی سیٹھ سمجھ لو . . . . . . " پالی نے کہنا شروع کیا "اچھا تو سیٹھ صاحب سادھوؤں اور سنتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب ان چوروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ ترکیب سوچی کہ سنتوں کا بھیس بنا کر سیٹھ کے گھر پہنچ جائیں۔ وہاں گیان دھیان کا پاکھنڈ رچایا جائے اور پھر موقعہ پاتے ہی ان کا سب کچھ لے کر چلتے بنیں۔"

سرنوں سمیت سب لوگ بڑے انہماک سے اس کا قصہ سُن رہے تھے۔

"بس جی انہوں نے جھٹ سنتوں کا بھیس بدلا اور 'بانگورو بانگورو' کرتے اور مالا کے منکے کھٹکاتے سیٹھ جی کے وہاں پہنچے۔ ادھر سیٹھ جی سمجھے کہ آج ان کے نصیب کھل گئے ہیں جو اتنے بڑے مہاتما ان کے ہاں آ گئے ہیں۔"

اس بات پر سرنوں کے منہ سے چھریدی آواز کے ساتھ ہنسی نکل گئی۔

پالی کے ذہن میں بچپن کی یاد تازہ ہو گئی جب اسی طرح سرنوں کے منہ سے بے اختیار ہنسی نکل جایا کرتی تھی۔

ایک طرف پالی کی کلف لگی رنگین پگڑی کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے اور دوسری جانب اس کے بڑے بڑے ہاتھ اور دائرہ چل رہے تھے اب مزے لے لے کر اس نے بتایا کہ کیسے ڈاکوؤں نے سیٹھ کو لوٹا۔ لیکن پھر پکڑے گئے۔

سب لوگ اس کہانی سے بے حد محظوظ ہوئے۔

چھوٹی لڑکی نے پوچھا۔

"اچھا تو پھر وہ صندوق دھکیل کر لے گئے ہونگے؟"

"ہاں اور کیا!"

اس طرح باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے وقت گزرتا گیا اور سفر طے ہوتا گیا۔ راستے میں ہر بستی سے چند لوگ ان کے ہمراہ چل دیتے تھے۔ چنانچہ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے یہ قافلہ کافی بڑا ہو گیا۔

آخر وہ اسٹیشن پر پہنچ ہی گئے۔ لمبے سفر اور ناہموار راستے کی وجہ سے ہچکولے کھا کھا کر عورتوں کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا تھا۔ البتہ نوجوان خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔

چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ یہاں پلیٹ فارم بھی نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ بنگلے کے قریب بجری پر ہی اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے۔ بابو کی زبانی معلوم ہوا کہ ابھی گاڑی آنے میں دیر ہے۔ ادھر لڑکوں لڑکیوں کو بھوک بھی لگ آئی تھی۔ قریب ہی ڈھلان پر دستی نل لگا ہوا تھا۔ سرنوں منہ دھونے کے لئے ادھر گئی تو پالی بھی کمنڈل اٹھا کر پانی بھرنے کے بہانے ساتھ ساتھ چل دیا۔ "تاباں کو پالی کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ لیکن اس افراتفری میں کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

سرنوں اپنے خیال میں مگن نل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پالی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ نل پر کافی بھیڑ تھی۔ بچاری سرنوں کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی۔ بچاری جونہی ہاتھ بڑھاتی کوئی اور آدمی نل کی ہتھی پکڑ بیٹھتا۔ آخر پالی نے پیچھے سے کہا۔

"لاؤ سرنوں میں ہتھی چلاتا ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

سرنوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی۔ پھر جب پالی نے سب لوگوں کو پیچھے ہٹا کر نل کا دستہ ہلانا شروع کیا۔ تو اس نے بھی پانی کے دھارے کی طرف ہاتھ بڑھا دئے۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے پانی پینے کا ارادہ کیا۔ پالی نے بہت آہستہ آہستہ دستی ہلائی تاکہ پانی کی دھار پتلی ہو جائے۔ پانی سے تر سرنوں کا چہرہ جیسے شبنم میں ڈوبا ہوا گلاب پالا سنگھ کو بہت بھلا دکھائی دیا۔ کاش وہ کبھی اسے سمیٹ کر اپنے بازوؤں میں لے سکے اور اس کے رخساروں، ہونٹوں، آنکھوں، ٹھوڑی پر پے در پے بوسے دے سکے۔

جب کبھی پالی اس طرح نظریں گاڑ کر سرنوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا دھیان پالی کی طرف نہیں تھا پانی پی کر اس نے پالی کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھا۔ وہ ہنس پڑا اور اس نے پانی کا کمنڈل اس کے ہاتھ میں دے کر چلتا کیا۔ تاکہ وہ لوگ اسے ساتھ ساتھ آتے نہ دیکھ پائیں اور پھر اپنی ٹانگوں اور ٹخنوں کی گرد دھونے لگا۔

ابھی انہوں نے پورے طور پر کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ ایک دم سگنل ڈاؤن ہو گیا "سگنل ڈاؤن ہو گیا" کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔

وہ سب جھٹ پٹ اپنی گٹھڑیاں پوٹلیاں باندھ کر تیار ہو گئے۔ بڑا سامان تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہی چھوٹی موٹی گٹھڑیاں ضرور موجود تھیں۔

بالآخر جب گاڑی نمودار ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ریل کے ڈبوں کے دروازوں کے باہر اور چھتوں پر بلکہ انجن کے آگے اور پہلوؤں پر بھی آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب امرت سر جانے والی سواریاں تھیں۔

جب گاڑی قریب پہنچی تو "جو بولے سو نہال ست سری اکال" کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

نئے چڑھنے والے حیران تھے وہ گاڑی کے اندر کیوں کر داخل ہوں۔ جنداں نے زنانہ ڈبہ تاڑ لیا۔ لیکن اس کے دروازے پر بھی مرد ایسے چپکے ہوئے تھے جیسے چھتے پر بھڑ۔ سنداں نے بھاری آواز میں ان مردوں کو کہا کہ عورتوں کے لئے راستہ تو چھوڑ دو۔ اس نے دو تین کی ٹانگیں بھی کھینچ لیں۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ اس ہڑبونگ میں پالی کو بھی ساتھ والوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ اونٹ کی طرح گردن اٹھائے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ پریشان تھا کیوں کہ گاڑی وہاں چند منٹ کے لئے ٹھہرتی تھی۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ اس کی ماں زنانہ ڈبے کی کھڑکی ہی میں دھنس رہی ہے اس کا اگلا دھڑ اندر چلا گیا تھا ٹانگیں باہر لٹک رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر گیا اور اسے اندر دھکیل دیا۔ سنداں نے اندر پہنچتے ہی گھوم کر جنداں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آ جاؤ بہن ادھر ہی سے آ جاؤ گاڑی چلنے والی ہے۔"

جنداں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہائے نیچے بھی تو ہیں!"

"تم تو آ جاؤ"

جنداں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ نیچے سے پالی نے سہارا دیا اور وہ گاڑی کے اندر پہنچ گئی۔ ڈبے کے اندر بیٹھی ہوئی عورتیں ان کے اس بے ہودہ پن پر بگڑ اٹھیں۔ سنداں نے سردست ان سے جھگڑنے کے لئے جنداں کو آگے کر دیا اور خود باقی عورتوں کو اوپر کھینچنے لگی۔ پالی اور سرتوں کے بھائی نیچے سے سہارا دے دے کر انہیں اوپر اٹھاتے رہے۔ خوش قسمتی سے سرتوں پالی کے حصے آئی۔ ریشمی سلوار میں ملبوس اس کی گداز رانوں کے لمس سے پالی کے ہاتھوں میں ناقابلِ بیان لرزش پیدا ہو گئی۔ اتنے میں گاڑی چل دی۔ خیر سب کی سب عورتیں بخیر و عافیت ڈبے کے اندر پہنچ گئی تھیں۔ سرتوں کے دونوں بھائی بھی گاڑی کے ساتھ لٹک گئے۔ پالی نے جلدی سے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اس کی پگڑی اتر گئی۔ جسے اس نے بغل میں داب رکھا تھا۔ ہر ڈبے کے آگے آدمی لٹکے ہوئے تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو پالی کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ گاڑی سے نہ رہ جائے لیکن دفعتاً اسے گارڈ کے ڈبے کے آگے خالی جگہ دکھائی دی اور وہ اچک کر اس پر سوار ہو گیا۔

اس روز کا سفر تکلیف دہ ضرور تھا لیکن چونکہ ان لوگوں کو گھر سے نکلنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا اس لئے اتنی رونق اور بھانت بھانت کی بولیوں میں انہوں نے جسمانی تکلیف کا احساس کیا ہی نہیں۔

گاڑی کا یہ حال تھا کہ باوجود اندر، باہر، چھت اور انجن پر سواریاں ہی سواریاں نظر آتی تھیں لیکن سوار ہونے والوں میں سے کم از کم ستر فی صدی ایسے لوگ تھے جنہوں نے ٹکٹ نہیں خریدے تھے۔ اُجڈ اور جوشیلے لوگوں کے دلوں میں کسی اصول اور قانون کا پاس نہ تھا۔ ارد گرد کے گاؤں کے جو لوگ اسٹیشن پر نہ پہنچ سکے تھے وہ راستے ہی میں پٹڑی کے قریب کھڑے ہو گئے تھے انہیں دیکھ کر فوراً زنجیر کھینچ کر گاڑی کھڑی کر لی جاتی تاکہ وہ بھی سوار ہو جائیں۔ گارڈ یہ معاملہ دیکھ کر الگ سر پیٹے ڈالتا تھا۔ لیکن ہجوم کے سامنے کیا چل سکتی تھی۔

اس طرح لوگ شور کرتے اور دھوم مچاتے منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔ پھاٹک پر بابو ٹکٹ وصول کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ بھلا یہاں کسی کی جیب میں ٹکٹ ہو بھی۔ بابو راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار منچلوں نے ہلکے پھلکے بابو کو اٹھا کر کندھوں پر بٹھایا اور نعرے لگاتے ہوئے آگے کو چل دیئے۔

ایک لمبے تڑنگے آدمی نے چار فٹ لمبی کرپان ہوا میں لہراتے ہوئے ہانک لگائی۔

"بو ٹکٹ بابو کی"

سب نے چلا کر کہا۔

"جے"

"بو ٹکٹ بابو کی"

"جے!!"

جب لوگوں نے دیکھا کہ ٹکٹ بابو پھاٹک پر نہیں تو وہ گرتے پڑتے اسٹیشن سے باہر اس طرح آئے جیسے نہر کا بند ٹوٹ جانے پر پانی بہہ نکلتا ہے۔ ہر طرف انسانی سروں کا ہجوم تھا۔ پگڑیاں، شملے، ڈاڑھیاں، کرپانیں، اور آوازے۔

"اوئے کاہن سنہا!"

"ایدھر اوئے ایدھر"

"وے سنگارے دسے باپو"

بچے پاؤں تلے کچلے گئے۔ ساتھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کسی کی گٹھڑی گم تو کسی کی پگڑی غائب۔ کسی نے گھونسہ مارا تو کسی نے میان سے تلوار کھینچ لی۔ اس قدر سخت بھیڑ اور ہڑبونگ میں اگر کوئی بدقسمت عورت کا رشتے داروں سے ساتھ چھوٹ گیا تو لفنگے جو ایسے موقعوں پر آتے ہی اس غرض سے ہیں انہیں کھدیڑتے ہوئے اوپر لے جاتے۔

بالی نے اس موقعہ پر نئی ترکیب سوچی۔ جتنے مرد ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر عورتوں کو اپنے حلقے کے اندر لے لیا۔ اس حالت میں بھی مارے دھکوں کے سب کا برا حال ہو گیا لیکن کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان میں سے کوئی گم نہیں ہوا۔ بھیڑ میں سے نکل کر بالی نے دوبارہ چھوٹے بڑے افراد کو ایک ایک کر کے گنا اور ہنس کر بولا۔

"اب اسی جگہ گن لو۔ اگر کوئی گم ہوا ہو تو بتاؤ اب تو ڈھونڈ بھی لیں گے یہ نہ ہو کہ بعد میں یاد آئے۔ اس بکت تلاش بہت مشکل ہو گی"

بالی نے سب کو گن کر اپنے دل کا اطمینان کر لیا تھا لیکن محض انہیں چھیڑنے کی غرض سے یہ شوشہ چھوڑ دیا۔ بچاری عورتیں گھبرائی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار سب کو گن رہی تھیں۔ ان کے ہوش بھی کچھ ایسے گم ہو رہے تھے کہ ٹھیک طور پر گنا ہی نہ جاتا تھا۔

سب لوگ تھکے ہارے سری دربار صاحب کے قریب بنی ہوئی گورو رام داس کی سرائے میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ کوئی کمرہ بھی خالی نہیں۔ بلکہ بڑے ہال میں الماری تک نہ مل سکی۔ سب لوگ برآمدے کے ایک کنارے پر ہی ڈھیر ہو گئے۔ جسم چور چور ہو رہے تھے۔ عورتوں کے سر پر نہ ٹھکانے سے دوپٹہ دھرا تھا۔ پسینے کا یہ حال تھا کہ انہیں سلواروں کے پائنچے اوپر گھٹنوں تک کھینچ کر پنڈلیوں کی نمائش کرنی پڑی۔

پالا سنگھ کمرہ نہ ملنے پر بہت جھلا رہا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے سب کو اس قدر تکلیف ہو یہ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور کسی میں تو اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ کہ اُٹھ کر گھوم پھر سکے۔ البتہ پالی ایک مرتبہ پھر منیجر کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس سے جھگڑنے لگا۔

"مینی جر صاحب!"

منیجر پہلے ہی بہت پریشان تھا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اجی مینی جر صاب! ہماری بھی سنیئے۔"

مینجر نے عینک سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی آپ بھی سنائیے کیا سنانا چاہتے ہیں۔"

پالی کو مینجر کا اندازِ گفتگو قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے غصہ پی کر کہا۔

"ہمارے ساتھ بہت سی عورتیں ہیں۔ ہمیں ضرور کمرا ملنا چاہئے۔"

مینجر چیخ اُٹھا۔

"بھائی جی عورتیں تو سبھی کے ساتھ ہیں ...... "

مینجر خاصہ اکھڑ آدمی معلوم ہوتا تھا درحقیقت وہ اس قابل نہیں تھا کہ عوام کی ایسی اہم خدمت انجام دے سکے۔

پالی دل ہی دل میں اُبالے کھا رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا لیکن قہر آلود نگاہوں سے مینجر کی طرف اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے کھا ہی جائے گا۔ مینجر بچارے کا بھی کچھ قصور نہیں تھا لیکن اس کے دل میں تحمل تو ضرور ہونا چاہئے تھا۔ اس نے چپ رہنے کی بجائے گرم ہو کر کہا۔

"اب کھڑکی کے آگے سے تو ہٹ جاؤ۔ میں کیا کروں جو تمہاری عورتیں ساتھ ہیں ...... اور یہ گھور گھور کر کیا دیکھتے ہو۔ یہ سب کہیں اور جھاڑنا۔"

پالی نے کھڑکی کی سلاخیں مضبوطی سے پکڑ لیں۔

"ذرا باہر آؤ نا"

"باہر کیا کر لو گے میرا۔"

"ذرا آؤ نا —— بتاؤں تمہیں۔"

ابھی یہ تو تو میں میں جاری تھی کہ اتنے میں سرنوں کا بھائی بھاگا بھاگا آیا۔

"پالی! پالی!! آؤ بھئی کمرا مل گیا ہے۔"

پالی حیران تھا کہ مینجر سے تو اس کا اسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے انہیں کمرا کہاں سے مل گیا ہے۔

سرنوں کا بھائی یہ بات کہہ کر فوراً واپس چل دیا۔ لمحہ بھر تو پالی جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے لپک کر اسے جا لیا۔

"کمرا کیسے مل گیا؟"

"ہمارے واکف (واقف) ہیں ایک بس انہوں نے ہی بندوبست کر دیا ہے۔"

"مینی جر کہتا ہے کوئی کمرا کھالی نہیں تم کہتے ہو کمرا مل گیا ہے۔"

"ارے بھائی ہم انہی کے ہاں ٹھہریں گے۔"

"کن کے ہاں؟"

"اب تم کیا جانو ...... تم انہیں نہیں جانتے۔ ایک ہے بڑتی پال سنگھ ... "

"وہ کپتان برتی پال سنگھ"

"ہاں ...... ان کے گھر کے لوگ بھی اسی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں ...... آج کل وہ چھٹی پہ آیا ہوا ہے نا۔ اس کی ماں بھی ہیں

جانتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ہمیں کوئی کمرا نہیں ملا تو سب کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اب تو مجا رہے گا ......"

لیکن پالی کے لئے اس میں لطف کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اسے پرتھی پال سنگھ کے نام ہی سے چڑ ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں گھر والوں کا کیا قصور تھا۔ اگر وہ ان کے لئے کمرے کا انتظام کر دیتا تو وہ کاہے کو ان کے ہاں جاتے۔ خیر اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ پالی سر جھکائے ان کے کمرے کے قریب جا پہنچا۔

کمرے کے دروازے پر ہی اسے ایک خوش پوش نوجوان دکھائی دیا۔ اس نے قرینے سے پہچان لیا کہ وہی پرتھی پال سنگھ ہے ...... کافی عرصے سے وہ اس کا نام سنتا آیا تھا۔ اب موقعہ جو ملا تو اس نے سر سے پاؤں تک اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

پرتھی پال سنگھ کا قد اسی کی طرح خوب لمبا تھا۔ جلد کا رنگ اس کی نسبت بہت صاف تھا۔ ڈاڑھی کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا رنگ خاصہ گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے حسن کی جو تعریف اس نے سنی تھی یقیناً وہ غلط نہیں تھی۔ خد و خال واقعی بہت ہی موزوں تھے آنکھیں بڑی بڑی، ہونٹ ترشے ہوئے، ڈاڑھی بیٹھی ہوئی۔ سر کے بال بہت صاف اور ملائم دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ ننگے سر کھڑا تھا۔ بندھی بندھائی پگڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ شاید ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ سکھ فوجیوں کی طرح وہ دہری پگڑی باندھا کرتا تھا۔ بندھی ہوئی پگڑی ہی سے یہ بات ظاہر تھی کہ اس کا انداز دیہاتیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس کے گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ٹویل کی سفید قمیص اور خاکی پتلون اسے بہت سجتی تھی۔

جب پرتھی پال سنگھ کا پالی سے تعارف کرایا گیا تو اس نے سر کو قدرے جنبش دی اور بڑے اخلاق سے ہنس کر مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پالی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ لمحہ بھر کو ان کی نظریں ملیں پالی کو اس کی زبردست شخصیت کا احساس تو ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے حریف کے ہاتھوں کی ہڈیاں زیادہ مضبوط نہیں اور جلد بھی نسبتاً ملائم ہے۔

کمرے کے اندر بہت سے لوگ ایسے بھی بیٹھے تھے جنہیں دیکھنے کا پالی کو پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عورتوں کی کائیں کائیں پھر شروع ہو گئی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ روشندان تھا نہیں صرف ایک کھڑکی تھی اس لئے روشنی بہت کم تھی۔ دھندلی روشنی میں بیٹھی ہوئی عورتیں دنیا کی ہر شے سے بے خبر باتوں میں مشغول تھیں۔ پالی کونے میں بچھی ہوئی ایک ٹوٹی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں سریوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس وقت وہ کمرے کے تاریک ترین کونے میں بیٹھی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہ لگ سکا کہ اس وقت اس کے چہرے کی کیفیت کیا ہے۔ یا وہ کس طرف دیکھ رہی ہے۔ پرتھی پال سنگھ ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔ ننگے سر پر اس کے مہین اور ملائم بالوں کا بڑا سا جوڑا ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ واقعی وہ نہ صرف حسین تھا بلکہ اس کی صورت سے بھی افسرانہ شان ٹپکتی تھی۔ پالی مرعوب نہ ہوا تھا۔ فوجی وردیوں کا اس کے دل پر کوئی رعب طاری نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے پرتھی پال سنگھ نے دروازے سے گزرنے والے چند مردوں اور عورتوں سے بات چیت کی۔ اس کا ایک خاص انداز سے سر ایک طرف کو جھکانا، اس کا بٹے ہوئے لبوں سے آنکھیں جھپکانا، مدھم آواز میں میٹھی میٹھی باتیں کرنا، گاہے بگاہے ملائم سی ہنسی ہنسنا، دیکھنے والے کو یہ سب کچھ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا لیکن پالا سنگھ گردن اکڑائے قدرے رعونت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اس کی ہر حرکت میں بناوٹ اور مسکراہٹ میں زہر گھلا دکھائی دیتا تھا۔ نہ معلوم اس کا اندازہ درست تھا یا محض اپنا خیالی حریف بنا لینے کے باعث وہ اس سے بدظن ہو گیا تھا۔

پرتھی پال سنگھ دروازے سے ہٹ کر کمرے کے اندر چلا آیا۔ جنداں نے اسے قریب کی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بیٹا پرتھی پال! تم کب آئے"

"جی بس تین چار دن ہی ہوئے ہیں"

"ابھی رہو گے نا یہاں پہ"۔

"جی ہاں دو چار دن رہوں گا، پھر واپس چلا جاؤں گا۔ دس دن کی چھٹی پر آیا تھا سوچا چلو سری امرتسر کی دیوالی ہی دیکھتے چلیں۔۔۔۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ اصلی دیوالی کل رات منائی جائے گی۔ اب پچھتا رہا ہوں کہ مفت میں ایک روز پہلے چلا آیا۔ پربے بے نے گھر پر مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"کیا حرج ہے بیٹا! کل کا دن گھوم پھر کر دربار صاحب کے درشن کرنا۔ روز روز کون آتا ہے۔ اچھا ہے اسی طرح کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے سے رونق میلہ ہو جاتا ہے۔"

"جی" یہ کہہ کر پرتھی پال سنگھ نے سر جھکا لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جنداں اس سے بات چیت جاری رکھنا چاہتی تھی۔ اور کچھ نہیں سوجھا تو کہنے لگی۔

"نہیں اتنے دن ہو گئے آئے ہوئے کو۔ بھلا ہم سے کیوں نہ ملے۔ بہن تم نے ہی بھیج دیا ہوتا بیٹے کو۔"

"شرماتا ہے۔ میں تو ہمیشہ کہتی رہتی ہوں کہ کم از کم پیار محبت والی جگہ تو آیا جایا کر۔" پرتھی کی ماں نے جواب دیا۔

پالی کو ان سب باتوں سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ باقی لوگ تو ان سے ملاقات ہو جانے پر خوش تھے کہ سر چھپانے کو کمرہ تو مل گیا۔ لیکن پالی سخت مایوس ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کی دانست میں تو رنگ میں بھنگ پڑ چکی تھی۔

شام ہو گئی۔ پھر رفتہ رفتہ تاریکی بڑھنے لگی۔ سب نے گورو کے لنگر کی روٹیاں کھائیں۔ پھر کمرے میں آکر بات چیت ہونے لگی۔ معاً جنداں نے سر اٹھا کر کہا۔

"بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تم بڑے بوڑھوں کی طرح کمرے کے اندر بیکار کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ دربار صاحب میں متھا ٹیک آؤ۔ اکال تخت میں شستر (ہتھیار) دکھائے جائیں گے۔ جاؤ انہیں دیکھو۔۔۔۔ بھئی ہمارا کیا ہے۔ ہم تو ٹھہرے بوڑھے۔ تھک گئے ہیں اب کل ہی درشن بھی کریں گے اور ماتھا بھی ٹیک آئیں گے ہاں اور کیا کریں۔"

چنانچہ تاباں، سرون، جنداں کی بھاوجیں، پرتھی پال سنگھ اور اس کی بھابی اور پالی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ راستے میں پرتھی پال سنگھ سرون کے بھائیوں اور پالی سے اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ دراصل وہ ان سے بہت ہی مختلف تھا۔ اس لئے آپس کی گفتگو تکلف کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔

موقعہ پا کر پالی نے اپنی بھابی کے کان میں چپکے سے کہہ بھی دیا۔

"بھابی یہ کمبخت نہ معلوم کہاں سے ٹپک پڑا۔ دیکھو تو بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔۔۔۔"

تاباں نے ہاتھ جھٹکا کر جواب دیا۔

"صبر تو کرو۔ یونہی آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو۔"

پالی کی توقع کے خلاف تاباں نے بھی خشک سا جواب دیا۔ اس پر وہ کچھ مغموم ہو گیا۔

وہ لوگ سرائے سے ہی ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے کسی مقرر کی تقریر یا راگیوں کے جتھے کا کیرتن سن رہے تھے اور وہ سرسری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ متبرک تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔

تالاب کے بیچوں بیچ سنہرے رنگ کی عمارت تھی اس روز بھی تھوڑی بہت روشنی کی گئی تھی۔ وہ سنہری عمارت جسے ہرمندر صاحب یا دربار صاحب کہتے تھے سونے کی ڈلی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پالی کے سوا سب لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے تالاب کے کنارے کنارے

چلنے لگے۔ پالی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ سب کے بڑھتے ہوئے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرتھی پال سنگھ کے پاؤں اس کی نسبت زیادہ اُجلے تھے۔ چھوٹے تھے اور ان کی انگلیوں کے ناخن بڑی صفائی سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے اپنے پاؤں اور سرلوں کے پاؤں میں کوئی مشترکہ بات نہیں تھی البتہ پرتھی پال اور سرلوں کے پاؤں میں مشابہت ضرور تھی۔

بالا سنگھ کی طبیعت واقعی بہت بدمزہ ہوگئی تھی۔ اگر وہ اکیلے ہوتے تو کس قدر لطف رہتا۔ اس وقت وہی محفل پر چھایا ہوتا جیسا کہ گاؤں سے لے کر اسٹیشن تک محض اس کی شخصیت سب کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ لیکن اب پرتھی پال سنگھ کے سامنے وہ آپ ہی آپ اپنی نظروں سے گرا جا رہا تھا۔ پرتھی پال کا لباس، اس کا چلنے کا انداز، گفتگو کرنے کا لہجہ، اور آواز کی نرمی یعنی ہر چیز قطعاً اس کے برعکس تھی۔ .... نمدلے فرش پر پھولوں کی پنکھڑیوں کو پاؤں تلے کچلتے ہوئے وہ دربار صاحب کے اندر جانے والے پُل پر ہو لئے۔

پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ سارے گروہ میں صرف ایک شخص کی طبیعت بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بڑے غور سے ایک نظر پالی پر ڈالی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اصل دیہاتی، اجڈ، اڑیل اور مسکوک چال چلن کا نوجوان ہے۔ اس کے باوجود پرتھی پال سنگھ نے بڑے اخلاق اور اخلاص سے ہنس کر شیریں اور نرم لہجے میں پوچھا: "آپ تو بالکل خاموش ہیں؟"

پرتھی پال کے الفاظ میں بُرا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی پالی کو بہت سخت غصہ آیا۔ وہ اپنے غصے کو چھپا بھی نہ سکا۔ نہ اس نے چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے سوال کے جواب میں اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اور وہ زیرِ لب محض کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

لیکن پرتھی پال نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ وہ اپنی معصوم اور دلفریب ہنسی ہنس کر دوسری طرف متوجہ ہوگیا۔

دربار صاحب کے اندر پہنچ کر سب نے گرو گرنتھ صاحب کے روبرو بڑی عقیدت سے متھا ٹیکا۔ لیکن پالی اس وقت پر ماتما سے بھی بگڑا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے سر جھکایا ضرور لیکن پیشانی فرش پر لگنے سے پہلے ہی سر اُوپر اُٹھا لیا۔

دربار صاحب کے اندر کسی قسم کا شور نہیں تھا۔ گرنتھ صاحب کے اوپر پڑے ہوئے رنگین ریشمی رومال تھے، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، پیسوں کی ہلکی ہلکی جھنکار اور راگی جتھے کی مترنم لے گونج رہی تھی۔ پرتھی پال نے ہنس کر ساتھیوں سے کہا۔

"گرو کے گھر میں بھی کیا سکون اور امن ہے۔ ہر طرف آنند ہی آنند ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں گرو کے چرنوں میں پڑا رہے آدمی۔"

اس کی شیریں آواز سننے والوں کے کانوں میں شہد گھولتی رہی۔

"اچھا آئیے اب شستر دیکھنے چلیں۔"

اکال تخت پہنچ کر وہ بھیڑ میں گھس گئے۔ یہاں سکھ گروؤں اور بندگوں کے ہتھیاروں کی نمائش کی جاتی تھی۔ پالی کھسک کر گروہ سے علٰحدہ ہوا اور ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

آخر ہتھیاروں کی نمائش شروع ہوئی۔ ایک لمبا چوڑا سکھ جس کی لہراتی ہوئی سیاہ ڈاڑھی اس کی ناف تک پہنچتی تھی۔ زمین سے بالشت بھر اُونچے تخت پوش پر کھڑا ہوگیا۔ ایک شخص کوئی ہتھیار جھاڑن سے پونچھ کر اس کی طرف بڑھاتا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر کہتا۔

"یہ سری صاحب (تلوار) سری گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کی ہے"

"یہ اٹھارہ سیر کا کھنڈا سری گرو ہرگوبند صاحب جی مہاراج کا ہے"

"یہ تیر چھبیس تولہ سری گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کے ہیں۔ دیکھئے اس کے پچھلے کونے پر سونا لگا ہوا ہے۔ یہ اس لئے لگایا گیا تھا۔

کہ جو شخص سنسور کے تیر کا نشانہ نہ بنے اس سونے کی قیمت سے اس کے کفن دفن کا انتظام ہو سکے "؟

" یہ سری صاحب سرانا گردہ ...."

پالی ایک گوشے میں کھڑا اپنے گردہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس کی بھابی 'سرنوں' اس کے بھائی' پرتھی پال سنگھ و دیگر مرد اور عورتیں کھڑی تھیں۔ سرنوں اب بھی حسب عادت لمبا لمبا کر ہنس رہی تھی۔ وہ دونوں قریب قریب کھڑے تھے۔ پالی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور وہ خود محض ایک فالتو شخص ہو۔ پرتھی پال سر جھکا کر دلفریب انداز میں مسکراتے ہوئے نہ معلوم کیا کہتا کہ سننے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ وہ سب اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسے "لیفٹین" سمجھتے تھے۔

رات کو جب سب لوگ سونے کے لئے عظیم الشان سرائے کی چھت پر پہنچے تو بمشکل عورتوں کے لئے چارپائیوں کا انتظام ہو سکا اور اب سارا انتظام بھی پرتھی پال کے سپرد کر دیا گیا۔ مردوں کو چارپائیاں نہیں ملیں اس کے باوجود عورتیں آپس میں کہہ رہی تھیں "بھلا ہو پرتھی پال کا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو بھلا ایسی بھیڑ میں ہمیں چارپائی ہی نہ ملتی تھی"۔

"بہن اسے سب مانتے ہیں نا۔ نہ جانے سکتر کے پاس جا کر گری ہیں کیا گٹ پٹ کی کہ اس نے جھٹ چارپائیاں دے دیں"۔

"لیفٹین ہے نا لیفٹین!"

پالی یہ باتیں سُن سُن کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً پرتھی پال کا ٹینٹوا جا دبوچے اور ٹبر کی طرح اس کی گردن مروڑ ڈالے۔

پرتھی پال کے خاندان کے افراد کی چارپائیاں پرے کونے پر بچھی تھیں۔ خود پرتھی پال نے اپنے لئے بھی ایک بڑی سی چارپائی کا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ اپنے اُجلے بستر پر بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔ سرنوں کے خاندان کا رجوع بھی انہی کی طرف تھا۔ اس طرف اس کی ماں اور بھابی کی چارپائیاں تھیں۔ بھابی کے بستر پر اس وقت دو بچے سوئے پڑے تھے۔ ابھی سب لوگ پرتھی پال کے گھر والوں سے بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔ پالی نے سب سے الگ چھت کے سرے پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر اپنی میلی چادر بچھائی تھی۔ تکیئے کا اس نے کبھی استعمال ہی نہ کیا تھا۔ بہت ہوا تو سر کے نیچے بازو رکھ لیا۔ اس کے کانوں میں سب کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور وہ ستاروں کی مدھم روشنی میں چھت پر قدم قدم پر بچھے ہوئے بستروں پر بیٹھی یا لیٹی عورتوں' مردوں اور بچوں کو بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا۔

صبح ہوئی تو موقعہ پا کر اس نے بھابی سے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ پہلے تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ لیکن پالی نے جب زور دے کر کہا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ تو تاباں نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے خود پرتھی پال سنگھ پسند تھا۔ پسند سے مراد یہ نہیں کہ اسے اس سے محبت تھی بلکہ وہ اس کی شخصیت سے بھی بہت متاثر نظر آتی تھی اور اسے وہ بہت نیک نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اسے پالی کی اس بات پر یقین نہ آیا کہ پرتھی پال کو سرنوں سے محبت ہو گئی ہے۔ یا وہ اسے پھسلانا چاہتا ہے اس نے پالی کو سمجھانے کے لئے کہا۔

" پالی تم یونہی جلتے ہو اس سے۔ وہ تو ہمیں ہنس مکھ، سب سے ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ تم نے اس کا کچھ اور ہی مطلب نکال لیا ہے"۔

پالی کے دل کا شبہ نہ گیا۔ تو تاباں نے ہنس کر کہا۔ " اچھا تو آج رات تال (تالاب) کے کنارے بیٹھنا میں اسے تمہارے پاس لے آؤں گی۔ اگر ہو سکا تو میں تھوڑی دیر کے لئے اسے تمہارے پاس اکیلی بھی چھوڑ دوں گی"!

رات ہوئی تو سری دربار صاحب کی دیواروں اور چھت پہ بجلی کے بے شمار ننھے ننھے قمقمے جگمگانے لگے۔ سنہرے در و دیوار روشنی کی جگمگاہٹ

سے ساری عمارت دہکتے ہوئے انگارے کے مانند دکھائی دیتی تھی۔

بھابی سے مشورہ کر کے وہ تالاب کے کنارے ایک خاص مقام پر جا بیٹھا۔ اور سرتوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ایک پل ایک برس سے کم نہیں تھا۔ پالی جانتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ اگر دھوکے سے آبھی گئی۔ تو اسے دور ہی سے دیکھ کر واپس لوٹ جائے گی۔

لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ سرتوں اس کی بھابی کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس نے اسے دور ہی سے دیکھ بھی لیا لیکن وہ بھاگی نہیں۔ قریب پہنچتے ہی تاباں نے آنچل لہرا کر کہا۔

"لو بھئی لے آئی ہوں تمہاری سرتوں کو۔ . . . ."

بھابی کی صاف گوئی پر پالی کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بھابی کے قول کی تردید کرنے ہی کو تھا کہ وہ بول اٹھی۔

"لو سرتوں! اب پوچھ لو۔ کہتا تھا سرتوں مجھ سے خفا ہے ٹھیک طرح بولتی نہیں۔ میں بھی نہیں بولوں گا۔ . . . ."

یہ کہتے کہتے وہ دھڑام سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی سرتوں کو بھی بٹھا لیا۔ سرتوں بچاری نہ صرف شرمائی ہوئی تھی بلکہ وہ کچھ خوفزدہ بھی تھی۔ آنچل کا کونا مروڑتے ہوئے اس نے دبی دبی نظروں سے پالی کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ پھڑکے۔

"پالی . . . . . . بھیا تم سے خفا تو نہیں ہوں۔ تم یونہی خفا ہو گئے ہو . . . . ."

"اے لو . . . . ." تاباں نے ایک جانب دیکھ کر اس انداز سے کہا جیسے اُس نے کسی سہیلی کو دیکھ لیا ہو "بھئی میں ابھی آئی" یہ کہہ کر وہ ترچھپت ہوئی۔ پالی بچارا خود گھبرا رہا تھا۔ وہ ان حالات کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کچھ کہا۔ پھر سرچہار جانب پھیلے ہوئے غبارِ نور میں سرتوں کی خوابناک آنکھوں کو چپ چاپ دیکھنے لگا۔

سرتوں کو یہ معلوم ہوتے ہی کہ پالی اس سے خفا نہیں بڑی خوشی حاصل ہوئی اور وہ پھر وہی سرتوں تھی اور وہی اس کی بے اختیار ہنسی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

دفعتاً پالی نے سنجیدہ بن کر کہا۔

"سرتوں تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تمہاری کوئی نشانی میرے پاس ہونی چاہیئے اور میری کوئی نشانی تمہارے پاس۔ . . . ."

اس پر سرتوں خاموش ہو گئی۔ تاباں واپس چلی آ رہی تھی۔ سرتوں چاہتی تو اس کا کچھ نہ کچھ جواب دے سکتی لیکن اس نے جواب میں غیر معمولی تاخیر کر دی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھی گپ ہانکتی رہی۔ پھر جب وہ اُٹھ کر چلی گئیں تو پالی کے دل پر امید و بیم کی کیفیت طاری ہو گئی۔

ہر ہنگامے سے پرے اس کا ذہن بے کراں خلا میں کھو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے تالاب کا پانی تھا جو اس وقت سیاہی مائل رنگ کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی تہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سطح پُر سکون تھی۔ کبھی کبھی ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ کوئی بھولی بھٹکی لہر روشنی کی جھلملاہٹ اپنے کندھوں پہ اُٹھائے لے آتی۔ اور آنکھ جھپکتے میں گم ہو جاتی۔ . . . . . پھر وہی سکون سطح اور ناقابلِ پیمائش گہرائیاں۔

پالی کو اپنی دُھن میں اسے ارد گرد کا کچھ ہوش نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسے ایک سیوادار نے کندھے سے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔

اُس نے دیکھا چند آدمی شبد گاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں وہ گویا چوبیس گھنٹے کی بانی کا ماحصل لیکر سر مندر صاحب سے نکلے تھے اور تالاب کا چکر لگا رہے تھے ان کے آگے آگے اکہرے بدن کا سکھ اپنی کراری آواز میں "سوادھان (خبردار) سوادھان ——— کہتا چلا آ رہا تھا۔"

جب اس گروہ کے لوگوں نے ادب سے سر خم کیا اور اُن گورسکھوں کے آگے دودھ کے پیالے رکھے تو پالی اُن کی طرف دھیان دیئے بغیر ٹہلتا ہوا چلے نکل گیا۔

ادارۂ تجہیز و تکفین

شوکت تھانوی

مولوی دیدار علی ہیں اور ان کی دختر نیک اختر میں اگر داڑھی کا نمایاں فرق نہ ہوتا تو وہی مضمون ہوتا کہ ان کو چھپاؤ اور ان کو نکالو یا اُن کو چھپاؤ اور ان کو نکالو۔ وہی دونوں کے سرمہ آلود بیل جیسے دیدے، وہی دونوں کا بھرا بھرا سا کسرتی جسم، وہی دونوں کا بارعب چہرہ، وہی دونوں کا پکا رنگ اور وہی دونوں کی زمزمہ آفریں گرجدار آواز۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بیٹیاں جو باپ کی ہم صورت ہوں اور بدقسمت والے ہوتے ہیں وہ بیٹے جن میں ماں کی شبیہ آجائے۔ چنانچہ یہ صاحبزادی تو اپنے باپ کی ایسی نقل مطابق اصل تھیں کہ ان کی خوش نصیبی میں تو کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا اگر مولوی دیدار علی اس قدر تفصیل سے داڑھی نہ رکھ لیتے تو بیٹی کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جایا کرتے کہ آئینہ دیکھ رہے ہیں۔ مولوی دیدار علی صاحب کہا کرتے تھے کہ میں نے اس لڑکی کو ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے اور یہ صاحبزادی بھی ان کو اپنا والدین ہی سمجھتی تھیں اس لئے کہ ہوش کی آنکھیں کھول کر بس ان ہی کو دیکھا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے تعلیم و تربیت کی پوری توجہ کا مرکز صرف ان ہی کو بنایا تھا اور جو کچھ خود پڑھے ہوئے تھے وہ سب کچھ بیٹی کو پڑھا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ جب خود میلاد شریف پڑھنے کہیں تشریف لے جاتے تھے تو زنانہ محافلِ میلاد کے لئے بیٹی کے واسطے بھی انتظام کر لیتے تھے اس کے علاوہ اس اعتبار سے ان مخدومہ کا دم بڑا غنیمت تھا کہ محلّہ پڑوس میں اگر کوئی زنانہ میت ہو جاتی تو غسلِ میت اور کفنانے وغیرہ کے فن سے صرف یہی ایک تھیں جو واقف تھیں چنانچہ ان ہی کو زحمت دی جاتی تھی۔

مولوی دیدار علی صاحب اور ان کی صاحبزادی سے تو آپ تعارف حاصل کر چکے اب میں چاہتا ہوں کہ خود اپنا تعارف بھی کرا دوں۔

یوں تو خیر آپ مجھ سے واقف ہی ہوں گے مگر اپنی ایک کمزوری آج ذرا صفائی سے عرض کرنا ہے کہ موت اور اس کے متعلقات سے میری جان ہی تو جاتی ہے۔ مثلاً میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں کسی جنازے کے پاس خواہ وہ اپنے والدِ محترم ہی کا کیوں نہ ہو رات بھر بیٹھا رہوں۔ دس پانچ آدمی اور بھی ہوں تو خیر کوئی بات نہیں میں سب کے پیچھے دل پر جبر کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ کافور کی خوشبو سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کورے لٹھے سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ جنازے کو کندھا دینے سے جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے کو بچاتا ہوں اور نمازِ جنازہ میں آج تک کبھی کسی نے صفِ اوّل میں مجھ کو نہ دیکھا ہوگا۔ ان سب سے بڑھ کر وہ جو ایک رسم ہے "آخری دیدار" کی اس سے تو بس خدا ہی محفوظ رکھے۔ معلوم نہیں اس سلسلے میں کیوں زبردستی کی جاتی ہے کہ دفنانے سے پہلے میت کے چہرے پر سے کفن ہٹا کر کہا جاتا ہے کہ لو دیکھ لو آخری مرتبہ۔ میں ننانوے فی صدی اس موقع پر تو ٹل جایا کرتا ہوں یا اگر پکڑا ہی گیا تو شدتِ گریہ کے باعث منہ اور آنکھوں پر رومال رکھے ہوئے اس طرح گذر جاتا ہوں کہ مجھے کچھ نظر نہ آئے اور اگر ایک آدھ مرتبہ کچھ نظر آگیا ہے تو بس وہ مہینوں اس طرح نظر آتا رہا ہے کہ رات کو سونے کے لئے لیٹے آنکھیں بند کیں اور وہ صنتی چہرہ

نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اب اس بُری طرح سوتے میں اچھل کر جاگوں گا کہ جسم پسینہ میں شرابور ہوگا، دل بلیوں اچھل رہا ہوگا اور آیۃ الکرسی پڑھنے کی کوشش میں دعائے گنج العرش پڑھ جاؤں گا۔

ہزار مرتبہ اپنی اس حرکت بیجا پہ اپنے کو لعنت ملامت کر چکا ہوں کہ یہ سخت بیہودگی ہے آخر ایک دن تمہیں بھی مرنا ہے۔ اسی کافور اور اسی کورے لٹھے سے واسطہ پڑے گا مگر اس تصور کو بس یہیں تک پہنچا کر اپنا خیال ہٹانے اور اپنا دل بہلانے کی کوششیں شروع کر دیتا ہوں جانتا ہوں کہ یہ بیہودگی نہایت قابلِ نفرت ہے مگر اپنی اس کمزوری کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ زندوں سے نہیں ڈرتا مُردوں سے ڈرتا ہوں بلکہ آج میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مولوی دیدار علی نے شاید اس کو محسوس نہ کیا ہو مگر میں نے آج تک کبھی ان سے ہاتھ نہیں ملایا۔ عید بقر عید آئے محض اس لئے بھاگا بھاگا پھرتا ہوں کہ کہیں وہ عید ملنا نہ شروع کر دیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو غسلِ میّت کا کچھ بے حد شوق ہے۔ بس ان کو خبر ہو جائے کہ کوئی کہیں مر گیا ہے وہ رومال کندھے پر ڈالیں گے، اپنا ڈنڈا سنبھالیں گے اور وہاں پہنچتے ہی ایک السلام علیکم رسید کرتے ہی پوچھیں گے کہ "تجہیز و تکفین کا کیا بندوبست ہوا" اور اس کے بعد ہی میّت کا چارج لے کر اپنا شوق پورا کرنا شروع کر دیں گے۔ شروع شروع میں تو خیر یہ شوق رہا اس کے بعد لوگوں کے کہنے سننے سے آپ نے باقاعدہ اپنے در دولت پر ایک سائن بورڈ لگا لیا :

ادارۂ تجہیز و تکفین

غسلِ میّت، نمازِ جنازہ اور کفن دفن کے تمام انتظامات ہم سے کرایئے

چنانچہ اب، ان کا یہ کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی پر ہے اور اسی کاروبار میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی ہے کہ مولوی صاحب ماشاءاللہ کئی مکانات بنوا چکے ہیں صاحبزادی کے لئے سر سے پیر تک کے سونے کے زیور موجود ہیں۔ جہیز میں اعلیٰ درجہ کے فرنیچر سے لے کر چاندی کے کئی برتن ہیں۔ اس جہیز اور اس سامان کے علاوہ مولوی صاحب کے پاس جو کچھ ہے وہ آخر ان کی واحد اولاد یعنی ان ہی صاحبزادی کا تو ہے مثلاً ایک تو دیہی لاش لے جانے والی لاری ہے جو حال ہی میں مولوی صاحب نے خریدی ہے۔ پھر یہ لٹھے کے سیکڑوں تھان بھرے ہوتے ہیں۔ کافور اور گلاب وغیرہ سے ایک کمرہ بھرا ہوا ہے۔ ایک باقاعدہ بڑھئی خانہ ہے جس میں دن رات تابوت بنا کرتے ہیں اور قبر میں دینے کے پٹرے تیار ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں سنگ سازی کا شعبہ بھی کھولا ہے تاکہ ہر قسم کے لوح مزار حسبِ فرمائش بکفایت تیار ہو سکیں۔ ایک شاعر باقاعدہ ملازم ہے جو سال شروع ہوتے ہی سیکڑوں قطعات تاریخ وفات تیار کر لیتا ہے بس اس میں متوفی کا نام موزوں کرنا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بیس بائیس قرآن خوان ملازم ہیں تاکہ گاہکوں کو اس دقت سے بچایا جا سکے کہ سویم میں قرآن خوانی کا کیا بندوبست ہوگا۔ بس مولوی دیدار علی صاحب کے ادارۂ تجہیز و تکفین کو اطلاع دے دینا کافی ہے اس کے بعد تمام انتظامات یہ ادارہ خود ہی کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب کے اس کاروبار میں چشم بد دور وہ ترقی ہوئی ہے کہ اب وہ لاکھوں کے آدمی تو ہو ہی گئے ہیں اور اس کاروبار میں ان کی صاحبزادی زنانہ شعبہ اس طرح گویا سے سنبھالے ہوئے ہیں کہ دراصل مولوی صاحب کی دستِ راست وہی ہیں۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں کہ یہ مولوی دیدار علی صاحب میرے کچھ ننھیالی رشتہ دار بھی ہیں۔ خیر پہلے تو اس رشتہ کو کوئی خاطر میں بھی نہ لاتا تھا مگر جب سے مولوی صاحب دولتمند ہوئے ہیں ان کو نہایت ادب سے کوئی بھائی صاحب کہتا ہے کوئی خالو جان کہتا ہے اور کوئی کچھ، حد یہ ہے کہ میں بھی اب مولوی صاحب نہیں بلکہ ماموں جان قبلہ کہنے پر مجبور کیا جاتا ہوں۔ خیر یہ بھی گوارا تھا بشرطیکہ وہ صرف ماموں جان قبلہ ہی رہتے مگر اب تو مجھ کو زندہ درگور کرنے کے یہ انتظامات در پیش ہیں کہ میں ان کی ان ہی خوفناک صاحبزادی کو اپنا شریکِ حیات بنا کر اپنے کو

جیتے جی داخل لحد سمجھوں۔ جب سے میں نے اس تجویز کا ذکر سنا ہے میرے تصور میں کوہ الم کھڑا رہا کرتا ہے اور میری دنیائے تخیل کافور سے بسی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھے زبردستی غسالوں کے حوالے کیا جا رہا ہو کہ آخر اس کی موت کا کہاں تک انتظار کیا جائے اگر یہ نہیں مرتا تو نہ مرے تم تو اپنے فرائض سے سبکدوش ہو ہی جائیں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجئے خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر فرمائیے کہ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کو سسرال کے بہانے قبرستان بھیجا جا رہا ہے تو آپ کا کیا حال ہو گا۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ملک الموت کی فرزندی میں مجھ کو دیا جا رہا ہے اور خود موت کو میرا شریک حیات بنایا جا رہا ہے۔ خون میرا خشک ہو کر رہ گیا بھوک پیاس نے میری جواب دے دیا۔ نیند کس کافر کو آتی ہو اور اگر کبھی آنکھ جھپک گئی تو یہی دیکھا کہ مولوی دیدار علی اپنی لاش لے جانے والی لاری میرے لئے لائے ہیں اور لیٹے میں باندھ کر مجھ کو لے جانا چاہتے ہیں۔ آخر میں نے رو رو کر امی جان سے فریاد کی مگر وہ ایسی سنگدل کہ میرے اس رونے پر ہنسنا شروع کر دیا کہ پاگل ہو گیا ہے تو لکھ پتی سسرال مل رہی ہے، سارے دلدر دھل رہے ہیں اور صاحبزادے کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ ابا جان کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی سخت حیران ہوئے کہ اگر یہ سسرال بھی ان برخوردار کو پسند نہیں ہے تو گویا یہ دماغ کی خرابی کی انتہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ میں یہ رونا اپنے ایک ایک عزیز کے سامنے رویا کہ شاید کسی کو مجھ پر ترس آ جائے اور اس جوان مرگی سے کوئی مجھ کو بچا لے۔ آخر ایک دن گھر جو آیا تو والد صاحب آگ بگولہ بیٹھے تھے۔ والدہ صاحبہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں اور یہ دونوں فیصلہ کر چکے تھے کہ بس مجھ کو عاق کر ہی دیا جائے۔ تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جن عزیزوں کے سامنے میں یہ رونا رویا تھا ان ہی میں سے ایک نے مولوی دیدار علی صاحب سے جا کر یہ بات کہہ دی کہ لڑکا اس رشتہ کو سخت ناپسند کرتا ہے اور لڑکی زبردستی اس کے سر تھوپی جا رہی ہے۔ ان صاحب نے دراصل یہ بات وہاں اس لئے پہنچائی تھی کہ وہ خود اس متمول موت کے خریدار تھے اور شوقِ شہادت میں مرے جا رہے تھے چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور مولوی دیدار علی نے ہمارے یہاں سب کچھ لکھ بھیجا کہ چونکہ یہ نسبت ان برخوردار کو پسند نہیں ہے لہذا زبردستی یہ عقد کرنا نہ میرے لئے مناسب ہو گا نہ آپ لوگوں کے لئے چنانچہ میں نے آپ کے صاحبزادے کے بجائے عزیزی اکرام میاں کو اپنی دامادی کے لئے منتخب کر لیا ہے اور کل ان کا عقد نہایت سادگی سے کر رہا ہوں۔ میں تو یہ سنتے ہی سجدۂ شکر میں گر پڑا اور ادھر والدِ محترم کی گرجدار آواز اور والدہ محترمہ کی سبکیوں اور سسکیوں کا سلسلہ خدا جانے کب تک جاری رہا۔

اگر سچ پوچھئے تو اکرام میرا سب سے بڑا محسن تھا اس زمانے میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں جو کسی کی آئی اپنے سر لے لیں۔ یہ احسان فراموشی ہوتی میری اگر میں اکرام کے پاس جا کر اس کے تلووں سے اپنی آنکھیں نہ رگڑتا۔ مگر اکرام کو پاؤں کہاں، اس کا زیادہ وقت مولوی دیدار علی کی بیٹھک میں گذر رہا تھا اور وہ اپنے عقد کے انتظامات میں مصروف تھا چنانچہ وہ عقد سے پہلے کسی طرح مل ہی نہ سکا اور عقد کے بعد تو عجب صورت یہ پیش آئی کہ میں اس کے گھر گیا۔ اس کو میں نے خود دیکھا کہ وہ موجود ہے اور مجھ کو دیکھ کر گھر کے اندر گیا ہے مگر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گھر میں ہے ہی نہیں۔ ممکن ہے مولوی دیدار علی کی فرزندی میں جا کر اس میں یہ آسیبی وصف پیدا ہو گیا ہو کہ ع ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

دوسری مرتبہ میں نے اس کو بازار میں دیکھا اور اس کو آواز دے کر جیسے ہی بڑھا اس کی طرف وہ بھاگا سر پر پیر رکھ کر۔ میں نے کئی گلیوں میں اس کا تعاقب کیا مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ پھر ایک دن اس کے گھر جا کر اس کے والد سے دریافت کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور وہ خبر لی ہے میری کہ میں حیران ہی رہ گیا۔ کہنے لگے کہ اب جلے پھپھولے پھوڑنے آئے ہو۔ اس نے تمہاری منگیتر تم سے نہیں چھینی بلکہ خود مولوی دیدار علی صاحب نے اپنی دامادی کے لئے تم سے زیادہ مناسب اس کو سمجھا۔ تم کو اگر انتقام لینا ہے تو مولوی صاحب سے لو اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اور اس کو کیوں گھیر رہے ہو۔ اگر تم اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئے اور یہ غنڈہ گردی جاری رکھی تو مجبوراً مجھے پولیس میں اطلاع کرنا پڑے گی۔ اب میں نے ان کو لاکھ سمجھایا کہ میں تو دراصل

اکرام کو اپنا محسن اپنا سچا بہی خواہ اور اپنا قابلِ پرستش ہمدرد سمجھتا ہوں مگر یہ بات نہ ان کی سمجھ میں آسکتی تھی نہ میں دراصل ان کو سمجھا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ خود اکرام نے ان کو یہ بتایا تھا کہ میں مسلسل اس کی تلاش میں ہوں۔ راستہ گلی میں اس کو گھیرتا ہوں چنانچہ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس دن جب وہ گھر میں جاتا نظر آیا اور پھر یہ اطلاع آئی کہ وہ گھر میں نہیں ہے اس کی وجہ کیا تھی اور دوسرے دن جب وہ بازار میں ملا ہے اور میرے پکارنے پر بھاگا ہے اس کا سبب کیا تھا۔ بہرحال ان بڑے میاں کو تو میں کیا سمجھاتا البتہ اکرام سے اب میرا ملنا اور مل کر یہ غلط فہمی دور کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا تھا چنانچہ میں اس کی تلاش میں اور اس سے زیادہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔

ادھر مولوی دیدار علی کے خط سے والد صاحب کو بھی اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس ناکامی کے بعد میں اکرام کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں اور مولوی دیدار علی گویا اب اس بات کے لئے مجبور رہیں کہ وہ میرا مچلکہ وغیرہ لے لیں لہٰذا گھر پر میری جو خبر لی گئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ والد صاحب صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ ماں کا قول یہ تھا کہ میں نے سانپ جنا ہے اور خود میرا خیال تھا کہ میں چونکہ ایک شریف زادہ ہوں لہٰذا اپنے محسن کا احسان مند ہونا میرا فرض ہے خواہ وہ محسن کتنا ہی بزدل کیوں نہ ہو۔

آخر ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ آج اکرام اپنے اسی تجہیز و تکفین کے کاروبار کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہے چنانچہ میں نے بھی منٹگمری تک کا ٹکٹ لے لیا اور ایک دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا اور جب ٹرین لاہور کے بعد غالباً رائے ونڈ میں ٹھہری تو اکرام کے ڈبے میں جا کر میں نے اس کا خون خشک کر دیا مگر قبل اس کے کہ وہ خطرے کی زنجیر ٹھہری ہوئی گاڑی کو ٹھہرانے کے لئے کھینچے یا کھڑکی سے جست کر جائے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے کہا:

"بابا تم میری ایک بات تو سن لو۔"

اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "بخدا میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے یہ رقابت خود نہیں خریدی۔"

میں نے کہا "پاگل ہوئے ہو تم میں تو صرف تمہارے قدموں پر گر کر احسان مندی کا ایک آنسو بہانے کے لئے تمہاری تلاش میں تھا۔"

اس نے حیران ہو کر کہا "یعنی ——"

میں نے بدستور ہنستے ہوئے کہا "یہ تم کس وہم میں مبتلا ہو گئے ہو کہ میں تم سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میں تو تم کو اپنا محسن سمجھتا ہوں تم نے میرا تیر اپنے کلیجے پر کھایا ہے۔ تم میرے لئے سینہ سپر بنے ہو۔ تم میرے محسن ہو۔ تم نے میری آئی اپنے سر لے لی۔"

اکرام بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے میری باتیں سن رہا تھا اور اب اس کو واقعی یقین آچکا تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں بلکہ شرمندۂ احسان ہوں۔ چنانچہ جب منٹگمری کے اسٹیشن پر میں اس سے رخصت ہوا تو اس نے مجھ کو گلے لگا کر رخصت کرتے ہوئے کہا:

"محسن تم بھی تو ہو میرے اگر تم اس قدر رسیاں نہ تڑاتے تو لاکھوں کی اس دولت کا مالک میں کیسے بنتا؟"

جب ٹرین جا رہی تھی تو میں کہہ رہا تھا "اے سونے کی قبر کے مردے میں تجھ پر فاتحہ پڑھتا ہوں۔"

یروشلم، یروشلم

اے حمید

واہگہ بارڈر پر میں بھارتی کسٹم چوکی کے برآمدے میں کھڑا تھا۔

میرے سامنے ادھیڑ عمر کے ایک سردار صاحب عینک چڑھائے میز پر بہت سے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے اور پاکستان سے بھارت جانے والوں کے ویزے درج کر رہے تھے۔ میرے پاس صرف ایک مختصر سا سوٹ کیس تھا جسے میں نے دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ برآمدے کے اندر اور باہر وہی چہرے، وہی صورتیں منڈلا رہی تھیں جنہیں میں نے پاکستان کی کسٹم چوکی پر دیکھا تھا۔ سردار صاحب جس شخص کو آواز دیتے وہ فوراً سامنے آ کر یوں سہما سہما سا اور بدحواس ہو کر کھڑا ہو جاتا گویا وہ عرصۂ محشر میں ہو اور اس کا حساب کتاب لیا جا رہا ہو۔ پاکستانی مجاہدوں نے بھارتی سرحد میں داخل ہوتے ہی کیلوں کی ایک دکان پہ حملہ کر دیا تھا اور دھڑا دھڑ کیلوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ پھل والا لالہ بڑی گرمجوشی سے کیلے تقسیم کر رہا تھا۔

"کیلا ڈ مہاراج! ایک آنے میں — پیسے ہندوستانی دیں یا پاکستانی۔"

لوگ اسے ہندوستانی کرنسی بھی دے رہے تھے اور پاکستانی بھی — ایک بیگم صاحبہ نے اپنے آدھی درجن بچوں کو دو درجن کیلے لے دیئے اور پہلا کیلا خود چھیل کر دیکھتے دیکھتے نگل گئیں۔ میرے قریب ہی بنچ پہ دو برقعہ پوش عورتیں مع اپنے اہل و عیال کے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت میرے ایک کلاس فیلو کی بیوی تھی اور دوسری ایک گوالیاری بیرے کی۔ میرے کلاس فیلو نے مجھے نہیں پہچانا تھا یا شاید پہچان لیا تھا اور مجھے بلاتے ہوئے ندامت محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کہ عیال داری میں پھنس کر اس کی حالت پہلے سے خراب ہو گئی تھی۔ گوالیاری بیرے کی بیوی کا رنگ گہرا سانولا تھا اور جالی دار سیاہ نقاب میں سے موٹی موٹی شربتی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی گندے عطار کی پرانی بوتل میں سے شربتِ صندل جھانک رہا ہو۔ انگلیاں بھدی تھیں اور نیلی رگیں جابجا اُبھری ہوئی تھیں۔ پان چباتے ہوئے وہ بار بار تھوک رہی تھی اور میں ہر بار اس کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے دیکھ رہا تھا مجھے بے اختیار انتظار حسین کے محاورے یاد آ گئے اور ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مرا ہوا بوڑھا محاورہ جامن کے درخت پر الٹا لٹک رہا ہے جامن کی اس گٹھلی کا خاوند ساتھ ہی سامان پر بیٹھا پان کی پیک سے فرش پر گوالیاری آرٹ میں گلکاریاں کر رہا تھا۔ اتنے میں سردار صاحب نے آواز دی۔ گوالیاری فوراً اٹھ کر میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا ناؤں ہے جی تمہارا؟"

"جی سرافت علی ولد ہاسم علی۔"

"کہاں جاناں ہے؟"

"جی گوالیڑ!"

"ساتھ کون کون ہے؟"

"جی بال بچے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"ساتھ ہی ہیں!"

سردار صاحب جھلا کر بولے:

"اوئے میں پوچھتا ہوں کتنے ہیں؟"

گوالیاری گھبرا گیا۔ اس نے فوراً اپنی پرانی شربتی آنکھوں والی بیوی اور کالے کلوٹے معصوم صورت بچوں کو پیش کر دیا سردار صاحب نے عینک کے نیچے سے پوری آنکھیں کھول کر بال بچوں کو دیکھا اور گوالیاری محاورے سے اس کا نام پوچھا۔

"جی سرلیفن بی بی!"

درخت پر سے دو نیم پوٹے ادھ پکے جامن دھپ سے زمین پر گر پڑے۔ سردار صاحب نے کوئی جامن نہ اٹھایا اور لکھتے چلے گئے۔ پھر بولے:

"پتہ لکھواؤ جی!"

گوالیاری بیرا فوراً بولا:

"پاس کبیر خان پٹھے باز، بالا جی کا لکڑ خانہ، انگلس صاحب کی گوکٹھ خاص سہر ......"

"بس کرو بھاجی! کاغذ مُک گیا ہے۔"

گوالیاری اپنے لال لال دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ سردار صاحب بھی ہنس پڑے۔ انہیں ہنستا دیکھ کر پاس کھڑے سب لوگ ہنسنے لگے۔ کیونکہ سب لوگ سردار صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے اگر اس وقت سردار صاحب رونا شروع کر دیتے تو ہر آدمی ان کے ساتھ رونے لگتا۔ میں بھی سردار صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا کیونکہ ابھی بیرا وزیر الٰہی جمع ہونا تھا۔ بیگم صاحبہ برابر ہری چھالیں کے کیلے کھاتے جا رہی تھیں۔ چنانچہ جب انہیں آواز پڑی تو انہوں نے سب سے پہلے منہ میں ٹھنسا ہوا کیلا نگلا اور پھر اپنا نام بتایا۔ اب بیرے کلاس فیلو کو پکارا گیا۔ وہ جلدی سے اپنی چار چھوٹی چھوٹی بچیوں کو لے کر سامنے حاضر ہو گیا۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا اور چہرے کی کرخت لکیروں میں درشتگی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی ہم دونوں امرتسر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ان دنوں اس کا رنگ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ ہوتا تھا اور گالوں پر ایک بھی لکیر نہ تھی، ایک بھی پیٹی نہ تھی۔ وہ بڑا شرارتی اور بے فکرا تھا اور ہر استاد کو تنگ کیا کرتا تھا اور جب ہنستا تو گالوں پر سُرخی چھلکنے لگتی تھی۔ مگر اب یہ سُرخی اُڑ چکی تھی، رنگ کالا پڑ گیا تھا، آنکھوں تلے حلقے نمودار ہو گئے تھے، اُبھرے پر گذرے ہوئے غموں کی پژمردگی اور آنے والی

مصیبتوں کی سراسیمگی لیے وہ اپنی چار عدد بچیوں کو لیے واہگہ کسٹم چوکی پر سردار صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب وہ سامان چیک کروانے چلا تو میں نے دیکھا پانچواں بچہ اس کی بیوی کے پیٹ میں تھا۔

چیکنگ کا مرحلہ سب سے بڑھ کر صبر آزما ثابت ہوا۔ ایک ایک شے کو ٹھونک بجا کر، چیر پھاڑ کر دیکھا گیا۔ ایک ہندوستانی بیوپاری نے بہت سے پراٹھے باندھ رکھے تھے۔ کسٹم والوں کو شک ہوا۔ انہوں نے ایک پراٹھا پھاڑ ڈالا اور جب اس میں سے سونے کی ڈلیاں برآمد ہوئیں تو مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ اگر ذرے کا جگر چیریں تو لہو نہ نکلے، شہد کا کیسے ٹپک سکتا ہے۔ گوالیار، میرٹھ، دلی اور اسی قسم کے دوسرے شہروں کے رہنے والوں نے چاروں طرف میلے کچیلے گندے بستروں، جہیز نما لحافوں، گھسے پٹے صندوقوں، کنستروں، پوٹلیوں، بڑے بڑے گٹھڑوں کے وہ انبار لگا رکھے تھے کہ کسٹم والوں کو نانی یاد آ رہی تھی۔ بس پر وہ کچھ اس بے دردی سے ہندوستانی زبان میں ملفوظات پھینک رہے تھے کہ اس کی زد سے بچ نکلنا محال تھا۔ یہاں بھی میں نے گوالیار کی با محاورہ خاتون کو دیکھا کہ جالی دار نقاب میں سے لوگوں کو ٹکٹکی لگا کر تک رہی ہے اور اس کا خاوند میز پر بستر بچھائے پرانے کھیس اور میل بھری دریاں اور پھولے ہوئے سرہانے چیک کروا رہا تھا۔ کچھ لاہوری شلوار پوش پمپ شو پہنے اور سونے کے بٹن لگائے ذرا الگ بند سے کھڑے تھے۔ اب ان کی باری تھی۔ کسٹم والوں نے ان کی ایک ایک چیز کو بار بار چیک کیا۔ یہاں تک کہ جوتوں کی ایڑیاں تک کھول دی گئیں۔ یہاں وہ سارا وقت خرگوش کی طرح سہمے رہے لیکن جونہی کسٹم سے رہائی ملی اور امرتسر کی بس میں سوار ہوئے تو بات بات پر قہقہے اور ایک دوسرے سے فحش مذاق شروع ہو گیا۔ گوالیاری بیرا بھی لہک لہک کر اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا:

"ابھی دن کی طاقت تھی کہ قرآن شریف کو ہاتھ لگانے —— وہ تو ہم نے کہا چلو اب کسٹم والوں سے کاہے کا ڈنگا کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کی سانولی بیوی بھی میرے آگے عورتوں والی سیٹ پر بیٹھی برقعے کے اندر گلاب جامن کھا رہی تھی۔ کسٹم پر ان سب لوگوں کی گھگی بندھی ہوئی تھی اور ہر شخص خوفزدہ تھا کہ کہیں ذرا سی بے احتیاطی اور غلطی پر انہیں بارڈر پر ہی نہ روک دیا جائے اور اتنی دیر کی بک بک اور دفتروں کے باہر کے دھکے اور اندر کی رشوتیں کہیں اکارت نہ جائیں لیکن بس میں آ کر ہر آدمی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔ ہر شخص چہک رہا تھا، گنگنا رہا تھا، خواہ مخواہ باتیں کئے جا رہا تھا اور سکھ مزدوروں سے پیسے پیسے پر جھگڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سکھ ڈرائیور آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کنڈکٹر سے سواریوں کی تعداد پوچھی اور موٹر سٹارٹ کر دی۔ بس امرتسر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گئی۔ درخت، کھیت اور بجلی کے کھمبے پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ میں آٹھ سال بعد اپنے وطن جا رہا تھا۔ آٹھ سال پہلے آگ، خون اور دھواں اگلتی ایک بڑی ہی ویران شام کو اس خیال کے ساتھ والدہ اور چھوٹی بہنوں کو لے کر گھر سے نکلا تھا کہ گڑبڑ ختم ہو جائے گی تو لاہور سے واپس آ جاؤں گا۔ لیکن جو کچھ تھا ختم ہو گیا، گڑبڑ ختم نہ ہوئی۔ اب اتنی مدت بعد ان گلی کوچوں میں جاتے ہوئے دل میں عجیب قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ اپنا محلہ، اپنی گلی، اپنا بازار اور اپنا مکان کیسے دیکھ سکوں گا۔ کیسے آنکھیں چار ہوں گی؟ دل پر کیا نہیں گذرے گی؟

اٹاری گذر گیا۔ اس کے بعد گوروسر ستلانی اور پھر خاصہ آ گیا۔ سڑک پر دو رویہ شیشم کے گنجان درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں گذر رہے تھے۔ دور سے مسجدوں کے کھنڈر اور مندروں اور گوردواروں کے چمکتے کلس نظر آ جاتے۔ اب امرتسر کے کارخانوں

کی جھنڈیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ امرتسر آ رہا تھا۔ امرتسر آ گیا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر بس کی کھڑکی سے لگا دیا۔ اجڑے ہوئے وطن کے گلی کوچوں کی خوشبو اڑنے لگی تھی۔

کبھی کبھی میں لاہور سے پٹھانکوٹ میل پر امرتسر جایا کرتا تھا۔ یہ گاڑی رات کو دس بجے چھوٹا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب خاصہ کا سٹیشن آتا تو دور سے کارخانوں کی روشنیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اس کے بعد گاڑی بڑی تیزی سے ان کارخانوں کے قریب سے گذرنے لگتی۔ یہاں کہیں سے لوہا کوٹنے کی دھمک سنائی دیتی تو کہیں گڑگڑ کرتی کرین اوپر اٹھ رہی ہوتی اور کہیں ویلڈنگ کرنے والی تیز نیلی روشنی بار بار بھڑک رہی ہوتی۔ پھر لائن کی دائیں جانب اسلام آباد کے مکانوں کی روشنیاں روشندانوں اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھتیں اور گاڑی مختلف پٹڑیوں پر سے بے ہنگم شور کے ساتھ پھسلتی امرتسر کے اونچی چھت والے کشادہ سٹیشن میں آن داخل ہوتی۔ میں بڑی بے فکری سے ڈبے میں سے باہر نکلتا اور گیٹ پر سیزن ٹکٹ دکھلا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ ریل کے سیڑھیوں والے پل پر سے گذرتے ہوئے میں پٹھانکوٹ میل کو دیکھتا جس کا انجن بڑے زور شور سے بھاپ کے بادل چھوڑ رہا ہوتا۔ ہال بازار میں گرمیوں کی رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی اور اکا دکا لوگ آ جا رہے ہوتے۔ میں اپنی دھن میں مست قدم قدم چلتا ہال بازار میں سے گذر کر اپنے محلے اور پھر اپنی گلی میں آ جاتا۔ سردیوں میں گلی خاموش ہوتی اور گرمیوں میں کہیں کہیں محلے دار کمیٹی کے لیمپوں کی روشنی میں چارپائیوں پر بیٹھے تاش وغیرہ کھیل رہے ہوتے۔ اپنے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں ایک مکان کی کھڑکی ضرور دیکھ لیا کرتا۔ اس کھڑکی پر چق گری ہوتی۔ مجھے ہمیشہ یوں لگتا جیسے انور کھڑکی میں کھڑی، چق کی تیلیوں کو انگلیوں سے اپنی طرف کھینچے گلی میں جھانک رہی ہے —— آٹھ سال بعد جب میں اس گلی میں سے گذر رہا تھا تو اپنے مکان کے پاس پہنچ کر میری نظریں خود بخود اس کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں مگر آج اس کھڑکی کا منہ ننگا تھا۔ اس پر کسی چق کا سایہ نہ تھا۔ وہاں کوئی انور، عطیہ اور رضیہ نہ تھی۔ کبھی اس کھڑکی پر مجھے ایک ایسی کنواری لڑکی کا گمان ہوا کرتا تھا جس نے ٹاٹ چھپ کر اپنی منگنی کی خبر سن لی ہو اور اب شرم سے نظریں نیچی کیے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو لیکن آج اس کھڑکی کا منہ اس بدنصیب بیوہ کی مانند کھلے کا کھلا تھا جس کے جوان بیٹے کی لاش لوگ قبرستان میں دفن کرنے لے گئے ہوں۔

لیکن ایک زمانہ تھا جب امرتسر کے قبرستان بھی خوبصورت تھے اور گذرنے والوں کو زندگی کا پیام دیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کھڑکی پر بانس کی تیلیوں والی ایک چق پڑی رہتی تھی اور اس کے عقب میں کھڑی چھریرے اور گندمی بدن کی ایک کشمیری لڑکی اپنی کالی کالی شربتی آنکھوں سے مجھے اسکول جاتے اور اسکول سے واپس آتے دیکھا کرتی تھی جس کے داہنے گال پر ایک سیاہ تل تھا اور جس کے سونے کی تاروں ایسے سنہرے اور لمبے بال اس کی نازک کمر پر کھلے رہتے تھے اور جو سردیوں میں فاختائی رنگ کی گرم فرد اوڑھا کرتی تھی اور گرمیوں میں بسنتی، قرمزی اور نیلے پھولوں والی وائل کی قمیص پہنا کرتی تھی۔ اس لڑکی کا نام انور تھا۔ مجھے انور سے بڑی محبت تھی۔ میں راتوں کو کمپنی باغ کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر انور کی یاد میں رویا کرتا تھا۔ آٹھ سال بعد میں نے انہی درختوں کے نیچے جا کر ان آنسوؤں کو تلاش کیا لیکن وہاں سوائے جھڑے ہوئے زرد پتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار انور ہفتہ بھر کے لئے اپنی خالہ کے ہاں بٹالہ گئی۔ میں اداس رہنے لگا۔ انور کی جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ تیسرے روز میں بھی ریل گاڑی میں بیٹھ کر بٹالے پہنچ گیا۔ پچھلے سموں کی بات ہے۔ ان دنوں دلوں میں چور نہیں ہوتے تھے اور لوگ ایک دوسرے پر بہت کم شک کیا کرتے تھے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہوگی۔ سٹیشن سے سیدھا انور کی خالہ کے ہاں پہنچا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں دروازے کے ساتھ لگ کر کتنی ہی دیر چپ چاپ

کھڑا رہا۔ دل میں یہ امید لئے کہ شاید انور نیچے آئے۔ کافی دیر بعد انور اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ نیچے آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی اور انگلی گال پر رکھ کر بولی "ہاؤ ہائے ـــــ تم کہاں؟"

وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئی۔ اس کی خالہ نے مجھے انڈوں کا حلوہ اور پراٹھے کھلائے۔ جب ہم دونوں وہاں اکیلے رہ گئے تو اس نے میری ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

"ارے چارلی! تم اکیلے کیسے آ گئے؟"

انور مجھے چارلی کہا کرتی تھی۔ اس لئے کہ ان دنوں چارلی کی فلمیں بہت چلا کرتی تھیں اور میں اسے چارلی کی نقلیں کر کے بہت ہنسایا کرتا تھا۔ گرمیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی صبحوں کو ہم لوگ پو پھٹے کمپنی باغ کی سیر کو جایا کرتے۔ انور، انور کی امی، رضیہ، رضیہ کی امی، صفیہ، سعیدہ، محمودہ، میری بہنیں، امی اور میں اور سعیدہ کا بڑا بھائی اسلم لالہ اور ہمارا کتا موتی ـــــ یہ لوگ ہمارے ہمسائے بھی تھے اور دور کے رشتہ دار بھی۔ آپس میں بڑا بھائی چارہ اور میل برتاؤ تھا۔ ایک طرح سے مرن جیون اکٹھا تھا۔ بیاہ شادیوں پر یہی لڑکیاں سنہری گوٹے لگے کپڑے پہنے ڈھولک پر گیت گایا کرتی تھیں اور عید شب برات پر انہی کی چہل پہل ہوا کرتی۔ کمپنی باغ کی سیر ایک عجیب و غریب یادگار ہے۔ انور کی امی رات کو ہی نل کے نیچے خالی بالٹی رکھ چھوڑتی۔ صبح چار بجے جب نل میں پانی آتا تو اس کی دھار خالی بالٹی میں گرتی جس کے شور سے وہ جاگ پڑتی۔ سب سے پہلے وہ ہمیں جگاتی۔ ہم موتی کو ساتھ لے کر گلی میں آ جاتے۔ بھورے بھورے بالوں والا موتی گلی میں اچھل کود مچانے لگتا۔ اس کے بعد صفیہ، رضیہ، سعیدہ اور اسلم لالے کو بھی اٹھایا جاتا اور تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ موتی اور اسلم لالہ کی سرکردگی میں کمپنی باغ کی طرف روانہ ہو جاتا۔ آسمان پر تارے پچھلے پہر کے دم توڑتے سایوں میں جھلملا رہے ہوتے۔ صبح کی تازہ اور خواہ مخواہ ستا دینے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی۔ مشرق کی طرف تحصیل پورہ کی آبادی کے اوپر صبح کاذب کی کافوری جھلکیاں نمودار ہونے لگتیں۔ جب ہم شریف پورے والا پھاٹک عبور کر کے کمپنی باغ کی حدود میں داخل ہوتے تو لیموں اور کھٹے کی ٹھنڈی اور ترش خوشبو ہمارا خیر مقدم کرتی۔ بارہ دری والے تالاب کے پاس بائیں ہاتھ کو گھاس کا ایک میدان ہوتا تھا جہاں بڑ کا ایک گنجان درخت جٹا دھاری سادھو کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوتا۔ یہ درخت ہماری منزل ہوتا تھا۔ عورتیں برقعے اتار کر بنچ پر ڈھیر کر دیتیں اور جوتے پھینک گھاس پر ننگے پاؤں بھاگنا شروع کر دیتیں۔ میں فوراً بوڑھے درخت کی داڑھی پکڑ کر اوپر چڑھ جاتا اور ٹارزن کی طرح جھولتا ہوا ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتا۔ کبھی میں کسی جھکی ہوئی شاخ کو غوطہ لگا کر پکڑتا اور اس کے سہارے لٹک کر زمین پر آ جاتا۔ میں یہ سب کچھ انور پر اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے کرتا۔ لیکن مجھے یاد ہے انور نے کبھی ان باتوں کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھاس پر شلوار کے پائنچے اٹھائے بھاگ دوڑ میں مشغول رہتی۔ قریب ہی آم کے درختوں کے جھرمٹ میں ایک نہر بہا کرتی تھی۔ اس کے جھکے ہوئے ڈھلوانی کناروں پر ہری لمبی گھاس ہمیشہ لہلہایا کرتی۔ ساون کی اندھیری راتوں میں آم کے جھنڈوں میں کوئلیں کوکتیں اور گھاس میں جگنو چمکتے پھرا کرتے۔ کھیل کود سے تھک کر ہم لوگ اس نہر پر آ کر خوب نہاتے۔ نہر کا پانی بڑا ٹھنڈا اور ریتلا ہوتا۔ ہم لوگ اس میں کناروں پر سے کود کود کر چھلانگیں لگاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بار میں نے نہر میں چھلانگ لگائی تو غلطی سے انور کے اوپر جا گرا۔ انور بالکل برہنہ تھی اور اس نے محض ململ کا ایک باریک دوپٹہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ گیلے دوپٹے میں سے اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کا ابھار کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا اور جب میں اس پر گرا مجھے ادھ پکی خوبانیوں کی گرم گرم مہک محسوس ہوئی۔ ندی کے چاروں طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور ابھی صبح نہیں ہوئی

تھی۔ میں ایک دم پرے ہٹ گیا۔ انور نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چھاتیوں پر کھینچ لیئے اور نیم سبز خوبانیاں پتوں کے جھرمٹ میں چھپ گئیں اور انور کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور میرا جسم سر سے لے کر پاؤں تک کانپنے لگا اور انور نے شرما کر مجھے دیکھا، ذرا سا مسکرائی اور پانی میں ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی اور میں پیاسے ہونٹوں پر خشک ریت کی دھول اڑاتا وہیں کھڑا رہا اور میرا دل دھڑکتا رہا، دھڑکتا رہا...... میں آج بھی اپنے بدن پر انور کے جسم کی وہ ٹھنڈی ٹھنڈی پاکیزہ گرمائش اور رسدار نیم گرم خوشبو اسی طرح محسوس کرتا ہوں اور نیم سبز کانپتی، لرزتی، لجھائی ہوئی خوبانیوں کو پتوں کے سائے میں چھپتا دیکھتا ہوں اور آم کے درختوں میں دل جلی کوئلیں کوکنے لگتی ہیں اور ہوا تیز ہو جاتی ہے اور پکے ہوئے آموں پر سے میٹھا رس بھرا شیرہ ندی کے پانی میں ٹپکنے لگتا ہے اور میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور دھڑکتا رہتا ہے، دھڑکتا رہتا ہے......

کبھی ہم لوگ ندی کی دوسری جانب ناخوں کے باغ میں دھاوا بول دیتے۔ رضیہ، صفیہ، انور، سعیدہ، محمودہ اور میں ناخ کے درختوں میں گھس جاتے اور کچی پکی ناخیں توڑ توڑ کر جھولیاں بھر لیتے اور بھاگ کر نہر میں کود جاتے۔ پھر ہم ناخوں کو نہر کے پانی میں دھو کر خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ اسی ندی کے آس پاس جھاڑیوں میں جنگلی گلاب بہت اُگا ہوا تھا۔ واپسی پر ہم گلاب کے بڑے بڑے گلدستے بنا کر ساتھ لاتے۔ انہی جھاڑیوں میں کہیں کہیں سفید رنگ کا ایک پھول اُگا کرتا تھا۔ یہ پھول موتیے سے بڑا ہوتا تھا اور پتیاں ایک دوسری پر جھکی ہوتی تھیں۔ اس کی خوشبو سے سارا باغ مہکا ہوتا۔ لیکن یہ پھول بڑی مشکل سے ملا کرتا تھا اور لوگ کئی کئی گھنٹے اس کی تلاش میں ضائع کیا کرتے تھے اس پھول کی خوشبو بڑی میٹھی اور خواب انگیز ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے صندل کی ٹہنی پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم مولسری کے پھولوں پر گر رہی ہو — آج کمپنی باغ میں اس پھول کی مہک کا سُراغ بھی نہ مل سکا۔ جہاں کل جھاڑیوں میں اس پھول کے شگوفے پھوٹا کرتے تھے آج وہاں پوری کچھریوں اور دہی بڑے والے چھوٹے دونے اور گندے چیتھڑے ملے۔ کل امرتسر کسی شرمیلی آنکھوں والی کنواری لڑکی کے ہاتھ سے کڑھا ہوا سفید رومال تھا جس کے اوپر سبز پھولوں والی بیلیاں سجا کر کشمیری چادر بچھائی جاتی تھی اور آج امرتسر سُرخ شنیل کا ایک گندہ چیتھڑا ہے جیسے کسی لالائن نے اپنا پیٹ صاف کر کے کمپنی باغ کی جھاڑیوں میں پھینک دیا ہو۔ اس کے ہر پھول پر جمے ہوئے غلیظ خون کے دھبے ہیں اور گھاس کے ہر خطے میں گائے بھینسوں کے گوبر کے ڈھیر ہیں۔ جن محلوں میں کل اگربتیوں کی خوشبوئیں اڑا کرتی تھیں وہاں آج اوپلوں کے کڑوے دھوئیں میں دم گھٹتا ہے۔ جن مسجدوں میں کل صبحدم اذان کی دلنواز صدا گونجا کرتی تھی وہاں آج ہر شام چمگادڑیں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح چیختی پھرتی ہیں۔ کل جن مکانوں، چاندادوں اور حویلیوں کے لئے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا آج ان کے کھنڈروں میں کتنے گندگی پھیلاتے پھرتے ہیں اور بلّیوں نے بچے دے رکھے ہیں۔ کل جن کھڑکیوں پر گری ہوئی چلمنوں کی ایک ہلکی سی لرزش پر جوان سینوں کے اندر دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں آج ان کھڑکیوں کی جلی ہوئی چوکھٹوں سے ہوا بھی اپنا دامن بچا کر گذرتی ہے ——— امرتسر! امرتسر! ——— کل تیرے اندھیروں میں جگنو تارے بن کر جگمگاتے تھے، آج تیری روشنیاں گرہن کے داغ بن کر سلگ رہی ہیں۔ کل تیرے دودھیا میناروں کو نیلا آسمان جھک کر چومتا تھا اور آج تیرے سائے بھی دھرتی پر ایک بوجھ ہیں۔ یروشلم! یروشلم! تیرے معبدوں کی زینتیں ویران ہو گئیں۔ تیری فصیلوں کے برج کھنڈر بن گئے۔ تیرے حالی موالی جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور تیرے بیت المقدس پر سے یسوع مسیح تجھے اکیلا چھوڑ کر پرواز کر گئے۔ ہم راوی کے کنارے بیٹھے تیری یاد میں آنسو بہا رہے ہیں۔ ہمارے نرگس شبنم کی ٹہنیوں پر لٹکے ہیں اور ہمارے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔

شروع گرمیوں میں چیت کی صبحوں کو ندی کنارے والے آموں پر بور آ رہا ہوتا اور چاروں طرف اس کی گہری گہری میٹھی خوشبو پھیلی ہوتی ہمارا قافلہ ان خوشبوؤں میں اڑاتے مہکیلے راستوں پر سے گذرتا ہوا گھر کی راہ لیتا۔ راستے میں کہیں مرتیا کھلا ہوتا اور کہیں رات کی رانی اپنی خوشبو کا

رہا سہا خزانہ لٹا رہی ہوتی۔ انور، صفیہ اور محمود موتیے کے سفید سفید پھول توڑ کر ان کے بندے بنا کر کانوں میں پہن لیتیں اور میں گلاب کا گلدستہ ہاتھ میں پکڑے اسلم لالے کے ساتھ سب سے آگے آگے جا رہا ہوتا۔ گھر پہنچنے کے بعد میں صابن دانی اور تولیہ اٹھاتا اور سامنے والی مسجد میں نہانے کے لئے آ جاتا۔ اگرچہ گھر پر نلکا موجود تھا مگر جو مزا کنوئیں کے پانی میں تھا وہ کمیٹی کے نل میں نہ تھا۔ مسجد میں ماسٹر حمید اور ماسٹر رفیق پہلے ہی سے ٹونٹیوں کے پاس بیٹھے مسواک کر رہے ہوتے۔ ماسٹر حمید رائل ٹاکیز میں آپریٹر تھا اور ماسٹر رفیق زیورات میں نگینوں کی جڑائی کا کام کرتا تھا۔ اسے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ چونکہ گانا بھی خوب تھا اس لئے ہم لوگ اسے "ماسٹر سہگل" کہا کرتے تھے اور وہ اس لقب پر بہت خوش تھا۔ ماسٹر سہگل کا رنگ گہرا سانولا تھا اور وہ لکس اور پیئرز صابن کو ملا کر نہایا کرتا تھا اور گھنٹہ گھنٹہ بھر نہایا کرتا تھا۔ حسن بٹ ریلوے گارڈ ایک روز مسجد کے غسل خانے کے باہر کھڑے کھڑے تنگ آ گیا۔ جب ماسٹر سہگل غسل خانے سے خوب نہا دھو کر باہر نکلا تو بٹ نے کہا:

"ماسٹر! اگر تم شملے میں اتنا پانی ضائع کرتے تو تم پر ٹیکس لگ جاتا۔"

ایک روز ماسٹر سہگل تولیہ صابن لئے مسجد میں داخل ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ منہ سرخی پوڈر سے لال ہو رہا ہے۔ ہم نے پوچھا:

"ماسٹر! یہ کیا سوانگ ہے؟"

"کچھ نہیں ماسٹر! رات تھیٹر والے پکڑ کر لے گئے۔ کہنے لگے جوگی بابا کا پارٹ کر دو۔"

ماسٹر سہگل نے دو تین سال سے رنجیت مووی ٹون میں ایکٹر بننے کی درخواست دے رکھی تھی جس کے جواب کا وہ ہمیشہ منتظر رہتا تھا

ہم جب کبھی اس سے پوچھتے:

"ماسٹر بمبئی سے کوئی جواب آیا؟"

تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا:

"بس ماسٹر آنے ہی والا ہے۔"

مئی جون کی تپتی ہوئی اُداس دوپہروں کو جب گلی چلچلاتی دھوپ میں ویران ہوتی ماسٹر سہگل اپنی دوکان کا ایک پٹ بند کئے لکڑی کے ڈیسک کے آگے بیٹھا لاخ میں جمی سونے کی انگوٹھی میں نگینے جڑتے اور اسے چمکاتے ہوئے کبھی کبھی بڑی دردناک آواز میں گانے لگتا ؎

نبی جی کہہ دو شاد دکھیاریاں نوں

مصیبت زدہ غم دیاں ماریاں نوں

اس کی دردانگیز آواز سیاہ ماتمی علم بن کر دوپہر کی تربت پر پھڑ پھڑانے لگتی اور دل اُداسیوں سے لبریز ہو جاتا۔ جیٹھ ہاڑ کی یہ آگ برساتی دھول اڑاتی، سسکارتی، ہونکتی، غمگین، دلگیر، چپ چاپ، اُجاڑ دوپہریں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تیز دھوپ میں گلی کا فرش ہانپنے لگتا اور سلگتے چھوٹے چھوٹے سائبانوں، مکانوں اور ڈیوڑھیوں کے چھجوں کے نیچے بھاگ کر سمٹ جاتے اور لوگ ٹھنڈے دیوان خانوں کی کھڑکیاں بند کئے فرش پانی سے دھو کر سو جاتے۔ گلی سنسان ہو جاتی۔ کبھی کبھی کسی مکان کی تپتی ہوئی منڈیر پر بیٹھی کوئی چیل اپنی آواز سے فضا کو اور ویران بنا دیتی۔ اس وقت معلوم ہوتا گویا بدنصیب، بیوہ اور آزردہ دل دوپہر کسی پر کٹی کبوتری کی طرح گلی میں دکانوں کے سائبانوں اور مکانوں کی بند کھڑکیوں سے سر ٹکراتی، بین کرتی پھر رہی ہے۔ ایسے میں جب ماسٹر سہگل کی اداس آواز بلند ہوتی تو دل سینے کے اندر سرد آہ بھرتا اور یہی جی چاہتا کہ اٹھ کر بڑی نہر والی سڑک پر چل پڑیے اور ٹاہلیوں کے درختوں کی خوشبو پیتے کسی جگہ ٹھنڈی چھاؤں میں پڑ کر سو رہئے اور اس وقت اٹھئے جب گرمیوں کا

ٹھنڈا ٹھنڈا سبز چاند ٹاہلی کی ٹہنیوں میں مسکرا رہا ہو اور باغوں میں چنبیلی اور موتیے کے پھولوں پر بھونرے منڈلا رہے ہوں۔

ماسٹر سہگل محلے کی نعتیہ پارٹی کا استاد تھا۔ جس گھر، جس مسجد میں محفلِ میلاد منعقد ہوتی یہ پارٹی وہاں ضرور موجود ہوتی۔ مجھے وہ منظر اب بھی یاد ہے۔ درمیان میں خوبصورت جازم پر طشتریوں اور سینیوں میں پھل اور مٹھائیاں سجی ہوئی ہیں۔ اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ ایک آدمی بڑا سا پنکھا ہلا رہا ہے۔ دوسرا تھوڑی تھوڑی دیر بعد لوگوں پر گلاب دانیوں میں سے گلاب کا عرق چھڑک رہا ہے۔ لوگ آنکھیں بند کیے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہے ہیں۔ ماسٹر سہگل نے سر خوبصورت ریشمی رومال سے ڈھانپ رکھا ہے۔ دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہیں دو زانو ہو کر بیٹھا ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور بڑی رقت کے عالم میں جھوم جھوم کر نعت پڑھ رہا ہے۔ ایک روز ماسٹر نے اسی طرح کے ایک ختم شریف سے واپس دوکان پر آکر مجھے ایک رقعہ دکھلایا۔ اسکول کی لکیردار کاپی کے کاغذ پر زیبڑ کی نب اور کالی سیاہی سے بڑے بھونڈے خط میں لکھا تھا:

"بھائی جان رفیق اسلام و دعا۔ آپ جب ہمارے گھر نعت پڑھ رہے تھے تو میں بھی چق کے پیچھے آپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں تو رو پڑی۔ کیا آپ مجھے یہ نعت نقل کر کے بھیج دیں گے اور طرز بھی اس کی اچھی سی بنا دیں گے۔ آپ بہت اچھا گاتے ہیں اور ہاں جی ——کھٹی چیزیں نہ کھایا کریں——

فقط ۔ ۔ ۔ ۔"

نیچے نام نہیں لکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ماسٹر محلے کے ایک مشہور رفوگر کی چھوٹی لڑکی سے عشق لڑا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور ماسٹر سہگل اس حادثے کے بعد ایک عرصے تک اس کی یاد میں ڈوب کر نعتیں پڑھتا رہا۔

ماسٹر حمید نیو تھیٹرز کی فلموں کا شیدائی تھا اور اسے دیوداس کے سارے مکالمے اور گانے نوکِ برزبان تھے۔ وہ دیوداس کا آخری گیت بڑی سیدھی سادی خشک اور پھیکی مگر پُرسوز آواز میں گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز پر مجھے یوں لگتا جیسے خشک سرکنڈوں میں آگ کا پہلا شعلہ سرسرا رہا ہو۔ ماسٹر دیوداس کا وہ منظر بڑی رقت بھری آواز میں سنایا کرتا تھا جب ریل گاڑی میں پہلی بار دیوداس خون تھوکتا ہے اور وہ خون دیکھ کر سہم کر نوکر سے کہتا ہے:

"دھرم داس! خون!"

آج ماسٹر حمید لاہور کی ایک گندی اور اندھیری گلی میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ماسٹر سہگل اس دنیا میں نہیں رہا۔ ماسٹر حمید وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو رہا ہے۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی ہیں۔ پرانے واقف کاروں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ پانچ وقت کا نمازی ہے اور ہر وقت کا روگی ہے۔ بیمار ہے، پریشان ہے، مفلوک الحال ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو سلام کے بعد سر جھکا کر گذر جاتا ہے۔ شاید کسی دن مجھے اپنا گریبان کھول کر چپکے سے سینہ دکھائے اور کھانس کر کہے:

"دھرم داس! خون!"

کبھی کبھی شام کو ہم اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں جا کر چائے پیتے۔ اس ہوٹل کی میزیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور بنچوں میں کھٹملوں نے اپنی چھاؤنیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ اسی ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھ کر میں نے انور کو پہلا محبت بھرا خط لکھا تھا اور جب انور ڈولی میں سوار ہو کر اپنے خاوند کے گھر جانے لگی اس وقت بھی میں اسی ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ ہوٹل کا مالک رحمان لالا اوپر چائے گھر واتا تھا اور خود اس کی کمیشن پر گذارہ کرتا تھا۔ ہر جمعرات کو ختم شریف

کرواتا اور گڑگڑا کر خدا سے اپنے ہفتے بھر کے گناہوں کی معافی مانگتا۔ وہ موٹا، بھدا، ادھیڑ، لمبا، بدوضع، بےڈول پرانا کشمیری تھا اور لوگوں کو میٹھی چائے پلاتا اور خود سبز چائے پیا کرتا تھا۔ بیساکھی کے میلے پر جب گول باغ میں تھیٹر والی کمپنیاں اپنے خیمے گاڑ کر کھیل تماشے شروع کر دیتیں تو رحمان لالا دو روپے روز پر وہاں جلاد کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک دنبہ پال رکھا تھا جس سے بڑا پیار تھا۔ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ رحمان لالا ڈنڈے سے دنبے کو تابڑ توڑ کوٹ رہا ہے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو ہانپتے ہوئے بولا:

"بھین یا وا دس روپے کا نوٹ کھا گیا ہے ——— نکال باہر تیری ماں کو..." اور پھر دھڑا دھڑ ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔

سردیوں کی دھندلی صبحوں کو منہ اندھیرے ہماری گلی میں ایک فقیر آیا کرتا تھا جو اکتارے پر بار بار یہ مصرعہ گایا کرتا:

"نیئوں چھڈ کے گلی نوں ٹر گئیاں

جنہاں دا مان کریں"

اس کی آواز میں بڑا جادو تھا اور میں یہ مصرعہ سن کر ہمیشہ پژمردہ ہو جاتا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جن پہ اتنا مان ہو، اتنا ناز ہو وہ اکیلا چھوڑ کر چل دیں۔ گرمیوں میں وہ بوڑھا درویش آیا کرتا جو صبح صبح گلی میں داخل ہوتا اور ہر مکان کی کھڑکی سے منہ لگا کر یہ شعر تھکی تھکی، کانپتی بوڑھی آواز میں گاتا:

اُٹھ فرید اسُتیا تیری داڑھی آیا بُور

اگا نیڑے آگیا تے پچھا رہ گیا دُور

سوچتا ہوں یہ لوگ اب کہاں ہوں گے؟ شاید مر گئے ہوں۔ شاید مار دیئے گئے ہوں۔ شاید زندہ ہوں اور کسی دور افتادہ گاؤں کے تکیے میں اور یا کسی مصری شاہ کے پل کے نیچے جھونپڑوں میں بیٹھے جسم پر بھوک کے گھاؤ اور بیماریوں کے داغ لئے موت کا انتظار کر رہے ہوں ——
اگا نیڑے آگیا تے پچھا رہ گیا دور۔

کمپنی باغ والی عیدگاہ میں جامن کے گنجان درختوں تلے ایک پرانا حوض تھا۔ اس کے گدلے پانی میں مٹیالی مٹیالی مچھلیاں اور جامن کے خاکستری پتے تیرا کرتے تھے۔ برسات کے دنوں میں کالے کالے موٹے جامن دھپ دھپ گیلی زمین پر گرا کرتے۔ یہاں سے قریب ہی چھوٹی نہر کے کنارے کنارے دونوں جانب شہتوت کے بے شمار درخت ہوا کرتے تھے۔ آج یہاں شرنارتھیوں نے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی ایک پوری کالونی آباد کر رکھی ہے۔ اپریل کے دنوں میں جب بہار کا آغاز ہوتا، چھابڑی والے یہاں سے شہتوت خرید کر اسے نہر میں دھو کر چھابڑیوں میں کیلے کے ہرے ہرے پتے لگاتے۔ ان پر لال لال، ہرے بھرے، قرمزی اور سیاہ شہتوت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بناتے۔ ان پر بیچ گلاب کے پھول سجاتے اور پھر شہر کی طرف چل پڑتے۔ گلیوں میں صبح صبح ان کی آمد آمد بہار کی دلیل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شہر سے باہر باغ کے درخت سفید سفید شگوفوں سے بھر گئے ہیں اور نہر کنارے آم کے درختوں پر خوشبودار سنہرا بور آ گیا ہے اور آلوچے کی ٹہنیوں پر کاسنی کلیاں پھوٹ پڑی ہیں اور طوطوں نے امرود اور رس دار لوکاٹیں کترنا شروع کر دی ہیں۔ پھر میں بھی چھڑی ہاتھ میں لے، نیکر اور قمیص پہنے، سر اور پاؤں ننگا باغوں کی سیر گشت کرنے گھر سے نکل پڑتا اور سارا سارا دن کبھی اکیلا اور کبھی دوستوں کی ٹولی کے ساتھ امرود اور لوکاٹوں کے باغ میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ کچے پکے امرود توڑ توڑ کر کھاتا، بلبلوں کے گھونسلے اجاڑتا، گہری پیلی سنہری اور کتھئی رنگ کی لوکاٹیں اٹھا اٹھا کر جیبوں میں ٹھونستا اور کھیت جانے والی کچی پگڈنڈیوں پر چھڑی ہوا میں لہراتا واپس گھر کی طرف چل پڑتا ——— ایک جیب میں کچے امرود ہوتے تو دوسری میں لوکاٹ

اور نیکر کی جیبیں شہتوت سے بھری ہوتیں اور ننگے پاؤں تلے پگڈنڈی ہوتی اور ہوا میں دھریک، نیم اور لیموں کے پھولوں کی مہک اڑ رہی ہوتی اور رنگ برنگی تتلیاں ہوتیں اور آم کے بور پر منڈلانے والے سیاہ بھونرے ہوتے اور جب نہر آتی تو میں نیکر قمیص اتار کر ننگ دھڑنگ، نہر میں چھلانگ لگا دیتا اور مزے لے لے کر نہاتا اور ڈبکیاں لگاتا۔

پھر ساون بھادوں کے کالے کالے اٹھیالے اور پانی سے لدے ہوئے مہیب بادل جھوم جھوم کر آتے اور ٹکیمپنی باغ، شریف پورہ اور تحصیل پورے پر گھٹا بن کر چھا جاتے اور دیکھتے دیکھتے بارش کی جھڑی لگ جاتی۔ تکیہ بودی ساہئیں میں بیری کے نیچے بیٹھ کر چوسر کھیلنے والے فوراً دریاں جھاڑتے ہوئے اٹھتے اور کوٹھڑی کی طرف بھاگ جاتے۔ باغوں کی طرف سے کوئل کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ ہماری گلی کا فرش بھیگ جاتا اور فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی۔ سامنے والی مسجد کا پتھر کی سلوں والا فرش چمکنے لگتا۔ انورا اپنی کھڑکی میں نمودار ہوتی — باہیں اوپر اٹھا کر بندھی ہوئی چٹیا کھولتی، نیچے گلی میں جھانک کر ادھر اُدھر دیکھتی اور واپس چلی جاتی۔ میں سائیکل اٹھاتا اور کمپنی باغ کی آوارہ گردی کرنے چل نکلتا۔ جب واپس آتا تو چھاجوں پانی برس رہا ہوتا۔ انورا اپنے دیوان خانے میں چق کے ساتھ خاخائی فرد اوڑھے بیٹھی ہوتی۔ ذرا چق اٹھا کر مجھے دیکھتی اور مسکرا کر کہتی:

”ہوسے جارلی! تجھے بارش میں بھی چین نہیں۔“

جاڑوں میں مینہ برستا تو انور کی نانی دیوان خانے میں سرینگر والا سماوار سلگا دیتی۔ میں بھی گرم فرد اوڑھے وہاں آن بیٹھتا۔ میری بہنیں بھی وہاں آجاتیں۔ انورا اوپر سے کانگڑی میں کوئلے ڈال کر لے آتی اور ہم لوگ آگ تاپتے ہوئے پوہ ماگھ کی سرد بارش میں سبز چائے کا انتظار کیا کرتے۔ مینہ کی بوچھاڑ تیز ہوا کے ساتھ چق پر بھی پڑنے لگتی۔ انور جلدی سے زمین پر بچھی ہوئی دری کو اپنی طرف سمیٹ لیتی اور ذرا سا پیچھے کھسک جاتی۔ سردی اور بارش کے احساس سے اس کا رنگ سُرخ ہو جاتا اور کشمیری سیب ایسے گالوں پر ملائم اور ریشمی نور سا اُڑنے لگتا۔ کئی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان ریشمی روئیں دار گالوں کو چوم لوں۔ اتنے میں بادل زور سے گرجتا اور سماوار میں چائے اُبلنے لگتی۔ انور کی نانی باری باری چھوٹی چھوٹی پھولدار نیلی پیالیوں میں چائے انڈیلتی اور سماوار وسط میں رکھ کر بڑی موج میں آکر کوئی پرانا کشمیری گیت سنانا شروع کر دیتی۔ وہ کشمیری بڑی روانی سے بول لیتی تھی اور لب و لہجہ اور سبھاؤ پورا پرانی کشمیری عورتوں ایسا تھا۔ مجھے وہ گیت یاد نہیں رہے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بڑے یاس انگیز اور غمناک ہوتے تھے اور میں انہیں بڑی توجہ سے سُنا کرتا تھا۔ خیال ہی خیال میں، میں مہیب پہاڑوں کے ان خوفناک دشوار گذار جنگلوں میں پہنچ جاتا جہاں موسلا دھار بارش ہو رہی ہوتی اور تمام پتھریلے راستے اور بانس کے جھنڈوں میں سے ہو کر گذرنے والی پگڈنڈیاں بارش کی دھند میں چھپ گئی ہوتیں۔ میں دیکھتا کہ ایک سانولی سی کالی کالی آنکھوں اور سُرخ ساری والی لڑکی ماتھے پر بندیا لگائے، کانسی کی گاگر اٹھائے ان راستوں پر چلی جا رہی ہے اور گرتی بارش میں اس کی ساری اس کے سانولے بدن سے چپک رہی ہے اور دُھند نے اس کے ارد گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے بانس کی ٹہنیاں ہوا اور تیز بارش میں جھک جھک کر اس کے دمکتے ہوئے رخساروں کو چومنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ ہراساں ہے — گھبرائی ہوئی سی ہے، کبھی ہاتھ سے ساری کا پلّو سنبھالتی ہے اور کبھی اسے چہرے پر رکھ کر آنکھوں پر آیا ہوا پانی پونچھتی ہے —— پھر ایک دم آنکھوں کے سامنے ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ پھیل جاتا۔ میں دیکھتا، تند ہواؤں کے جھکڑوں اور زوردار بارش میں نیم اور دھریک کے درخت دہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ کھیت جوہڑ بن گئے ہیں اور ندی نالے دریا بن کر بہنے لگے ہیں۔ دیہات کے کچے کوٹھوں پر سے پانی چھوٹی چھوٹی آبشاریں بن کر نیچے گلی میں گر رہا ہے۔ گلی میں ایک بھینس کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے۔ ایک کالا سا لڑکا کمبل سر پر اوڑھے اسے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ اس نے سر پہ بوریا رکھا ہوا ہے اور سینٹے سے بیلوں کو پیٹ رہا ہے۔ ہوا تیز ہو گئی ہے، سردی ہو گئی ہے اوہ، اس سردی اور بارش میں بڑی نہر کو جانے والی جنڈیالے کو جانے والی ایک پکی سڑک سامنے آ جاتی ہے۔ سڑک بارش میں دھندلی ہو رہی ہے۔ دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت ہوا اور بارش میں جھوم رہے ہیں اور مرجھائے ہوئے ملیالے پتے بڑی تیزی سے گر رہے ہیں۔ سامنے پیپل کے درخت تلے ناناک شاہی اینٹوں والی ایک پرانی حویلی کا بوسیدہ دروازہ ہے جس کا ایک پٹ بند ہے اور دوسرا غائب ہے۔ اندر صحن میں ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ ایک جگہ کھپریل کے چھپر کھٹ تلے دو تین بھینسیں بندھی ہیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بیل بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ پاس ہی ایک کسان آگ جلائے کھیس اوڑھے بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور اوپر چوبارے میں بڑی سی پلنگیں چارپائی پر چودھری جی کمبل میں لپٹے بیٹھے ہیں اور پٹواری سے نئی زمینوں میں پانی کی تقسیم پر بات چیت کر رہے ہیں۔ درمیان میں لوہے کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں اور کھڑکی بند ہے اور ہوا اور بارش کی بوچھاڑ بند کھڑکی سے سرپٹخ رہی ہے اور کیکر کے کالے کانٹے دار ننگے درخت سردی بارش اور پالے میں ٹھٹھر رہے ہیں .....

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی اور میں تیزی سے گرم چائے کے دو تین گھونٹ چڑھا جاتا۔ انور کہتی:

"روے پیارلی! زبان جل جائے گی۔"

نانی کہتی:

"وہ پیار ہی کیا جو زبان نہ جلائے ....."

انور کی نانی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ پیار ہی کیا جو زبان نہ جلا دے اور وہ محبت ہی کیا جو دل نہ جلا دے اور خون کے آنسو نہ رلائے اور دلیس دلیس کی در در کی خاک نہ چھنوائے ————!

عید، شب برات پر محلے میں خوب رونق ہوتی۔ صبح سویرے ہی چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں نئے نئے گوٹہ لگے رنگدار ریشمی کپڑے پہن کر گلی میں نکل آتیں فیصل مصور کا بڈیا جان اپنے مکان کے آگے تخت پوش بچھا کر اس پر سفید کھیس ڈالتا اور تانبے کے خوانوں میں گلاب دانیاں، کھلونے، نانودے کے پیالے اور پھولوں کے گلدستے سجانے لگتا۔ عنایتی حلوائی اپنی دکان کو چھت سے لے کر فرش تک رنگ برنگی مٹھائیوں کے تھالوں سے آراستہ کر دیتا۔ کاکا عمدو کی دکان کی سج دھج تو سب سے نرالی ہوتی تھی۔ دو روز پہلے ہی دکان کے آگے بڑی سی قنات کی چھاؤں کر دی جاتی۔ عید کے روز باہر بڑے تخت پوش پر لکڑی کی تختیاں اوپر سائبان تک لگا دی جاتیں اور ان پر سفید چاندنی بچھ جاتی۔ یہ بالکل سیڑھیاں سی بن جاتیں جن پر کہیں ورق لگے ارا روٹ بہار دے رہے ہوتے تو کہیں قیمے کے نان خطائے اور شیرمال، نمکین قتلمے اور کھانڈ قلمچے سج رہے ہوتے اور کہیں روغنی روٹیاں اور باقرخانیاں بجلی کی روشنی میں دعوتِ نظارہ دے رہی ہوتیں۔ کاکا عمدو بوسکی کا تہمد اور بوسکی کی سونے کے بٹنوں والی قمیص پہنے بڑی گرم جوشی کے عالم میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہا ہوتا۔ کبھی ملازموں کو ہدایات دیتا، کبھی گاہک سے بات کرتا اور کبھی بڑی نفاست سے پان منہ میں ڈال کر سر پر ہاتھ ملتا اور کبھی بیش قیمت سیوان کے کش لگاتا دکھائی دیتا۔ کاکا عمدو بڑا خرچیلا اور شوقین مزاج کشمیری خاندر وتھا۔ ناٹا قد، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، تیکھے نقش، چوڑے شانے، بھرا بھرا جسم، گورا چٹا رنگ۔ ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ بڑا خوش مزاج اور نمائش پسند تھا۔ جب ہنستا تو آنکھیں گالوں میں چھپ جاتیں اور سفید سفید ہموار دانت موتیوں کی طرح چمکا کرتے۔ ہر کام میں سب سے آگے ہوتا۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کا عادی تھا۔ محلے میں سے احراری لیڈر گذرے یا کانگریسی، لیگی یا نیلی پوش عمدو کاکا اپنی دکان کے

آگے کیلے کے پتوں اور جھنڈیوں سے سجا ہوا محرابی دروازہ ضرور لگائے گا اور اپنے کسی کاریگر کے ہاتھوں لیڈر کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کا ہار ضرور پہنائے گا۔ عالمگیر باجے والا خواہ کسی کی برات لے کر گذرے، عمدو کاکا کی دکان کے آگے ضرور سلامی دیتا اور کاکا عمدو کا کاریگر فوراً پانچ دس کا نوٹ لے کر اس کی طرف بڑھتا۔ ایک بار بازار میں سے سیف الدین کچلو کا جلوس گذرنا تھا۔ کاکا جی نے بڑا خوبصورت آرائشی دروازہ لگوایا، اور اس کے عین بیچ میں رومال میں بندھے ہوئے گلاب کے پھولوں کی پوٹلی لٹکا دی۔ جب کچلو وہاں سے گذرنے لگا تو کاکا جی نے فوراً کاریگر کو اشارہ کیا، اس نے رسی کھینچ دی۔ پوٹلی کھل گئی اور گلاب کے سرخ سرخ پھول ڈاکٹر کچلو کے اوپر برسنے لگے۔ لوگوں نے جوش میں آکر تالیاں پیٹیں اور "کچلو زندہ باد" "کاکا عمدو زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ کاکا جی کی خوشی کا بھلا کوئی ٹھکانا تھا۔ پھول کر کپا ہو رہے تھے۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی سلامی لے رہے تھے ——— آج ان کے مکان پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لوگ ان کے مکان کا ملبہ تک اٹھا کر لے گئے ہیں۔ دن کو وہاں ایک بھٹیارن دانے بھونتی ہے اور رات کو زرد آنکھوں والا الّو اپنی منحوس آواز میں پچھلے پہر تک بولتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کچلو زندہ باد! کاکا عمدو زندہ باد!

عید کی صبح کو منہ اندھیرے میں اور میرا چھوٹا بھائی قبرستان ضرور جاتے۔ ہم دونوں گھی منڈی والے دروازے سے نکل کر قبرستان کو جانے والی سڑک پر آتے تو پل کے پاس ہمیں گلاب کے پھول بیچنے والے ملتے۔ انہوں نے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگا رکھے ہوتے اور دو پیسے کے کتنے سارے پھول دے دیتے۔ ہم ایک آنے کے پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے اور سردی میں گرم چادریں اوڑھے قبرستان کی راہ لیتے۔ ٹھنڈ میں ہاتھ پیر ٹھٹھر رہے ہوتے اور منہ سے بات کرتے وقت بھاپ نکل رہی ہوتی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے صبح کے انتظار میں زرد ہو رہے ہوتے۔ چھوٹی سی سڑک کے دونوں جانب ہمیں فقیر بیٹھے ہوئے ملتے۔ ان کے پیچھے اناروں اور امرودوں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھا رہا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے قرآن کریم کے تلاوت کرنے کی ہلکی ہلکی پر اسرار آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر موم بتیاں جلا رہے ہوتے اور پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ عورتیں اپنے بچوں، بھائیوں، خاوندوں اور رشتہ داروں کے مزاروں پر بیٹھی تلاوت کلام پاک سے ان کی روحوں کو ثواب پہنچا رہی ہوتیں۔ یہ خیال کہ ان لوگوں نے خوشی کے دن بھی اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو نہیں بھلایا، دل کو بڑی تسکین دیتا اور انسانی بھلائی میں میرا یقین زیادہ مستحکم ہو جاتا۔ اسی قبرستان میں بسنتی پھولوں والا وہ درخت بھی تھا جس کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر انور نے مجھے بمبئی جاتے ہوئے اپنا ایک کنگن یادگار کے طور پر دیا تھا اور کہا تھا۔

"وہاں زیادہ دن نہ ٹھہرنا دوست!"

قبرستان سے واپس آتے تو دن نکل آیا ہوتا اور گلی میں بڑی رونق ہوتی۔ بچے نیلے پیلے غبارے ہاتھوں میں لئے بانس کے باجے بجا رہے ہوتے۔ جان کی دکان پر بچوں کا ہجوم کھلونے خرید رہا ہوتا۔ گاما ٹپ گر کے بھلے پکوڑیاں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہوتیں۔ عنایتی حلوائی اور کاکا عمدو کی دکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی ہوتیں اور لوگ بڑے شوق سے شیرمال، ارا روٹ اور مٹھائیاں خرید رہے ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری بچیاں بے احتیاطی سے چہروں پر پوڈر، سرخی تھوپے ریشمی رومالوں سے ڈھکی ہوئی سویوں کی تھالیاں لئے اپنے اپنے رشتہ داروں اور ہمسائیوں کے گھروں کو جا رہی ہوتیں۔ ہر شخص کے چہرے پر خوشی اور شادمانی کی چمک ہوتی اور بچے اپنی اپنی عیدیاں جیبوں میں ڈالے بنے ٹھنے گلی میں چکر لگا رہے ہوتے اور کبھی اس دکان سے غبارے خریدتے اور کبھی وہاں بیٹھ کر کھیر کھانے لگتے۔ یوں لگتا جیسے آج اس گلی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ ہر گھر میں سویاں ابل رہی ہوتیں، ہر گھر میں دو دو تین تین سالن چولہوں پر چڑھے ہوتے، ہر گھر سے سویوں کے ورق لگے تھال باہر نکل رہے ہوتے

ہر مکان میں مسرتوں کا قافلہ خیمہ زن ہوتا اور قہقہوں میں خیرات بانٹی جا رہی ہوتی۔

عید سے ایک دن پہلے کی رات میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ اسے حرفے کی رات کہا جاتا۔ وہ رات ہم تقریباً جاگ کر گذارتے۔ محلے بھر میں سبزی فروش، منیاری والے، گوشت والے اور درزیوں اور حجاموں کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتیں۔ درزیوں اور حجاموں کی دکانوں میں تو میلہ لگا ہوتا۔ سبزی فروش چراغ اڑائیں آلو اور مٹر تول تول کر دھڑا دھڑ بیچ رہا ہوتا۔ گوشت ایک سیر سے کم کسی کے گھر نہ جاتا۔ جیرے قصائی نے دکان کے باہر بکرے الٹے لٹکائے ہوتے اور کاریگر اندر گوشت کاٹ رہے ہوتے اور قیمہ بنا رہے ہوتے۔ حسن منیاری والے کی دکان پر بچے بچیاں اور نوکرانیاں اور نوکر ——— جرابیں، رومال، ربن، کلپ، چوڑیاں، پراندے، سرخی پاؤڈر، کریمیں اور بنیانیں وغیرہ خرید رہے ہوتے۔ درزیوں کی دکانوں کے دروازے بند ہوتے۔ اندر بتیاں جل رہی ہوتیں اور مشینیں گڑ گڑ کی آوازوں کے ساتھ چل رہی ہوتیں۔ لوگ بار بار آ کر تقاضا کر رہے ہوتے اور ماسٹر صاحب ہر ایک کو یہی جواب دیتے:

"بس جی عید کی نماز سے پہلے قمیص تیار ہے لیں۔"

لیکن آج اس محلے میں عید کی نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔ آج اس گلی میں کوئی درزی حرفے کی رات کو مشین لے کر صبح ہونے تک نہیں بیٹھتا۔ آج اس گلی پر کسی ٹیلر ماسٹر کی بجھی ہوئی استری کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گہری، شدید اور ان مٹ اداسی، بیوگی اور بے کسی کی راکھ اڑ رہی ہے۔ آج یہ کسی عید، کسی شب برات نہیں مسکراتی، کسی سے ہنس کر بات نہیں کرتی ——— اپنے فرش پر چلنے والوں کو ایک افسردہ بیگانگی سے دیکھتی ہے اور مکانوں کی تاریک ڈیوڑھی میں سر رکھ کر رات رات بھر آہیں بھرا کرتی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہے، آنکھیں بے نور ہیں، چہرہ فق ہے، ہونٹ اندر کو کھنچ گئے ہیں اور چھاتی کا فرش چھلنی ہو رہا ہے اور اپنی گندی نالیوں کے بے جان بازو پھیلائے یہ اس پھول کی یاد دلا رہی ہے جو کسی کے جنازے میں سے سڑک پر گر پڑا ہو اور وہیں پڑے پڑے مرجھا کر سوکھ گیا ہو، جیسے لحد نے بھی اپنی آغوش میں پناہ نہ دی ہو، جیسے موت نے بھی اپنے دامن سے جھٹک دیا ہو ——— کبھی اس کے ہاتھوں میں حنا کا رنگ تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور دروازوں کے پٹ نیم وا ہوتے تھے اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں سے موتیے کی خوشبو اڑاتی، برقعوں میں لپٹی ہوئی جھکی جھکی شرمیلی نگاہوں والی لڑکیاں گذرا کرتی تھیں۔ لیکن آج اس کے ہر مکان کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور پرنالے گر پڑے ہیں اور ممٹیاں ڈھے گئی ہیں اور ہر کھڑکی ننگی ہے، ہر دروازہ چوپٹ کھلا ہے اور ہر گھر دہلیز سے لے کر پچھلے کمرے تک عریاں دکھائی دیتا ہے۔ اس بے حیا طوائف کی طرح جو سب کے سامنے ننگی نہا رہی ہو اور ہر نکلے پر نیم عریاں عورتیں میلے کپڑے دھوتی ملتی ہیں اور ان کے ننگے بچے نالیوں پر گندگی سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔

تینوں تُشفنا ہو جان گیاں

بابل دیاں گلیاں نی

بہ گیبت مدت ہوئی میں نے امرت سر میں سُنا تھا۔ سردیوں کے دن تھے، دسمبر گذر رہا تھا۔ آسمان پر بھورے بھورے سرد بادل چھا رہے تھے۔ میں صبح کی سیر سے ٹھٹھرتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں شبنم سے لدے ہوئے گلاب کے دو تین پھول تھے۔ بٹالہ جانیوالی ریلوے لائن کی بائیں جانب ایک چھوٹا سا نالہ آلوچے کے باغ کے ساتھ ساتھ کمپنی باغ کو جاتا تھا۔ اس نالے کی ایک طرف چھوٹا سا صاف ستھرا گاؤں تھا دس بیس چکنی مٹی سے لپے ہوئے کچے کوٹھے ہوتے تھے۔ سفید سفید دودھیا میناروں اور گنبد والی ایک مسجد بھی تھی جس کے صحن میں جامن کا پیڑ اگا تھا۔ میرا معمول تھا کہ واپسی پر اس گاؤں میں سے ضرور گذرتا۔ مجھے ان کوٹھوں کی سادگی اور مسجد کے میناروں کا اُجلا پن بڑا پیارا لگتا تھا۔ اس دن جب میں

یہاں سے گذرنے لگا تو مجھے کہیں قریب ہی سے لڑکیوں کے مل کر گانے کی آواز سنائی دی۔ میں وہاں رک گیا۔ ایک مکان کے آنگن میں پیپل کے درخت تلے کچھ دیہاتی لڑکیاں تالی بجاتی گا رہی تھیں :

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

تجھے بابل کی گلیاں
خواب ہو جائیں گی

او دلہن!

وہاں کسی لڑکی کی شادی تھی۔ صبح کا سماں، سردی، ہوا، بھورے بھورے بادل، سفید سفید دیہاتی کوٹھے، کھلا آنگن، جھڑے ہوئے پتوں والا ٹنڈ منڈ پیپل کا درخت اور لڑکیوں کی دردناک آوازیں ——— میرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کی آنکھیں بھر آئیں اور میں نے ان کی پلکیں چوم لیں اور دل پر ہاتھ رکھے نہر کی پٹری پٹری چل پڑا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بابل کی گلیاں واقعی ایک دن سپنا بن جائیں گی اور پھر کبھی ان کی زیارت نصیب نہ ہو گی تو میں بھاگ کر ان لڑکیوں کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیتا اور کہتا۔ پیپل تلے جدائی کے گیت گانے والی بچیو! اپنے گھروں میں چھپ جاؤ۔ ایک دن یہ گلیاں ہی نہیں، تمہارے بابل بھی تمہیں سپنا ہو جائیں گے اور پھر کسی گھر کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر خوب رونا۔ ساری عمر کے آنسو ایک ہی دن میں ختم کر دینا۔ کیا خبر تھی وہ دن بھی آئیں گے جب غم کے پیالے میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپک سکے گا۔ تمام درخت اجنبی اور ساری گلیاں ویران ہو جائیں گی۔ کوئی ہمیں نہ پہچانے گا، کوئی بانہیں پھیلا کر ہمیں اپنی طرف نہ بلائے گا۔ میں ان گلیوں میں کبھی چاند کے ساتھ سوتا اور سورج کے ساتھ بیدار ہوتا تھا۔ مگر آج اس نگری پر چمکنے والے نے مجھے بلایا اور نہ طلوع ہوتے ہوئے سورج نے آنکھ ملائی۔ جن پر بھروسہ تھا، مان تھا، ناز تھا، وہ اکیلا چھوڑ کر چل دئے۔ اکتارے والا فقیر سچا تھا۔ وہ پیپل تلے گانے والی لڑکیاں بھی سچ کہتی تھیں۔ جانے اب وہ کہاں ہوں گی۔ جانے اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے والیوں کو خود بھی دلہن بننا نصیب ہوا ہو گا یا نہیں۔ کیا خبر ان میں سے کتنی پاکستان پہنچ سکی ہوں گی اور کتنی ضلع جالندھر یا ضلع امرت سر میں نیم کے درخت تلے چارپائی پر بیٹھیں روڑ سنگھ یا کشمیرا سنگھ کے بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں گی ؛

امرت سر! امرت سر! یہ تو نے ہم سے کس جنم کا بدلہ لیا رے ؟

رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت جگانے والوں کی ٹولیاں آیا کرتیں۔ گلی کے موڑ پر نعت گانے کی آواز سنائی دیتی تو میں لحاف میں سے نکل کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا۔ باورچی خانے میں امی پراٹھے بنا رہی ہوتیں اور آپا چائے کا پانی گرم کر رہی ہوتی۔ امی مجھے دہی لانے کے لئے بھیج دیتیں۔ میں برتن ہاتھ میں لئے گلی میں نکل آتا اور ڈھول یا کنستر بجا بجا کر گانے والوں کے قریب کھڑا ہو کر انہیں بڑے شوق سے دیکھا کرتا۔ یہ احساس کہ تمام گلی جاگ رہی ہے، ہر گھر میں کچھ نہ کچھ پکایا جا رہا ہے، میرے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دیتا اور میں خوشی خوشی حلوائی کی دکان کی طرف چل پڑتا۔ کسی گھر سے لکڑیوں کے ٹوٹنے، کہیں سے برتنوں کو دھونے اور کہیں سے دہی بلونے کی زندگی بخش آوازیں آ رہی ہوتیں۔ گاہک گر دکان کا

ایک پٹ کھولے حقے کے لیے آگ بنا رہا ہوتا۔ تنادر و کے تنور میں آگ کے شعلے چھت کو چھو رہے ہوتے۔ انور کے مکان میں بھی اوپر والی منزل میں روشنی ہو رہی ہوتی۔ آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا ہوتا اور تاروں کی چمک دمک آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی ہوتی۔ کھڑکیاں انور کے مکان کی مٹی کے اوپر آگئی ہوتیں۔ سحری کھا کر میں اور میرا چھوٹا بھائی ——— ہم دونوں دیواروں پہ لگے ہوئے فلمی اشتہار اتارنے نکل جاتے۔ ہم ان اشتہاروں کو بڑی جانفشانی سے دیواروں، درختوں اور بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر اتارتے اور پھر گھر آ کر ان میں سے مس سلوچنا، مادھوری اور مس کجن کی تصویریں کاٹ کر الگ رکھ لیتے جس روز اشتہاروں کا پروگرام نہ ہوتا اس روز ہم کمپنی باغ میں سیر گشت کرنے آ جاتے۔ یہاں ہمیں ہمارے دوسرے ساتھی بھی مل جاتے اور ہم گراؤنڈ والے مشہور درخت پر جٹ برمن کا کھیل کھیلتے۔ جب تھک جاتے تو حوض کے فوارے کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیتے اور پھر روزہ ٹوٹ جانے پر خدا سے معافیاں مانگنا شروع کر دیتے۔ لالہ ہمارا ایک یار ہوا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے بول اٹھتا:

"بھول کر کھا پینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

یہ لالہ بڑا شیطان کی ٹوٹی تھا۔ ایک روز میرے منہ میں اسٹاک شو کا سگریٹ رکھ کر سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا:

"میں نے مولوی سے پوچھ لیا ہے۔ سگریٹ پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔"

عید میلاد النبیؐ کے دن جو جلوس ہماری گلی سے نکلتا اس کا جھنڈا میرے سپرد ہوتا۔ میں صبح صبح ہی سرخ ہلالی پرچم لے کر گلی کے وسط میں آن کھڑا ہوتا۔ دوسرے لڑکے ہمیشہ مجھے رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارا جلوس محلے سے نکل کر انجمن پارک میں جا کر شہر کے دوسرے جلوسوں کے ساتھ مل جاتا اور پھر تمام جلوس ایک قافلے کی صورت میں سنتری باغ کی طرف روانہ ہو جاتے جہاں شام کو دال اور نان بٹتے اور ایک زبردست جلسہ ہوتا تھا۔

ہمارے مکان میں آنگن والی دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور زمین پر دیوار کے ساتھ ساتھ نیازبو، موتیا اور رتن جوت کے گملے بہار دیا کرتے۔ دادا جان ان پودوں کی بڑی خبر گیری کیا کرتے۔ وہ ان کے پاس دری کے ایک پرانے ٹکڑے پر مہاتما بدھ کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھے رہتے اور پھول پتوں کو چڑیوں کی نوک تعبنا ک سے بچایا کرتے۔ کبھی موج میں آ کر سی حرفی ہدایت اللہ کے بیت گنگنانے لگتے۔ اتوار کو وہ ہمیں ساتھ لے کر ریلوے لائن کے پار باہمی پریہ کوٹ جاتے۔ خود ہنسلی پر دری بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہم کھیتوں میں پتنگ اڑاتے اور ہرے ہرے بسنتی اور سرخ پتے جمع کیا کرتے۔ جو پتے درختوں پر سے ٹوٹ کر دادا جان کے پاس گرتے انہیں وہ بھی سنبھال کر رکھ لیتے اور جب ہم کھیل کود سے واپس آتے تو ہم تینوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیتے۔ وہ بڑے سنس مکھ اور درویش منش تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی بات پر رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے۔ چائے کے بڑے رسیا تھے اور اسے بالکل بچوں ایسی دلچسپی اور شوق سے پیتے۔ خالی پیالی بڑے آرام سے زمین پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے سفید مونچھوں کو پونچھتے اور کہتے:

"واہ بھئی! روح خوش کر دیا۔"

ایک رات سردیوں میں بڑی بارش ہوئی۔ میں کمرے میں لیمپ کی روشنی میں بیٹھا میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ دادا جان بہت قریب ہی چارپائی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بارش کا کپکپی طاری کر دینے والا پر اسرار شور سنائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بارش آہستہ ہو گئی اور پھر بالکل بند ہو گئی۔ میں نے کتاب بند کی اور اٹھ کر باہر دالان میں آ گیا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ غسل خانے کے چھپر پر سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپا ٹپ گر رہا تھا۔ گلی کے پرنالے ابھی تک بہہ رہے تھے۔ آنگن کا فرش دھل گیا تھا۔ سامنے

انور کا مکان بارش کے بعد اندھیرے اور پالے میں ٹھٹھر رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے دیکھا انور اپنی چارپائی پر لحاف میں گرم ہو کر سو رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر ہے، دوسرا گال کے نیچے ہے اور آنکھیں بند ہیں اور سوتے ہوئے گرم کنوارے بدن میں سے ہلکی ہلکی خوشبو دار آنچ سی اٹھ رہی ہے۔ اتنے میں اندر سے دادا جان کے گانے کی آواز آئی :

نکیاں نکیاں پون پھہاراں
اکناں دیاں نے موج بہاراں
جندرے پل پل بھٹی جاناں
بھٹی جاناں ہو
ہری پور نور پور ٹھنڈیاں چھاواں
پل پل بھٹی جاناں ہو

سرد بادلوں میں لپٹی ہوئی مرطوب سیاہ رات، سناٹا، سائبانوں پر سے پانی کے قطروں کے گرنے کی ٹپ ٹپ، سنسان گلی، خاموش اونگھتے مکانوں کے گرم کمرے اور ان کمروں میں دلہنوں کے دھڑکتے سانسوں کی مہک اور بکنیٹی کے لیمپوں کی دھندلی روشنی میں چمکتا ہوا گلی کا فرش ——— میرے دل کو جیسے کسی نے اپنی پُرسکون گرم چھاتی سے لگا لیا اور میرے ہونٹ کسی درد انگیز خوشی اور ایک بے نام سے ان جانے غم اور دور دراز کی کسی اجنبی سوچوں کے زیرِ اثر کپکپانے لگے۔ وہ ہری پور نور پور کہاں ہیں جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہے اور جہاں آم کی ٹہنیوں پر وساکھ میں میٹھا رس ٹپکتا ہے اور بسنتی رنگ کے پھولوں کے کھیت ہیں اور بانسوں کے جھنڈ اور گیندے اور چنبیلی کی شاخیں ہاتھ کے اشاروں سے اپنی طرف بلاتی ہیں؟ کیا پھر کبھی ان جنگلوں میں ہم صحرا نوردوں کا گذر نہ ہوگا؟ کیا پھر کبھی راتوں کو بارش نہ ہوگی؟ کیا پھر کبھی دن روشن نہ ہوں گے؟

آج اتنے سالوں کے بعد جب پرانی یادوں کے دھندلے سمندروں میں کھوئے ہوئے موتیوں کی تلاش میں نکلا ہوں تو میری آنکھیں بند ہیں اور ان پر جھکی ہوئی پلکیں چنار کی خشک پتیوں کی طرح کانپ رہی ہیں جو خزاں کی بارش میں اپنی ڈالیوں سے لپٹ گئی ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی دکھی عورت گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں جا کر اپنے جہیز کا صندوق کھولے، اپنا شادی کا پرانا عروسی جوڑا نکال کر اسے حسرت ناک نگاہوں سے دیکھے اور پھر اس میں منہ چھپا کر جی بھر کر روئے ——— کہاں چھپ گئے وہ حنا کی خوشبو میں بسے ہوئے، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے پھولوں کی سیج پر سوئے ہوئے، چمکتے، دمکتے، روشن اور پُرمسرت دن؟ جب خاوند کی بانہیں گلے میں حمائل ہوتی تھیں، ساس اٹھتے بیٹھتے بلائیں لیتی تھی اور نندیں آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں ——— وقت کی بھٹی نے ان بھڑکیلے اگر مجوش رنگوں کی ساری چمک، ساری آنچ اپنے اندر جذب کر لی ہے اور راکھ زندگی کے دامن میں پھینک دی ہے۔ اب وہ پہلی سی کوئی بات باقی نہیں۔ اب ساس صبح شام پاؤں دبواتی ہے اور نندیں خوشامدیں کرواتی ہیں اور خاوند ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتا ہے اور بچے روتے ہیں، چلاتے ہیں اور اس کی بوٹیاں نوچتے ہیں۔

ہے بھگوان! اے رب العالمین! اے خدا!!

کیا پھولوں کا منہ چوم کر گذر نے والے جھونکے اب کبھی اس گلی سے نہ گذریں گے؟ کیا ٹوٹ کر گرا ہوا پتا اب کبھی اپنی ڈالی پر واپس نہ جا سکے گا؟ کیا اب بید رد آندھیوں کے جھکڑ اسے تپتے ہوئے اجڑے ہوئے بھرے میدانوں میں اڑاتے پھریں گے؟ او پہاڑوں پر چپ چاپ گرنے والی برف! وادیوں میں اترتے سمے تیرے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟ کیا تجھے بنفشہ کے ان بسنتی شگوفوں کا خیال آ جاتا ہے جنہیں تو گلمرگ کی ڈھلوانوں

دفن کر آئی ہے یا ان پردیسیوں کی یاد آ جاتی ہے جو تیری اندھیری گھاٹیوں میں لاپتہ ہو گئے؟ تو جب پہاڑوں کی بلندیوں پر گری تو برف کی پاکیزہ کلی تھی اور جب ہماری گلیوں میں آئی تو آنسوؤں کی جھڑی تھی۔ تو پھول بن کر کوہساروں پر گرتی اور آنسو بن کر ہمارے آنگن میں ڈھلک آتی۔ کیا تجھے خبر تھی کہ ایک دن ہم اپنے گھروں کے صحن سونے کر جائیں گے، اپنی گلیوں سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر جائیں گے اور اپنے مکانوں کی سیڑھیوں، ڈیوڑھیوں، دروازوں اور کھڑکیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو جائیں گے؟ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ ہم ساری زندگی ایک ہی دن میں اپنے وطن کی گلیوں میں بسر کر دیتے۔ ہم ہر صبح کا استقبال دونوں بازو پھیلا کر کرتے اور ہر رات کو ایک لاکھ مرتبہ چوم کر رخصت کرتے۔ ہم گرمیوں کی اداس دوپہروں کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور چاندنی راتوں کو اپنی آنکھوں میں بٹھلاتے۔ ہم غروب ہوتے وقت بھی سورج کا ساتھ نہ چھوڑتے اور اس کی سمٹتی ہوئی قرمزی کرنوں کی جھالر تھام کر مغرب کی لالہ زار وادیوں میں اتر جاتے اور صبحدم اس کی پہلی کرن کے ساتھ زرتار موتیوں کا ہار پہنے طلوع ہوتے اور شبنم کے آنسو بن کر پھول پھول پر، کلی کلی پر، کانٹے کانٹے پر گرتے۔ لیکن تو نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ بس روتی ہی رہی، گرتی ہی رہی۔ جب بھی ہمارے گھر آئی روتی ہوئی آئی اور آنسو پونچھتی واپس گئی۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں غلطی سے کمپنی باغ والی نہر میں انور کے اوپر کود پڑا تھا۔ اگر مجھے اس ہمیشہ کی جدائی کی اس وقت خبر ہوتی تو میں نہر سے پھر کبھی باہر سر نہ نکالتا۔ نہر میں نہاتی ہوئی انور کے نیم عریاں، ٹھنڈے اور گرم جسم پر گرنا جنت اور دوزخ میں بیک وقت چھلانگ لگانا تھا۔ میں اس پھول، خوشبو اور شبنم کی پھوار اڑاتے شعلوں کی چتا پر سے پھر کبھی نہ اٹھتا بلکہ ان خواب انگیز یادوں کے ساتھ ہی ستی ہو جاتا، اسی طرح ان صندلیں شعلوں سے لپٹ کر سو جاتا اور جب سردیوں کی کسی نیلی سیاہ رات کو نہر کا پانی خشک ہوتا تو لوگ دیکھتے کہ جہاں میں گرا تھا وہاں موتیے کی ایک سفید کلی مسکرا رہی ہے۔

لیکن تو نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تیرے ہونٹ منجمد رہے اور زبان پر تالا پڑا رہا۔ پہاڑوں کی سنگدل برف! تیرا خون کس قدر سفید ہے! تو نے ہمیں خون کے آنسو رلایا ہے۔ تو بھی عمر بھر روتی رہے گی۔ کبھی ترائی کی چٹانوں پر اور کبھی دامن کوہ کے غاروں میں منہ چھپا کر ——— ہم نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں لیکن تیرے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ او کور چشم سرد مہر برف!

چھہرٹہ پیچھے رہ گیا تھا۔

اور اب ہماری بس تیلی گھر کی آبادی میں سے گذر رہی تھی۔ چوک میں اسی طرح گنے بک رہے تھے اور آرڈیننس ڈپو کے باہر دروازے پر سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ دیواروں پر جا بجا فلموں کے اشتہار چسپاں تھے۔ اب رنگو برج سامنے نظر آنے لگا۔ ایک سکھ لڑکا پل کے جنگلے پر جھکا نیچے شنٹ کرتی ریل گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس پل پر آ کر ریل گاڑیوں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اسٹیشن آ گیا ——— امرتسر سٹیشن ——— میں ایک ایک درخت، ایک ایک عمارت، ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب کچھ وہ نہیں تھا۔ سب چیزیں ویسی تھیں لیکن ایک بھی چیز ویسی نہ تھی۔ پرنس ہوٹل، سٹیشن کی ڈیوڑھی، تانگوں کا اڈہ، سامنے والی سرائے، پیپل کا گھنا درخت، گھوڑوں کی لید، مزدوروں کا شور، بالکل وہی، بالکل وہی ——— بالکل مختلف، بالکل مختلف ——— وہی ہاتھ، وہی پاؤں، وہی ماتھا، وہی بال، وہی آنکھیں ——— مگر آواز نہیں، حرکت نہیں، چہرے پر چمک نہیں، آنکھوں میں نور نہیں۔ باغ والی مسجد کے مینار کالے پڑ گئے ہیں اور گنبد کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور ایک طرف دراڑیں نمودار ہو گئی ہیں اور اس دم توڑتی ہوئی نیلی لاش کے ہونٹ کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ کہنے کے لئے ہل رہے ہیں لیکن آواز نہیں، صدا نہیں، زندگی نہیں، حرارت نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں ———!

بس سڑک کنارے سائبان تلے رُک گئی۔ گوالیاری حامن والی نے گھوم کر اپنے میاں کو دیکھا۔ میاں نے ہاتھ سے اترنے کا اشارہ کیا سب لوگ نیچے اترنے لگے۔ کیلے بیچنے والے یہاں بھی آ گئے۔

"ہری چھیل مہاراج! پیسے ہندوستانی یا پاکستانی۔۔۔۔"

اور یہاں بھی لوگوں نے سب سے پہلے کیلے کھائے اور پھر سامان اتروایا۔ بیگم صاحبہ نے یہاں بھی اپنے بچوں کی فوج میں کیلوں کا راشن تقسیم کیا اور خود ایک کیلا چھیل کر اسے برقعے کے اندر کھانے لگیں۔

رکشا والا بھاگ کر میرے پاس آ گیا۔

"رکشا بابو جی!"

نہیں بھائی۔ ہم ایک مدت بعد اپنے وطن کے روضے کی زیارت کو آئے ہیں۔ ہم اس کی گلیوں میں پیدل چلیں گے۔ میں نے سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پیدل ہال بازار کی طرف چل پڑا۔ وہی سڑک تھی، اسی طرح دو رویہ پیپل کے درخت کھڑے تھے اور ان کے نیچے اکھڑے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کچیلے چھابڑی فروش، ریوڑیاں، چنے اور بھنے مکوڑیاں بیچنے والے بیٹھے مکھیاں اڑا رہے تھے۔ سیڑھیوں والے پل کی پہلی سیڑھی ایک طرف سے اسی طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ دوسرا بڑا پل آ گیا۔ ڈھلان پر بائیں جانب کبھی ہرا بھرا باغ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ باغ اُجڑ گیا تھا اور اس کے نواح میں خشک اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ انجمن پارک میں میوہ منڈی بن گئی تھی۔ یہاں ہم سردیوں میں کرکٹ میچ اور گرمیوں میں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ اب بوسیدہ، جھکے ہوئے پرانے کھوکھوں کی قطاریں کبوتروں کی کابکوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ بدرروؤں میں گندگی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ہال گیٹ کی گھڑی ویسے ہی تھی۔ صرف نیچے جہاں فوارے ہوا کرتے تھے اب وہاں جنسی اور جاسوسی کتابوں کی ڈرہنسا دکانیں تھیں۔ دروازے میں سے ہندو سکھ عورتیں اور مرد آ جا رہے تھے۔ ہر مرد عورت اور لڑکی کا چہرہ ایک ہی جیسا زرد بے جان اور سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ ہال بازار بہت جلدی آ گیا تھا اور پہلے سے تنگ اور بجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میری نظر اسے دیکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ وقت اور فاصلہ سمٹ گیا تھا اور میں آٹھ سال پہلے کے امرتسر کو آٹھ سال بعد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھوا کر جب رجسٹر پر پاسپورٹ کا نمبر درج کروانے لگا تو دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ میں اتنا اجنبی اور ناواقف اور بے یار اپنے وطن میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر بازاروں کی سرگشت کرنے نیچے اتر آیا۔

مسجد خیرالدین میں جھانک کر دیکھا۔ حوض میں گھاس اُگ رہی تھی اور صحن میں دو لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ چوک گول ہٹی آ گیا دکانیں روشنیوں کے باوجود ویران، اندھیری اور اجڑی اجڑی تھیں۔ مسجد جان محمد کے ایک مینار پر پیپل کی شاخ اُگ آئی تھی۔ یہ ہمارا محلہ تھا۔ اس مسجد کی ٹونٹیوں سے پانی پی کر کئی بار میں نے روزہ توڑا تھا۔ اب اس کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور غسل خانوں کی چھتیں ڈھے گئی تھیں اور حجرے میں دیا جل رہا تھا اور دو تین گندے کپڑوں والے کشمیری ہاتو بیٹھے چاول پکا رہے تھے۔ کوتوالی کی ٹریڈل ڈیوڑھی کے باہر کمیٹی کے لیمپ تلے ایک جوتشی مہاراج بیٹھے تھے اور ایک بوڑھے لالے کا ہاتھ دیکھ کر کہہ رہے تھے:

"بس تھوڑا ہی کشٹ رہ گیا ہے لالہ جی ——— !"

میونسپل لائبریری کے سامنے والے باغ میں کمیٹی کا دفتر بن گیا تھا جہاں اب زرد رنگ کے پتھروں والی سرکاری پیشاب گاہ تھی۔ وہاں پہلے فاصلے کے چھوٹے چھوٹے درخت ہوا کرتے تھے اور بڑھ کا ایک گھنا پیڑ ہوتا تھا جس کی چھاؤں میں پرانی قسم کا ایک بڑا سا بنچ بچھا

رہتا تھا۔ میں گرمیوں کی جھلسا دینے والی لمبی دوپہروں میں کبھی کبھی دادا جان کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ دادا جان بنچ پر بیٹھے اونگھا کرتے اور میں جھڑ کے گرے پڑے پتے جمع کیا کرتا۔ کبھی کوئی بھولی چڑیا دادا جان کے کندھے پر آ کر بیٹھ جاتی تو میں خوشی سے چیخنے لگتا:

"دادا جان! پکڑ لیں۔ پکڑ لیں . . ."

لیکن اب وہاں کوئی درخت اور کوئی بنچ نہ تھا اور کوئی بھولی چڑیا کسی کے کندھے پر آ کر نہ بیٹھتی تھی۔ یہاں سے میں واپس ہوٹل آ گیا میں اپنی گلی کی زیارت صبح کرنا چاہتا تھا جب سورج طلوع ہو چکا ہو اور مکانوں کی منڈیروں پر سنہری دھوپ چمک رہی ہو۔ رات کو چترا ٹاکیز میں فلم "دیوداس" دیکھنے گیا۔ کبھی اس سنیما کا نام پول ٹاکیز تھا اور یہاں نور دین نامی ایک گیٹ کیپر ہوا کرتا تھا۔ نور دین ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ میں دوسرے تیسرے شام کو اس کی روٹی لے کر سنیما جایا کرتا تھا اور اس بہانے فلم دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کس طرح میں شام ہوتے ہی نور دین کے گھر جا کر اس کی بیوی کے پاس بیٹھ جاتا جو روٹی پکا رہی ہوتی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر اندر آ گیا۔ ہال میں رش بالکل نہیں تھا لیکن جھاڑی والوں نے چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ فلم ختم ہوئی تو میں رکشے میں بیٹھ کر ریالٹو سنیما کی طرف چل پڑا۔ بہت عرصہ گذرا جب یہ سنیما بن رہا تھا تو ہم چھوٹے چھوٹے تھے اور سکول سے بھاگ کر اس کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ رکشا الیگزنڈرا پارک کے قریب سے گذر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں گراؤنڈ کے کناروں والے آم کے درخت زیادہ گنجان دکھائی دے رہے تھے۔ منگو پارک میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس پارک میں دادا جان کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ کھلی ہوتی۔ پارک میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ لنچ کے وقفے میں ہم مالٹے، سنگترے اور مرلیاں کھاتے، پھول توڑتے اور خوب اودھم مچاتے۔ میں نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا اور پارک میں دیکھا کہ دھوپ چمک رہی ہے۔ منگو پارک کے آم کے درخت ہوا میں جھوم رہے ہیں اور ایک لڑکا سر پر کاغذ کی بناوٹی ٹوپی رکھے سوکھی ہوئی نہر کے پل پر بیٹھا مولی کھا رہا ہے اور میچ زور شور سے ہو رہا ہے اور لوگ اچھل رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں اور ایک آدمی گراؤنڈ میں بلا لئے ادھر ادھر بھاگ رہا ہے اور پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا اور منگو پارک نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دور ہو گیا، بہت دور ہو گیا۔

ریالٹو سے ایک بجے رات واپس آیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔

پچھلے پہر آنکھ کھل گئی اور غیر شعوری طور پر اذان کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک خیال آیا کہ امرتسر میں اذان نہیں ہوتی۔ یوں لگا جیسے ایک غیر ملک میں ہوں جہاں کی بول چال اور رسم و رواج سے بالکل ناواقف ہوں۔ بتی جلا کر گھڑی دیکھی، ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بستر سے اٹھا سفید بوٹ پہنا، مفلر اوڑھا اور سیر کرنے، پرانے مندروں کے درشن کرنے چل پڑا۔ آسمان پر ستارے کانپ رہے تھے۔ سردی بہت ہو گئی تھی اور گلیاں بازار بالکل سنسان تھے۔ امرتسر بڑا اکیلا اکیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے بازار میں سے گذر کر جب گلی کے سامنے آیا تو دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہیں ——— ابھی نہیں! میرے دل! میرے دل!!

گلی کا دروازہ اکھڑ گیا تھا اور بجلی کے دونوں کھمبے آمنے سامنے ویسے ہی کھڑے تھے۔ پچھلے پہر کے دم توڑتے پھیکے کافوری دھندلکے میں دونوں جانب اونچے نیچے مٹیالے ٹیڑھے خاموش مکان یوں لگ رہے تھے جیسے افسردہ دل لوگ سر جھکائے کسی جنازے کے گذرنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ خشک ہوا کا ایک دکھ بھرا جھونکا سرد آہ بھرتا ہوا میرے پاؤں چھو کر گذر گیا۔ میں اپنی گلی میں داخل نہ ہو سکا بلکہ عقبی بازار میں سے گذرتا شہر سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر مشرق کی جانب پو پھٹ رہی تھی اور آسمان پر ستارے بالکل پہلے کی طرح صبح کے ابھرتے ہوئے نورانی اجالوں میں بھڑک بھڑک کر ماند پڑتے جا رہے تھے۔ سرد ہوا میں اسی طرح درختوں اور سبزے کی تازگی اور کھلی فضا کا شگفتہ پن تھا۔ یہی وہ ہوا تھی ——— ہاں

یہی وہ ہوا تھی جو جیٹھ بیساکھ کی صبحوں کو منہ اندھیرے اور چنبیلی کی ٹھنڈی میٹھی خوشبو اڑاتی مجھے جگانے ہمارے گھر آیا کرتی تھی، جو میرے کانوں کے ہونٹ چوم کر سرگوشیوں میں کہا کرتی تھی۔ جاگو! جاگو میرے پیارے! شہتوت کے گھنیرے پیڑوں میں سوئی ہوئی چڑیاں جاگ اٹھی ہیں۔ شہد کی مکھیاں میٹھی گنگناہٹ کے ساتھ رس کی تلاش میں اپنے اپنے چھتوں سے اڑ گئی ہیں اور لیموں کے پھولوں سے لدے ہوئے درختوں تلے کچی پگڈنڈیوں کے کناروں پر اگا ہوا گھاس صبح کی شبنمی ہوا میں لہرانے لگا ہے۔ تم بھی جاگو! صبح ہو گئی ہے، ہمیں درختوں، پھولوں، چڑیوں اور پگڈنڈیوں نے تجھے بلانے بھیجا ہے ——
اور میں اس مہکیلی ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ ساتھ اڑتا ہوا ان باغوں، کھیتوں اور کھلے میدانوں میں آ جاتا تھا۔

میں آج بھی انہی میدانوں، کھیتوں اور باغوں کی طرف جا رہا تھا لیکن آج مجھے کوئی ہوا کا جھونکا جگانے نہیں آیا تھا۔ آج کسی چنبیلی کی خوشبو نے میرا منہ چوم کر مجھے نہیں اٹھایا تھا۔ بلکہ آج میں اپنے آپ ہی ہوٹل میں بسر کی ہوئی پردیسی رات کے ناواقف بستر پر سے اٹھ کر اس طرف نکل آیا تھا۔ ویرکے والے پھاٹک کے پاس پہنچ کر مشرق میں صبح کا سنہری اجالا جھلملانے لگا اور تاروں کے فانوس ایک ایک کر کے بجھنے لگے۔ بٹالہ جانے والی ریلوے لائن اسی طرح بچھی ہوئی تھی۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور جب اس نالے پر آیا جس کے ایک طرف چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ گاؤں اب بھی وہاں موجود ہے لیکن وہ پیپل کا درخت غائب ہے جس کے نیچے ایک رات دیہاتی لڑکیوں نے پُردرد گیت گایا تھا اور دلہن کو مخاطب کر کے کہا تھا:

تجھے بابل کی گلیاں سپنا ہو جائیں گی
او شرمیلی دلہن!

جامن کے درختوں میں سے بلند ہوتے ہوئے کائی زدہ مسجد کے مینار دھوئیں کے ستون معلوم ہو رہے تھے۔ سامنے محراب پر لگی ہوئی پاتھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ بعض کوٹھوں پر جنگلی گھاس اُگ رہی تھی اور جو ڈھے گئے تھے ان کے ملبوں پر گندگی کے ڈھیروں پر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہر مکان کی پیشانی پر لال کھریا مٹی سے "اوم" لکھا تھا۔ دوسری جانب جہاں کبھی آلوچے کے باغ ہوا کرتے تھے اب وہاں خانہ بدوش سانسیوں نے اپنے میلے کچیلے پھٹے ہوئے خیمے گاڑ رکھے تھے۔ خیموں کے اوپر کہرا جم رہا تھا۔ ایک جگہ ایک عورت جھاڑو دے رہی تھی اور قریب ہی کوئی کتا بھونک رہا تھا۔ بستی کی جانب ایک مرغ نے اذان دی۔ جی خوش ہوا کہ مرغوں نے ابھی تک اذانیں دینا بند نہیں کیں۔ میں نے ایک کوٹھے کی کچی دیوار میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ آنگن صبح کی سردی میں سکڑ گیا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکشا ٹھٹھر رہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر لال مٹی سے "برچھا سنگھ سردار" لکھا تھا۔ ایک گلہری پھدک کر میرے پاس آئی اور اپنی تھوتھنی اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

کیوں ری گلہری! اس مکان میں جو وہ کھدر کی چادر اوڑھ کر اپنے خاوند کی روٹی اور لسی کھیتوں میں لے جانے والی رہا کرتی تھی وہ کہاں چلی گئی ہے؟ گلہری نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پردیسی! اس عورت کو میں نے ان کھیتوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا دوپٹہ سر سے گرا ہوا تھا اور چہرے پر موت ایسی زردی تھی اور قمیص جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی اور اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے زمین سے ایک سوکھا ہوا پتا اٹھا کر دیوار پر رکھا اور آگے چل پڑا۔

ندی کے دوسرے چھوٹے پل پر آیا تو مشرق کی جانب صبح کی روشنی تیزی سے بڑھنے، پھیلنے لگی اور آسمان پر سورج کی اولیں گلابی کرنوں کا غبار اڑنے لگا۔ ہوا شبنم کی نمی سے مرطوب اور بوجھل تھی۔ اب لوکاٹ کے باغ شروع ہو گئے۔ یہ باغ اسی طرح تھے اور گہرے سبز چھتری

کے درمیان لوکاٹوں کے کیسری گچھے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ ہر پیڑ چھوٹے چھوٹے پتوں والی شاخیں پھیلائے صبح کی خوشبو اور تازگی سے بھرپور ہوا اور شرقی کناروں سے جھومتی اُن چھوئی، پاکیزہ روشنی میں گویا مراقبے میں گم تھا۔ نیچے نالے کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ میں نے آٹھ سال پہلے لوکاٹ کے ایک کیسری گچھے کو دیکھا تھا جو اپنی ٹہنی کی منڈیر پر سے جھک کر بہتے ہوئے پانی سے کہہ رہا تھا:

ہم سے پیار بڑھا لے
او گذرتے ہوئے پانی!

میں نے بھی اسی پانی کی ایک لہر سے پیار کا ناطہ جوڑ لیا تھا اور وہ پانی کی چنچل، الھڑ اور نادان لہر مجھے بھول کر سمندر سے جا ملی ہے اور میں خاک اڑاتی بنجر زمینوں پر اکیلا کھڑا اسے یاد کر رہا ہوں۔

ندی کی دوسری جانب اسی طرح گندے جوہڑ پر کہرا جم رہا تھا اور کھاد کے ڈھیروں میں سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ اب لوگ بستی کے کچے مکانوں میں سے باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں پٹڑی پٹڑی کمپنی باغ کی طرف ہو لیا۔ اب سیدھے ہاتھ کو مولیوں اور ساگ کے کھیتوں کے پار ناغوں کے درخت دکھائی دینے لگے۔ بے درخت چھریرے اور دبلے پتلے اور فضا میں انگلیوں کی طرح اٹھے ہوئے تھے سیاہ ٹہنیوں پر سے پتے جھڑ چکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے ان کا رنگ سُرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک سرخ پتا توڑ لیا۔ پتا شبنم میں بھیگ رہا تھا۔ رات اس پر اپنے آنسوؤں کے نشان چھوڑ گئی تھی۔ کیا یہاں بھی راتیں رویا کرتی ہیں؟ کیا ہم انہیں یاد آتے ہیں؟ میں نے ساگ کا پریم پترا اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب دوبارہ نہر کی پٹڑی پر آیا تو میری آنکھیں سورج سے چار ہو گئیں۔ جاڑوں کا گہرا سُرخ گلابی مائل لرزتا ہوا، پگھلتا ہوا بیضوی سورج آم کے درختوں کے سیاہ تنوں کے درمیان میں سے طلوع ہوتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ملائم ملائم سُرخ دھوپ میں مکانوں کی منڈیروں، درختوں کی پھننگوں اور گھاس کے خوشوں کے سِرے لال ہو گئے۔ آٹھ سال بعد ان درختوں، کھیتوں اور باغوں میں سورج دیوتا کو طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی شان، اسی آب و تاب اور اسی جاہ و جلال کے ساتھ سونے کے رتھ پر سوار کرنوں کا صور پھونکتا اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس کی ایک بھی کرن تقسیم نہ ہوئی تھی، ایک بھی شعاع نہ بٹی تھی۔ اس کا چہرہ اسی طرح تھا۔ روشن، رنگیلا، تابناک اور عظیم ——— اس کی نورانی، فراخ دل اور آزاد کرنیں بر جیا سنگھ کے گھر کے آنگن اور مسجد کے زنگ خوردہ میناروں پر اسی بے نیازی اور خندہ پیشانی سے رقص کر رہی تھیں۔

ایک شوخ کرن شہتوت کی ٹہنی پر آ کر ٹھٹھک سی گئی اور مجھے سنہری پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگی۔ میں بھی اسے پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگا۔ ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے اور ہمارے چہرے خوشی سے لال ہو کر دمکنے لگے۔ میں نے جھک کر اس شرمیلی کرن کے ماتھے پر بوسہ دیا اور آگے چل پڑا۔

سورج کی بیٹی کرن! تو ہمیشہ میرے ہونٹوں پر چمکتی رہے گی۔
روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

اتنے میں ایک سکھ عورت نہر کی پٹڑی پر نمودار ہوئی اور ——— میں نے آنکھیں جھکا لیں اور جلدی جلدی وہاں سے گذر گیا۔ میرے پیارے وطن! تیرا دامنِ حیا کس نے تار تار کر دیا؟ تیرے سر سے دوپٹہ کس نے کھینچ لیا؟ تیری آنکھوں کی شرم کیا ہوئی جو اب تو اپنے بیٹوں کے سامنے بھی ننگا ہو گیا؟

کمپنی باغ میں ضرورت سے زیادہ چہل پہل تھی اور لوگ یوں بے دلی سے سیر کر رہے تھے جیسے وہ بیمار رشتہ داروں کی عیادت کو جا رہے ہوں۔ موٹے بھدے، الٹے سیدھے، منحنی اور پستہ قد، ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں اور بے روح بے جان چہروں والے بیوپاری مشین ایسی پھرتی اور تیزی سے گھاس پر چکر لگا رہے تھے۔ جگہ جگہ پھلوں کے چھلکے، مٹھائیوں کے لفافے اور پوری کچوریوں کے جھوٹے پتے بکھرے پڑے تھے۔ کہیں نہ کہیں کوئی تھل تھل پل پل موٹی لالائنیں ہانپتی کانپتی اپنے آپ کو گھسیٹے لئے جاتی نظر آ جاتی تھی۔ درختوں کے تنوں کے پاس گھاس اُگ رہی تھی اور روشوں پر اکثر گرد اڑ رہی تھی۔ جس جگہ کبھی موتیے کے بے شمار پودے ہوا کرتے تھے اب وہاں خالی میدان تھا اور ایک طرف پاسنگ سگریٹ کا کھوکھا لگا تھا۔ میں اس جگہ آ گیا جہاں آم کے درختوں کی چھاؤں میں نہر بہہ رہی تھی۔ یہی وہ نہر تھی جس میں ایک دفعہ میں نے انور کے اوپر چھلانگ لگا دی تھی۔ نہر اسی طرح پُرسکون، ہموار اور سست رفتار کے ساتھ بہہ رہی تھی اور کناروں کی جانب تنکے اور پتے چکر کھا رہے تھے۔ درخت کی شاخیں اسی محبت سے نہر پر جھکی ہوئی تھیں اور فضا میں وہی بھنگ کی جھاڑیوں کی گرم گرم خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا پرے ایک جگہ ایک سردار جی بیٹھے مسواک کر رہے تھے۔ میں نے آم کے کھردرے تنے کو ہاتھ سے چھوا۔ درخت کا جسم اسی طرح گرم اور سانس لے رہا تھا۔ مجھے انور کا خیال آ گیا۔ سامنے والے پلاٹ میں جہاں سے ہم صبح کے اندھیرے میں ناخیں اور امرود چرا کر بھاگ جایا کرتے تھے اب کوٹھیاں بن گئی تھیں جہاں سے ایک موٹر سائیکل شور مچاتی گذر رہی تھی۔

جب میں اس درخت کے قریب سے گذرا جس پر ہم جٹ برہمن کا کھیل کھیلا کرتے تھے تو اس نے میری طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

نہیں بھائی! اب وقت نہیں ہے۔ تم سے دُکھ سکھ کی باتیں کرنے بیٹھا تو کوئی دیکھ لے گا اور جیل میں ڈال دیا جاؤں گا۔ تمہارا شہر پولیس کا سپاہی بن کر میرے پیچھے پیچھے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ اب رخصت بھائی درخت!

جامن کے پیڑ نے اپنی ٹہنیاں جھکا کر پوچھا۔ انور، صفیہ، سعیدہ، رضیہ اور محمودہ کیسی ہیں؟ میں انہیں اپنے میٹھے جامن گرا کر کھلایا کرتا تھا۔ مجھے وہ ساری شکایتیں یاد ہیں۔ کیا میں بھی انہیں یاد ہوں؟ ———— جامن کے اچھے درخت! تمہیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ وہ لڑکیاں تمہیں بالکل بھول گئی ہیں۔ وہ امرتسر کو گوگل کی مارکیٹ سمجھتی ہیں جہاں سے نئے نئے ڈیزائنوں کا کپڑا خریدا جا سکتا ہے۔ انہیں کمپنی باغ کا ایک بھی پھول، ایک بھی درخت یاد نہیں رہا۔ رضیہ چھ بچوں کی ماں ہے اور ساتواں پیدا کر رہی ہے۔ سعیدہ کو طلاق ہو گئی ہے اور وہ گھر پر کاپیاں پنسلیں بیچ کر اپنے بچوں اور بوڑھے باپ کا پیٹ پال رہی ہے۔ محمودہ خشک میوہ جات کے ایک تاجر سے بیاہ دی گئی ہے اور پہلے سے زیادہ خشک ہو گئی ہے۔ صفیہ کا بیاہ ایک ٹھیکیدار سے ہوا تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے اتنی موٹی ہو گئی کہ اس کے خاوند کو دوسرا بیاہ کرنا پڑا۔ اس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اب وہ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ اب وہ گھر کی لونڈی ہے اور اپنی ساس، خاوند اور سوت کے بچوں کی خدمت کرتی ہے اور روکھی سوکھی کھا کر سو رہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ کتنی کھلنڈری ہوتی تھی اور تمہاری چھاؤں میں وہ کتنا شور مچایا کرتی تھی۔ اس کے بلند اور نقرئی قہقہوں کی آواز تم بھولے نہیں ہو گے۔ اب اس کا رنگ زرد ہے، آنکھیں سیاہ حلقوں میں چھپ گئی ہیں اور اب اسے کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر مکان کی سیڑھیوں، پچھلی کوٹھڑیوں اور دروازوں کی اوٹ میں آنسو بہاتی ہے اور کوئی اسے تسلی کے دو بول کہنے والا نہیں۔

جامن کے پیارے درخت! اب کبھی انہیں ملا تو تمہارا سلام کہہ دوں گا۔

ہاں ———— انہیں میرا بہت بہت سلام کہنا اور پیار دینا اور کہنا میری بچیو! جہاں بھی رہو زندہ رہو۔ خدا تمہارے دکھوں کو کم کرے اور تمہارے اچھے دن جلدی لائے۔ تم نے ہمیں بھلا دیا ہے لیکن تمہارا بوڑھا جامن کا درخت تمہیں نہیں بھلا سکا۔ اسے تمہاری ایک ایک بات یاد ہے

وہ راتوں کی غمگین خاموشی میں تمہیں یاد کر کے آہیں بھرا کرتا ہے اور ساون میں جب مینہ برستا ہے تو وہ چپکے چپکے رویا کرتا ہے۔ میری پیاری شرمیلی ہنس مکھ اور بدنصیب بچیو! اگر دھرتی نے میرے پاؤں نہ جکڑ رکھے ہوتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں سے کوچ کر جاتا۔ میں ہر سال برسات میں کالے کالے جامنوں سے لدی ہوئی شاخیں جھکائے تمہارا انتظار کیا کرتا ہوں۔ کیا تم پھر کبھی نہ آؤ گی؟

نہیں پیارے درخت! اب ہم کبھی نہ آئیں گی۔ اب ہمیشہ کے لئے الوداع!

میں نے جامن کے درخت کو سلام کیا اور وہاں سے چل دیا۔

بکاولی کے درخت پر سے میں نے ایک بند پھول توڑ دیا۔ یہ پھول کچا اور چھوٹا تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا اور شریف پورے کی طرف آ گیا۔ اگر ریلوے لائن سے شریف پورے میں داخل ہوں تو سب سے پہلے ایک پگڈنڈی پر سے گذرنا پڑتا تھا جس پر کھٹے کے درختوں نے اپنی چھاؤں کر رکھی ہوتی تھی۔ بہار میں یہ راستہ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو سے مہکا کرتا تھا۔ آج مجھے اس پگڈنڈی پر سے ناک پر رومال رکھ کر گذرنا پڑا۔ سوائے غلاظت اور گندگی کے ڈھیروں کے یہاں اور کچھ نہ تھا۔ کبھی یہ بستی بڑی صاف ستھری اور نور بن نکور ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب ہر مکان دوسرے مکان کی حالت پر نوحہ کناں تھا۔ چھجے زیادہ جھک آئے تھے۔ دروازوں میں میل جم رہا تھا۔ کھڑکیوں کا روغن دھوپ اور بارش کھا گئی تھی پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ کسی ایک کھڑکی پر چق نہ تھی اور ہر کھڑکی اس آنکھ کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس کی پلکیں غائب ہوں۔ ہر مکان ننگا تھا اور کپڑے اتارے کسی فاحشہ عورت کی طرح راہگیروں کو گھور رہا تھا۔ رانی بازار کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ گول مسجد میں گوردوارہ تھا —— اور نیچے گھنشام داس شمشان داس پنساری کی دکان تھی جو سیتا رام سیتا رام کا بھجن گاتا ٹھڑے پر گاٹے کے گوبر کا لیپ کر رہا تھا۔ گلی کے وسط میں ایک جوان لڑکی کھڑی میلا سا سویٹر بن رہی تھی اور اپنی ہمسائی سے جو کھڑکی پر ٹانگ رکھے کھڑی تھی کہہ رہی تھی:

”منگ پھلی کھاؤ گی شیلا؟ ......“

وہ خود بھی ”منگ پھلی“ ہی تھی۔ بھنی ہوئی، گرم اور خشک! —— سیتا رام! سیتا رام!

رانی بازار میں، میں نے اپنے کلاس فیلو کو دیکھا کہ اپنی برقع پوش بیوی اور بچوں کو ساتھ لئے ہر مکان کو حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا گذر رہا ہے۔ عورت بدحواس سی تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ لگی جا رہی تھی۔ میں شریف پورے سے باہر آ گیا۔ پانچی گر اٹو اڈہ عبور کیا اور نئی خانقاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اب لال حویلی کی عمارت سامنے تھی اور یہاں سے گذر کر مجھے اپنی گلی میں داخل ہونا تھا۔ لال حویلی کی آدھی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور باقی نصف کی حالت بے حد خستہ تھی۔ منڈیروں پر سوکھی ہوئی گھاس اگ آئی تھی۔ کھڑکیوں کی چوکھٹیں جلی ہوئی تھیں اور اندھی آنکھوں کی طرح خلاؤں میں تاک رہی تھیں۔ کبھی ان کھڑکیوں پر بانس کی نازک چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور ان کے پیچھے سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور میز پوشوں پر خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں رہا کرتی تھیں۔ ان کے شرمیلے اور محجوب چہرے سوائے ان کے گھر والوں کے اور کبھی کسی نے نہ دیکھے تھے۔ کہاں چلی گئیں؟ کہاں چلی گئیں؟ میری بہنیں! میری بہنیں!!

اب میں اپنی گلی میں تھا اور دل پر ہاتھ رکھے گلی کے پرانے فرش پر سے گذر رہا تھا۔ گلی میں سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے قدموں کی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر مکان جیسے مجھ پر جھکا ہوا تھا اور گلی جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا سکڑتی جا رہی تھی۔ چھوٹی اور تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ میری نظر گھبرانے لگی اور ہر مکان جلدی جلدی گذرنے لگا۔ یہ رضیہ کا مکان ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ ڈیوڑھی میں اوپلوں کا ڈھیر ہے۔ یہ صفیہ کا مکان ہے۔ اس کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہے اور اندر دیوان خانے میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس دیوان خانے میں گرمیوں کی

دوپہروں کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ انور، رضیہ، صفیہ اور محمودہ سب لڑکیاں مل جل کر بیٹھتیں، سلائی کا کام کرتیں اور کروشیے کے رومال بنتیں اور آپس میں خوب ہنسی مذاق کرتیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت فرش دھو رہی تھی۔ کیوں ماتا جی! وہ ستواں لمبی نکیلی ناک والی اور ہنس کی چال چلنے والی لڑکی کہاں ہے؟ ماتا جی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے بائیں طرف دیکھا کہ محمودہ کا مکان غائب ہے اور اس کی جگہ گوبر اور ملبے کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اوپر، سامنے دیوار کے ساتھ آتش دان کی کارنس برہنہ تھی۔ یہاں محمودہ اسکول سے واپس آکر اپنی کتابیں رکھا کرتی تھی۔ اب وہاں ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

یہ ہمارا مکان ہے۔

میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اپنے مکان سے آنکھیں چار کرتے گھبرا رہا تھا۔ لیکن یہ ہمارا مکان نہ تھا۔ دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ سیڑھیاں مٹی کی تہوں میں چھپ رہی تھیں۔ میں اوپر آگیا۔ اوپر چھت کی بجائے آسمان جھانک رہا تھا۔ سامنے انور کے مکان کی کھڑکی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور چوکھٹ کا سیمنٹ اکھڑ چکا تھا۔ اوپر منڈیر پر آمنے سامنے دو ڈبل اینٹیں پڑی تھیں جس طرح قبر کے اوپر نصب کر دی جاتی ہیں۔ ایک چھپکلی دب سے بوسیدہ دیوار پر سے میرے قدموں میں گری اور بھاگ کر ایک بل میں گھس گئی۔ نہیں یہ ہمارا مکان نہیں۔ ہمارا مکان نہیں ہو سکتا۔ وہ مکان کہاں ہے جس کے آنگن کی دیوار پر عشق پیچاں کی کاسنی پھولوں والی بیل تھی اور جس کے کمرے میں سرما کی راتوں کو سماوار گرم ہوا کرتا تھا اور اس میں سے سفید سفید بھاپ نکلا کرتی تھی اور اس گرتی بارش میں دادا جان کے گانے کی اداس آواز آیا کرتی تھی:

نکیاں نکیاں پون پھہاراں
اکناں دیاں نے موج بہاراں

. . . .

اور میرے اجڑے ہوئے ویران گھر کے آنگن میں بارش ہونے لگی اور کالی سرد رات میں گلی سنسان ہو گئی اور دادا جان کی پرسوز آواز بند دریچوں سے ٹکرانے لگی، گرتے پرنالوں اور چپ چاپ گیلی منڈیروں کے ساتھ لگ کر رونے لگی اور سامنے والی کھڑکی میں روشنی ہوئی اور ایک سانولی سی لڑکی جیسے نیند میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور چق اٹھا کر گلی میں جھانکنے لگی ——— کوئی نہیں، کوئی نہیں ——— گلی ویران ہے - بارش ہو رہی ہے۔ ہوا اڑ رہی ہے اور سائبانوں سے سر ٹکرا کر چیخ رہی ہے ——— بالوں کی سیاہ لٹ پھسل کر اس لڑکی کے ماتھے پر جھولنے لگی اور بارش تیز ہو گئی اور مکانوں کے پرنالوں کا شور بڑھ گیا اور ہمارے آنگن والی بیل کے نیلے پھول پتوں کی جھنڈیوں میں چھپ گئے اور کھڑکی میں جھانکنے والی لڑکی کے سانولے رخسار کا ریشم لرزنے لگا اور سیاہ تل دھڑکنے لگا ——— سردی، سردی، سردی ——— سماوار لاؤ، چائے کی پتیاں لاؤ، نیلی پھولدار پیالیاں اور چنار کی لکڑی کا ٹرے لاؤ اور آگ جلاؤ، آگ جلاؤ ——— میں نے جلدی سے آگ روشن کی، سماوار میں پانی گرم کیا، کارنس پر سے چنار کی لکڑی کا ٹرے اٹھایا اور نیلی پھولدار پیالی میں سبز چائے ڈال کر جب انور کی طرف بڑھا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کھڑکی بند کر دی اور عشق پیچاں کے پھول ایک ایک کر کے جھڑ گئے، آنگن کا فرش اکھڑ گیا، دیواروں میں شگاف پڑ گئے، سیڑھیاں مٹی کی تہوں میں چھپ گئیں اور مکان دادا جان سمیت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا اور ایک مکروہ صورت گندی چھپکلی دھپ سے میرے قدموں میں آن گری۔

میں نیچے گلی میں آگیا۔ سامنے وہ دلہان خانہ تھا جہاں جاڑوں کی بارش میں انور کی نانی ہمیں پرانے کشمیری گیت سنایا کرتی تھی اور انور خاکستری رنگ کی گرم فرن میں کانگڑی چھپائے بیٹھی اپنی اجلی اجلی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اوپر وہ کھڑکی تھی جس کی ذرا سی چق اٹھا کر وہ مجھے گلی میں سے گذرتا

دیکھا کرتی تھی اور اس کی ایک لٹ پھسل کر ماتھے پر آ جایا کرتی تھی اور جہاں اب کوئی چق نہ تھی، کوئی انور نہ تھی! —— دیوان خانے کی آدھی چوکھٹ کے کونوں پر مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے ——

میری محبتوں کے تاریک کفن! میرے پیار کی عریاں بے گور و کفن لاشیں!

سعیدہ کے مکان کی جگہ محلے کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا تھا۔ یہی وہ مکان تھا جس کی ڈیوڑھی میں ایک رات انور نے میرا منہ چوم کر کہا تھا:

”دوسے چارلی! مجھے خط نہ لکھا کرو!“

*

نہیں لکھوں گا، نہیں لکھوں گا —— میں گذرتا گیا، بھاگتا گیا، اڑتا گیا —— کچھ نہ دیکھ رہا تھا، کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ گلی سے باہر آ گیا اور تیز تیز ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گلی کسی حیا سوز، حواس باختہ، آتشک زدہ رنڈی کی طرح اپنے تمام کپڑے اتار کر کیچڑ میں لت پت میرے تعاقب میں ہے۔ میں بھاگ کر ہوٹل میں آ گیا۔ دروازہ زور سے بند کیا اور بستر پر گر پڑا —— دن گذر گیا، شام ڈوب گئی، رات آ گئی۔ میں بستر پر پڑا رہا۔ رات زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا، مکانوں کی روشنیاں گل ہو گئیں، بازار ویران ہو گئے، لوگ خاموش ہو گئے اور کتے بھونکنے لگے۔ میں چپکے سے اٹھا اور بازاروں میں سے ہوتا ہوا اپنی گلی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہر طرف گہری عمیق خاموشی تھی۔ کسی مکان میں کوئی روشنی نہ تھی، کوئی آواز نہ تھی۔ میں نے آہستہ سے جیب میں سے ہاتھ نکال کر گلی کے پاؤں چھونے چاہے۔ گلی نے پاؤں پیچھے کر لیے۔

میرے وطن کی بیٹی! میری سنگدل بیوہ گلی! تجھے کس کی نظر کھا گئی جو تیرے سہاگ کی ایک بھی نشانی سلامت نہ رہی۔ کل تو میرے شہر کی مانگ تھی۔ کل اس مانگ میں صندل اور سیندور کا سُرخ فرش بچھا تھا۔ آج تو ایک گندی نالی ہے جس کے کناروں پر کوڑے کے ڈھیروں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ایک دن تیرا آنچل سر سے ڈھلک گیا تھا تو سورج نے شرم سے مغرب میں اپنا منہ چھپا لیا تھا اور آج تو برہنہ سر ننگے پاؤں چوک میں کھڑی ہے اور ہر غیر مرد سے آنکھیں لڑا رہی ہے۔ کل تجھے میلوں سے ہماری بُو آ جایا کرتی تھی، آج تو قریب سے بھی ہمیں نہیں پہچان رہی۔ ہم نے تجھ سے جدا ہو کر ہر محفل میں تیرے گیت گائے، ہر گیت میں تیرا نام لیا، ہر نام میں تیرا روپ دیکھا اور ہر روپ میں تیرے نام کی مالا جپی۔ مگر تو نے ہمیں بھلا کر دوسروں سے ناطہ جوڑ لیا۔ وفا کا سبق ہم سے سیکھا اور وفاداری کا پیمان دوسروں سے باندھ لیا۔ محبت کی قسمیں ہم سے کھائیں اور جے مالا دوسروں کے گلے میں پہنا دی۔ تو نے ہماری قبر پر اُگے ہوئے پھول سے رقیب کا گریبان سجایا ہے۔ تو نے ہماری چھاتی سے دودھ پی کر ہمارے دامن پر خون اگل دیا ہے۔ تو نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہم نے تجھے بلایا، تو نے منہ پھیر لیا۔ ہم نے آواز دی، تو نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ تیرے دروازے پر سورج نے دستک دی اور تو نے کہا گوالا دودھ لے کر آیا ہے۔ تیرے آنگن میں چاند نکلا اور تو نے لحاف اوپر کر لیا اور کھڑکی بند کر دی۔ ہم نے تجھے دودھیا گنبد، مصفا حوض اور موتیے کے پھولوں والے صحن دیئے اور تو نے وہاں بھینسیں باندھیں، گنبدوں میں جانوروں کے گھونسلے بنائے اور چلمنوں والی کھڑکیوں کو آگ لگا دی۔ ہم منڈیروں پر سُرخ ریشمی دوپٹے ڈال گئے تھے، تو نے وہاں سوکھی ہوئی خشک گھاس اُگا دی۔ اب پھر لب کیوں سیے؟ اب خاموش کیوں ہے؟ بتا وہ گوالے کدھر گم ہو گئے جو منہ اندھیرے بکریوں کے ریوڑ لے کر دودھ بیچنے آیا کرتے تھے؟ وہ دلہنیں کہاں کھو گئیں جن کی ڈولیاں پَو پھٹے رخصت ہوا کرتی تھیں؟ کل جن دہلیزوں پر محبت کے دیے جلائے تھے آج وہاں راکھ ملا اندھیرا اڑ رہا ہے اور کل جن ڈیوڑھیوں میں پیار نے سرگوشیاں کی تھیں آج وہاں بھینسیں ڈکرا رہی ہیں اور کل جو کانٹا پاؤں میں لگا تھا آج اس کی چبھن دل میں محسوس ہو رہی ہے —— سن! اے پتھر دل مورتی! —— ہرجائی! اب ہم بھی تجھے نہ پہچانیں گے۔ اب ہم بھی تجھے بھلا دیں گے۔ سدانوں کو جب

تیری یاد آواز دے گی تو ہم کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے۔ چلتے چلتے جب تیرا خیال آئے گا تو ہم وہ راستہ چھوڑ دیں گے۔ ہم تیرے اداس کھیتوں، ویران گلیوں اور اجاڑ باغوں کو بھلا دیں گے اور نئے باغ لگائیں گے، نئے کھیت بنائیں گے، نئی گلیوں کے سنگِ بنیاد رکھیں گے، نئی زمینوں میں ہل چلائیں گے اور ایک نئے امرتسر، نئے کمپنی باغ اور نئی رضیہ اور نئی صفیہ کو جنم دیں گے اور پھر جب ہمارے کمپنی باغ میں سورج کی سنہری کرنوں میں پہلا پھول مسکرائے گا تو ہم اس کا چہرہ تیرے کھنڈروں کی طرف پھیر کر تجھے کہیں گے۔ دیکھ اے پتھروں کے شہر! اس پھول میں ہمارے خون کی سرخی اور پسینے کی مہک ہے۔ اتنی دیر تک کے لئے رخصت۔ میرے دوست، میرے دشمن شہر! تیری دوستی میں ہم نے کوئی سکھ نہ پایا، کوئی پھل نہ پایا۔ تیری کانٹوں بھری جھاڑیوں پر ہم نے انگور کی بیل چڑھائی اور ہر گچھا زخمی ہو گیا۔ تو وہ کھجور کا درخت ہے جو دھوپ لگے تو سایہ کھینچ لیتا ہے اور بھوک لگے تو پھل اوپر لے جاتا ہے۔ اب ہم بھی اپنا پھل تجھ سے دور لے جائیں گے۔ اب ہم بھی اپنا سایہ تجھ سے کھینچ لیں گے۔ اب ہم بھی دامن کشاں گذر دیں گے۔ اب کوئی گلاب کا پھول توڑنے تیرے شہر نہ آئے گا۔ اب لاہور ہی سچے گلاب کا پھول ہے، اب لاہور ہی کمپنی باغ ہے، لاہور ہی شریف پورہ ہے اور لاہور ہی امرتسر ہے۔ ہمیں بنجر زمینوں پر نئی زمینوں پر ہل چلانے والے مبارک اور تجھے رات کی رانی کے جھنڈ میں بیٹھ کر آلو چھولے کھانے والے مبارک ——— چلو! چلو! ——— میری دلگیر، سوگوار یادوں کے ویران جزیرو! اپنے چہروں پر خاک ڈال کر تاریک سمندروں میں ڈوب جاؤ۔ رانی بازار میں کبھی کبھی پھرنے والی میرے دوست کی بیوی! اپنے بچوں اور خاوند کو لے کر امرتسر سے بھاگ جا۔ امرتسر مر چکا ہے۔ امرتسر مر چکا ہے۔ یہ امرتسر نہیں ہے، اس کی سڑی ہوئی، پھولی ہوئی نعش ہے جو دربار صاحب کے تالاب میں تیر رہی ہے ——— میں نے کوٹ کی جیب میں سے گلاب کی مرجھائی ہوئی پتیاں نکال کر گلی کے دروازے پر رکھیں اور چپ چاپ واپس ہوٹل میں آگیا۔ دوسرے روز میں پہلا پاکستانی تھا جو اٹاری بارڈر پر اپنا سامان چیک کروا رہا تھا۔ کسٹم انسپکٹر نے بکاؤلی کا بند پھول غور سے دیکھا اور بولا:

"یہ کیا ہے جی؟"

"بکاؤلی کا پھول!"

"اس میں کوئی سونا وغیرہ تو نہیں چھپا رکھا؟"

اتنا کہہ کر کسٹم انسپکٹر نے چاقو سے پھول کو چیر ڈالا۔ امرتسر کی آخری نشانی کو بھی ہلاک کر دیا۔ پھول نے کچھ نہ کہا، میں نے بھی کچھ نہ کہا۔ کسٹم انسپکٹر سونا ڈھونڈتا رہا اور پھول کی خوشبو اڑنے لگی۔ سونا اڑنے لگا اور سونا اڑتا رہا اور میں اسے وہیں چھوڑ کر لاہور جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ الوداع! میرے امرتسر! میرے یروشلم! میرے قرطبہ! تیرے معبدوں کی زینتیں ویران ہو گئیں، تیری سرخ فصیلوں کے برج کھنڈر بن گئے، تیرے جالی دار مرمریں جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور تیرے بیت المقدس پر سے یسوع مسیح تجھے اکیلا چھوڑ کر پرواز کر گئے۔ تو نے ہماری شہزادیوں کو ہر چوک میں رسوا کیا اور ہمارے شہزادوں کو گلی گلی قتل کیا۔ تو نے ہمارے محلات کو زندان بنا دیا اور قبروں کو ویران کر دیا۔ ہمیں مر کر بھی تیری آغوش میں سکون نہ ملا۔ کل ہم تاجِ شاہی پہن کر تیرے بازاروں میں نکلا کرتے تھے اور آج تیری منڈیروں پر سے ہم پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ کل ہم آنکھوں میں محبت کے دیئے فروزاں کئے تیرے گھر میں اترے تھے، آج ہم خالی دامن جھاڑ کر تیری دہلیزوں پر سے اٹھ رہے ہیں ——— لاہور! پیارے لاہور! تو نے ہمیں کوئی کمپنی باغ، کوئی ٹھنڈی چھاؤں والی نہر نہیں دی۔ کوئی سمادار اور گلاب کی کھینیاں نہیں دیں۔ تو نے گدھوں کو پھولوں کے ہار دے لادا ہے اور ہر شہروں پر تیر برسائے ہیں، گولیاں برسائی ہیں۔ لیکن ہم تجھ سے پیار کرتے ہیں اور تجھے اپنے دل میں اور اپنا دل تیری پہلی سیڑھی پر رکھتے ہیں۔ ہم نے انور کا مکان، رضیہ کا آنگن اور صفیہ کا دوپٹہ دے کر تجھے پایا ہے ——— کیا تو بھی ہمیں بھلا دے گا؟

پرواز کے زخم

کشمیری لال ذاکر

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگرٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کارن کمرے کا ماحول کچھ مٹمیلا سا ہے اور اس میں سگرٹ کے دھوئیں کی منحنی سی لکیریں عجیب جنگلی پن سے ایک دوسرے میں غلط ملط ہو رہی ہیں۔ سامنے تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں ایک ادھ جلا سگرٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔ میں سگرٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر اس کی ہستی نہیں مٹاتا' اسے زندہ رہنے دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور اس میں سے ہلکا سا لرزتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں جب تک وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم بجھ جانے سے سلگ سلگ کر تڑپ تڑپ کر دھک دھک کر دھیرے سے بجھنا پسند ہے۔ اس طرح ارتقا کی سب منزلیں طے ہوتی ہیں۔ درمیانی منزلیں طے کئے بغیر آخری منزل پر پہنچ جانا تو ایسے ہے جس طرح کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے اُڑ کر ایکدم آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہے اور اگر اس کے پنکھ ٹوٹ جائیں تو اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر میرے ذہن میں ابھرا ہے آج نیناں کو دیکھ کر۔

نیناں کو میں ۱۹۴۷ء سے جانتا ہوں جب بٹوارے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ سبز سبز پتیوں میں چھپی ہوئی کلی تھی اب پورے کے عین اوپر کھلا ہوا پھول ہے۔

غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع تھے۔ میں دن بھر کرکٹ کھیل کر اور آخر میں ہٹ کر گھر لوٹا تھا۔ ہار کا تلخ احساس ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا اور جسم میں تھکن کے کارن درد ہونے لگا تھا۔ میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر کے دن بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

"بھائی جان کھیل آئے میچ؟" شاردا مجھے بھائی جان ہی کہہ کر پکارتی ہے۔ بھیا نہیں کہتی' اسے یہ انداز پسند ہے۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ شاردا میرے سرہانے بیٹھ گئی۔

"ہار گئے؟" اس نے مجھ سے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہار جاؤں گا۔ آخر وہ میری بہن ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا بھائی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔

"ہاں!"

"تو شرط قائم ہے۔" شاردا نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی پتلی پتلی انگلیوں کی مہربان ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا دی۔ میں جب بھی تھکا ہوتا ہوں وہ مسکراتی ہے اور اس کی اس معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے تھکاوٹ کی چبھن ایکدم مٹ جاتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چائے تیار رکھی ہے بیرے کمرے میں۔ وہیں چلئے۔ میری ایک سہیلی بھی ہے اس سے ملئے۔" شاردا نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔"

"کونسا حرج ہو رہا ہے آپ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ "کسی وقت تو حد کر دیتے ہیں آپ۔ یوں چاہیے دن بھر آئینہ بھی نہ دیکھیں لیکن ———"

"چلو بھئی۔" میں نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔

کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں چونکی جیسے کوئی ہرنی اپنے قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔

"نیناں۔"

"بھائی جان۔"

نیناں نے لمحہ بھر کے لئے پلکیں اوپر اٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نرمل پانی پر بھور کا ہلکا سا نیم اندھیرا اپنی بھرپور جاذبیت سے چھا گیا ہو اور پھر فوراً ہی اس نے پلکیں جھکا لیں جیسے کوئی صبح کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو اور جھیل کا پانی ساکن ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر رات کے سائے لہرانے لگے ہوں۔

کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ شاردا کا پلنگ تھا جس پر سفید سلک کی چادر بچھی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

"نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔" شاردا پیالیوں میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔

"تو آپ ہماری برادری کی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی!" نیناں کی پلکوں میں خفیف سی لرزش ہوئی وہ ذرا سا اوپر اٹھیں جیسے جھیل کے پانی پر دونوں وقت گلے مل رہے ہوں۔ صبح شام کے بازوؤں میں پگھل کر مسکرا رہی ہو۔

"جب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"یہ بے چاری قدم کہاں رکھ رہی ہے۔" شاردا نے میری بات ٹوک دی۔

"راستے پر چل پڑنا ہی قافلے میں شامل ہو جانا ہے پگلی۔ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں۔ جیسے آج میں مل گیا ہوں۔"

میری بات سن کر نیناں کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی دوپہر مچلنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کرنوں سے اسے گدگدانے لگی ہو اور ساری خوابیدگی، سارا کسل، ساری نیند بچھڑنے لگی ہو اور پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ تمام جنگل پر اندھیرا چھانے لگا اور دھوپ مٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھنا اندھیرا ابھر گیا۔ نیناں کی آنکھوں میں بے پناہ غم جھلک اٹھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گاڑ دیں۔ شاردا پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

"بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں۔" اس نے نیناں کے آگے پڑی ہوئی پیالی میری طرف سرکا دی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نیناں کو بالائی پسند نہیں۔ یہ تو چائے میں دودھ چھان کر ڈالتی ہے۔" اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے

"اچھا!"

"ہاں!" گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔" شاردا نے کہا۔

"بڑا ارسٹوکریٹک نظریہ ہے۔" میں نے اپنی پیالی میں چمچہ گھمانا شروع کر دیا۔ شاردا نیناں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔

"چائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کم بخت، ہر کام اسے کرایا چاہیئے۔" شاردا نے پیار سے اس کے گال کو چھو لیا اور نیناں ایک دم جیسے جاگ گئی ہو۔

"سو رہی تھیں آپ؟" میں ہنسا۔

"جی نہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت چمک اٹھے پر اس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی، جیسے درد کی ایک ہلکی سی لہر اس کی نسوں میں پھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر زردی سی اُبھر آئی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا جیسے وہ کسی وادی میں کھڑی کوئی پہاڑ کی چوٹی ہو جس کی ایک طرف تو سورج کے ڈھلنے سے چمک اٹھے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔

کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آ گیا۔

"کون سے مضمون لے رکھے ہیں آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"سائنس اور میتھمیٹکس۔"

"بڑا مشکل کمبینیشن ہے، ڈاکٹری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"خیال تو ہے!"

"آپ بھی تو ڈاکٹر ہی بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟"

"ہاں!"

"اور بن گئے افسانہ نگار، شاید سبھی لکھنے والے پہلے ڈاکٹر بننے کے ہی خواب دیکھتے ہیں۔" شاردا بڑے خلوص سے مجھ پر چوٹ کر رہی تھی۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل نباض بنا دیتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جو تھکے ہوئے بیمار ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے۔ شکستہ اور ناامید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا

پیغام پہنچاتا ہے۔"

نیناں نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لئے خاموش تھی اور بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی نرماہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

"تم ڈاکٹر بنو گی یا لیکچرار؟" شاردا نے اس سے پوچھا۔

"جو زندگی بنا دے گی۔" یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بندھنوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں کے اردگرد بھی شاید کانٹوں کا گھیرا ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ پھول کھل کر بھی شاخ پر ہی سوکھتے ہیں۔

اس کے ذہن کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور چھاؤں، پرواز اور شکستگی، تصویر کا اسکیچ ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔

اور تصویر مکمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بہت دنوں تک تو میرے سامنے وہ اسکیچ ہی پڑا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نیناں کے پتا یہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی لیتے ہیں۔ سول کیسز سے انہیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ ہار جانا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے انہیں وکالت کے بارے میں۔ کوئی دو ہزار کے قریب ان کی پریکٹس ہے یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سا وقت لڑائی جھگڑوں میں ہی بتاتے ہیں۔ پانچ ہزار سے جو مواضعات میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے خاص بھگت ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجمیر جانے والی سڑک کے کنارے ہے معلوم ہوتا ہے یہ جگہ انہوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کی ہے، ورنہ اتنے وسیع احاطے میں تو ایک محل بن سکتا ہے لیکن انہوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور جو راج اور مزدور اس پر کام کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ ورنہ جنہوں نے پوری اجرت لے کر کام کرنا ہو وہ اس بے دردی سے نہیں کھپتے پہلی بار جب صبح کو سیر جاتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گزرا تو وکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر رک گیا۔ تو یہ تھا نیناں کا گھر جو اچھا خاصا اصطبل لگ رہا تھا۔ مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی گھڑسال میں سائیسوں کے کچھ کوارٹرز ہوں اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ جیسے گھوڑوں کو سدھانے کے کام آتا ہو۔ کچھ آدمی پتلی پتلی سی رضائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی ہوں لوگ تھے جن کے سہارے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لئے باہر جا رہے تھے۔ رات انہوں نے یہیں گزاری تھی۔ شاید آج ان کی عدالت میں پیشی ہو۔ میں آگے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے۔ خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور گھٹنوں کے ذرا نیچے تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ میرا ذہن یہ گوارا نہ کر سکا کہ میں انہیں وکیل صاحب سمجھوں، پر تھے وہ وکیل صاحب ہی جن سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شاردا نیناں کے ہاں چائے پر گئے تھے۔

"تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شاردا؟" میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نیناں کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں۔" شاردا نے جواب دیا۔

"اتنا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریفیوجی کیمپ کھل سکتا ہے۔"

"آپ ہمیشہ الٹی باتیں ہی سوچیں گے۔"

"اگر ذاتی جائداد کو اس بُری طرح ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے قومی ملکیت قرار دے دینا چاہیئے۔" میں نے ناک پر رومال رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گوبر میں لت پت بھینسوں نے اچھا خاصہ گھمسان مچا رکھا تھا۔

اس وقت نیناں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں دھول کے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نمستے بھائی صاحب!" اور پھر اس نے شاردا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائی کلین کرا کے پہنا تھا۔

نیناں ہمیں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سے گذارتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ ہال کمرے میں سے گذرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم اور اس میں شام کا سا سُرمئی اجالا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک دری بچھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور خالی تھیں ان پر کہیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی نہ تھا جس چھوٹے سے کمرے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

"یہ نیناں کا کمرہ ہے بھائی جان!" شاردا نے مجھے مخاطب کیا۔

"کمرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔" نیناں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جو ہرنی میری آہٹ پا کر چونکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کہیں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نخلستان ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور میرا گھر ایک صحرا۔ جب بگولوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لئے یہی سہارا میرے کام آتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار کے سہارے اس کا پلنگ تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کی بڑی سی الماری رکھی تھی جس کے باہر چھوٹا سا قفل لگا تھا۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کرسی تھی جہاں بیٹھ کر الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو پچھلے احاطے کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کم ہی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کمرے کا دروازہ تھا جس میں پردے کی جگہ چق پڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں پیتل کے گملے میں نرگس کے پھول تھے۔ میں نے سگرٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتابوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شاردا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاردا میری عادتوں سے واقف ہے، بے کار میں نہیں ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حد سے گذر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتابوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نیناں کی تصویر رکھی تھی میں اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کتابیں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر؟" شاردا بولی۔

"کتابیں بھی اچھی ہیں اور تصویر بھی۔" میں نے جواب دیا اور کتابوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی ساہتیہ کی نمائندہ کتابیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں اور اردو ادب نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتابوں کو دیکھ چکنے کے بعد میں پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول اتنا خشک اور غیر ادبی ہو ذہنی طور پر اتنی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی الجھن میں پھنس گیا۔
اتنے میں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

"چائے آرہی ہے' ارے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!"

"ہاں بغیر تمہاری اجازت کے۔" میں نے جواب دیا۔

"جن لوگوں میں میرا جیون گذر رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ تو میرے خط تک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویہ غلط ہے۔"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک درد سا لہرا گیا۔ کتنی بیزار تھی اپنے ماحول سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا:

"نیناں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟"

"جی نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجتے رہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔" شاردا نے پوچھا۔

"کئی برسوں سے الہ آباد میں وکالت کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں کڑھتے رہے اور آخر اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں رہتے ہیں کبھی سال ڈیڑھ سال میں دو ایک دن کے لئے یہاں آتے ہیں۔"

"کبھی آئیں تو مجھے ملانا۔" شاردا نے کہا۔

"ہو سکے تو مجھے بھی۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو جلن ہوتی ہے شاردا کو دیکھ کر جسے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گذار سکتی ہے۔"

"شاردا تو مجھے ہر وقت کوستی ہے۔"

"نہیں کوسا نہیں کرتیں، دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو دو آنسو بھینٹ بھی کر دیتی ہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی نمی ابھر آئی تھی۔ یہ نمی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھول بھرے احاطے میں گھٹتا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گیا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی:

"یہ کمرہ بھی انہی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے دے گئے تھے۔ جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اس کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ جانے میں کتنا آنند ہے۔"
شاردا کے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے دھند بھری گھاٹیوں میں سورج کا پہلا اُجالا چمکنے لگے۔

شاردا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کھلے اور پُراسرار انداز میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

"ٹھہریئے میں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں۔"
وہ کرسی سے اٹھی اور الماری میں کتابوں کے اوپر رکھی اپنی تصویر کو اٹھا لائی۔ اس کے فریم کو کھول کر اس نے اپنی تصویر کے نیچے سے ایک تصویر نکالی۔
"دیکھئے یہ ہے ان کی تصویر۔" اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک خوبصورت نوجوان تیکھے تیکھے نقوش کھلا ماتھا اور گہری آنکھیں۔ ایسی ہی آنکھیں نیناں کی تھیں۔ آنکھوں کی یہ گہرائی ہی ان دونوں میں مشترک تھی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ دونوں کھڑے تھے۔ نیناں اور اس کا بھائی۔ میں نے تصویر شاردا کی طرف بڑھائی اور پھر نیناں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیاں کتنی پُراسرار تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے نیناں نے اپنی تصویر کے نیچے اپنے بھائی کی تصویر رکھ کر غیر ارادی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی شخصیت ہی اس کی ڈھارس کا باعث ہے۔
اتنے میں چق اٹھا کر کوئی داخل ہوا۔
"نمستے پتا جی!" شاردا کرسی سے اٹھی۔ وہ انہیں جانتی تھی۔
"نمستے!" مجھے بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔
نیناں شاید اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ اٹھنے لگی تو چائے کی پیالی تپائی سے فرش پر گر گئی۔
"تم بھی اتنی ہی بے احتیاط ہو بیٹی ہو" انہوں نے شاردا کو مخاطب کیا اور پھر مجھے کچھ کہے سنے بغیر چق اٹھا کر باہر نکل گئے۔
"نیناں ذرا بات سُننا!" ان کی آواز آئی اور نیناں خاموشی سے باہر نکل گئی۔
کچھ لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ بے حد اُداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کی اتنی گھنی دھند بھر گئی تھی کہ وہ اچھی طرح کھل بھی نہ رہی تھیں۔
میں نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ اس کے بھائی نے اپنی تمام محبت اور اخلاص کے ساتھ نیناں پر بے حد ظلم کیا تھا۔ اس نے اپنے ماحول سے انتقام لینے کے لئے اپنی بہن کو چنا تھا۔
اس نے اس کے گرد تخیل، تصوّر اور ادب کا طلسمی جال بُن دیا تھا اور وہ مسحور ہو کر اونگھ رہی تھی۔ اب وہ ناول کے کرداروں کی طرح جیتی تھی۔ نظموں کی تشبیہوں کی طرح حرکت کرتی تھی اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح اپنے جیون کے خاکے بناتی تھی۔ عملی طور پر وہ اپاہج بنتی جا رہی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے کے پُراسرار ماحول میں رہ کر بھول جاتی تھی کہ اس کے باہر ایک اجاڑ اور سنسان دنیا ہے۔ اس کے گھر کا ماحول نہایت کھردرا اور اکھڑ ہے۔ وہ کونے میں اُگے نرگس کے پھولوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی کہ اس کے جیون کے گرد تیز کانٹوں کی ایک اونچی باڑ ہے اور اس نے جب بھی اُڑنے کی کوشش کی وہ نکیلے کانٹے اٹھے ہوئے بھالوں کی طرح اس کا راستہ روک لیں گے۔ اس سب کا ذمہ دار اس کا بھائی تھا جس کی تصویر کو اس نے اپنی تصویر کے نیچے رکھ کر اپنی شخصیت کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر ڈالا تھا۔
میری سوچ کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔
"معاف کیجئے گا بھائی صاحب!" نیناں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھی اور میں یہ نہ سمجھا تھا کہ وہ کس قصور کی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے کس بات کا افسوس تھا۔

"کس لیئے؟" میں نے پوچھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

"آپ بھی نہیں سمجھے!" اور اس کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے اور آنسوؤں کی اس روشنی میں سب کچھ نظر آ گیا۔ میں نے سب کچھ جان لیا۔ شاردا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے پلّو سے اس کے آنسو پونچھے میری نگاہ کو چندھیانے والی روشنی مدھم ہو گئی۔

"بے بس ہو کر جینا سب سے بڑا پاپ ہے شاردا" اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار کتابوں سے بھری ہوئی بڑی سی الماری کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک دن یہ الماری اپنے پورے وزن کے ساتھ نیناں کے اوپر گر پڑے گی اور اسے سدا کے لئے اپاہج کر ڈالے گی۔

جب میں اور شاردا اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس تھے۔ بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔

اس کے بعد میں کبھی نیناں کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔

شاردا اکیلی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارے گھر آجایا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کوئی کہانی بھی لے آتی۔ کہانی سناتے سناتے وہ اس میں اس قدر کھو جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی سیر کے لئے جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گذرتے ہوئے محسوس کرتا جیسے صحرا کے بگولے اس گھر کی صحنوں سے اُلجھ کر انہیں جھلس ڈالتے ہوں۔ اس کے پتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے لیکن وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچاننے کے لیئے کافی بھی نہ تھی۔ میری واقفیت نیناں سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ نیناں کو میں زیادہ سے زیادہ پہچانتا گیا۔ اس کی شخصیت اپنی ساری جزئیات کے ساتھ میری سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک ادھورے پن کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ کہانی کو انگلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گذر رہی ہو اور بھیڑ کے ریلے میں اچانک اس کا ہاتھ چھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اسے نہ پا سکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھلاہٹ، افسردگی اور تشنگی سی بھر گئی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے کہانی کو لکھتے لکھتے وہ اسے اچانک کسی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک عجیب سی حسرت اور تشنہ لبی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔ آدرش اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تخیل کے پنکھوں پر اڑتے ہوئے دھرتی سے بہت دور فضا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی اس لئے اس کی کہانیوں کے کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ بھی بے جان ہوتے تھے۔ ان میں حرکت آمیز زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھٹھرن اور منجمد قسم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور جلن پھرت نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکتاہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا بھی کہ فن کار کو اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے اردگرد کے ماحول کو گہری نظروں سے ٹٹولنا چاہیئے۔ جو کردار اسے وہاں سے ملیں گے وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ مجبور سی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک زاویۂ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا بھائی اس سے سینکڑوں میل دور رہتے ہوئے بھی اس زاویۂ نگاہ کو پختہ کیئے جاتا تھا۔ کاش اس کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھردرے پن سے بچنے کے لئے تخیل کی بھول بھلیوں

میں بھٹکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پہ کھڑا کر دیتا جہاں ہواؤں کے تیز تیز ریلے اس سے ٹکراتے اور ٹیڑھی میڑھی مخدوش پگڈنڈیاں اسے اپنی حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پر ایسا نہ ہوا اور وہ اپنی ہی راہ پر چلتی رہی اور اس کی کہانیوں میں حسرت اور افسردگی بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پُراسرار اور خاموش ہوتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہرخند نمایاں ہونے لگا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئی تھی جہاں اسے محبت اور خلوص کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آغوش میں اس کی شخصیت کا ہر فیلا پہلو نکھل جائے، اس کے ہونٹوں کے یاقوت دہک سکیں اور رخساروں کے پھول چمک اٹھیں اور اس کے ماحول میں ایسی کوئی ہستی نہ تھی۔ اس کے گھر کے باہر ایک اونچی دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلانگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جن جزیروں میں لیجانا چاہتا تھا وہ بہت دور تھے اور ان کے ارد گرد بہت گہرا پانی تھا جس میں اترنا اس کے بس میں نہ تھا۔

جزیرے زیادہ خوبصورت ہوتے گئے۔
ان کے گرد پھیلا ہوا پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔
اس کی الماری میں کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔
اور اس کا تخیل کہکشاں کی تلاش کرتا رہا۔

ایک دن شاردا نے مجھے بتایا کہ نیناں کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے اور پھر اچانک اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمام دن اپنے کمرے میں پڑی جانے کیا کیا کرتی رہی۔

نیناں کے پتا شادی بیاہ کے معاملے میں حد سے زیادہ کٹر تھے۔ وہ راجپوت تھے اور راجپوتوں کے بھی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی کی ڈولی اٹھ جائے تو پھر سسرال کی حویلی سے اس کی ارتھی ہی نکلنی چاہیئے۔ جیتے جی واپس آنا اس کے ماں باپ کی توہین ہے۔ نیناں کا بھائی اس سے متفق نہ تھا اور اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ وہاں شکست کھا کر ان کی خودداری زخمی ہو گئی تھی اور اب پورے جوش کے ساتھ وہ اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تھے۔ نیناں کی شادی انہوں نے آگرہ کے ایک گاؤں میں طے کی تھی۔ لڑکا فوج میں حوالدار تھا اور اب ریٹائر ہو کر واپس آ گیا تھا۔ ان کی بہت کافی زمین تھی اور وہ اس کا اکیلا مالک تھا اس کا باپ بوڑھا تھا اور سن چودہ کی جنگ میں اپنا ایک بازو گنوا چکا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی پرانی حویلی تھی۔ نیناں کا گھر تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا تھا۔ حویلی کے گرد ایک بہت اونچی فصیل تھی کسی زمانے میں وہ ایک قلعہ تھا، بعد میں وہ ایک حویلی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے پاس دس بھینسیں تھیں، اگرچہ دو بھینسوں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ آدھا گاؤں جو ان کے مزارعوں پر مشتمل تھا ان کے گھر سے چھاچھ لیجاتا تھا۔ بیلوں کی کئی جوڑیاں تھیں اور دو بہلیاں تھیں اتنی خوبصورت کہ کاریں بھی ان کے آگے ہیچ ہوں۔

نیناں کے پتا نے اپنے لڑکے سے اس معاملے میں کوئی مشورہ نہ کیا تھا۔ نیناں نے جو حالات اسے ماں سے معلوم ہو سکے اپنے بھائی کو لکھ دیئے۔ اس کے بھائی نے جب پتا کے فیصلے کی مخالفت کی تو وکیل صاحب نے اسے ایسے الفاظ لکھے کہ اس نے ان سے سدا کے لئے تعلقات توڑ لئے۔ اس نے نیناں کو عین منجدھار میں چھوڑ دیا۔ جس سہارے پر اسے اب تک ناز تھا وہ اس سے چھن گیا۔ وہ

ماں باپ کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکی اور اس کرڑے حملے کے واروں سے بچنے کے لئے اپنی پناہ گاہ میں دبک گئی اور یوں بے حس ہو گئی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کی شادی کرسمس کے دنوں میں ہوئی ہیں ان دنوں ایجوکیشنل ٹور کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو وہ سسرال جا چکی تھی۔ شاردا نے مجھے بتایا کہ جس روز نیناں کی برات آئی اسے کئی بار بے ہوشی کے دورے پڑے اور اب سسرال میں اسے ایسے ہی دورے پڑتے تھے۔

"بیاہ کے دن اس نے کئی بار آپ کا پوچھا۔"

"کیوں؟"

"کہتی تھی میرا بھائی بیاہ میں شریک نہیں ہوا۔ تمہارے بھائی جان ہوتے تو مجھے ضرور ڈھارس ملتی۔"

"کاش میں یہاں ہوتا!" میں نے کہا۔

دو روز سے نیناں سسرال سے آئی ہوئی ہے۔ اس کا خاوند بھی ساتھ ہے۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی پریزنٹ نہیں کر سکا شاردا کا خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی تحفہ دینا چاہیئے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا 'مرقع چغتائی' اس کی الماری میں نہیں۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے پریزنٹ نہیں کی، میں ہی کر دوں۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا۔ سوچا یہی نیناں کو دے دوں وہ ضرور پسند کرے گی۔ میں اور شاردا 'مرقع چغتائی' لے کر اس کے گھر گئے۔ میں باہر کھڑا رہا، اس کے ساتھ اندر نہیں گیا۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اپنے دھول بھرے احاطے میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی۔ دور برآمدے میں کھڑی رہی اور شاردا ہی مجھے لینے آئی۔

آج وہ ہمیں اپنے کمرے میں نہیں لے گئی۔ اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائیوں کی جگہ وحشت بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے تھے جیسے مدتوں سے ان پر مسکراہٹ نہ کھلی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا، ایک مجرم کو دیکھ رہا ہوں جو کچہری میں اپنے کسی ناکردہ جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کٹہرے میں کھڑا ہو جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔

"بہت دنوں میں آئے آپ بھائی صاحب؟" اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی شکایت، نہ اُلاہنا، نہ پیار۔ خالی آواز تھی۔ ہر جذبے سے محروم۔

"میں یہاں نہیں تھا نیناں۔ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔" میری بات سُن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے چھیڑ دیا ہو۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں اَن گنت شعلوں کی تپش تھی۔

"میں ہی لائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہ آتے۔" شاردا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ فضا پر چھائی سنجیدگی چھٹ جائے۔ پر گھٹا بہت گھنی تھی چھٹی نہیں بلکہ اور نیچے جھک گئی۔

"بھائی صاحب میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر جلا دیا ہے۔" اس نے میرے سوال کی طرف دھیان ہی نہ دیا اور اپنی بات کہتی گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

"اپنے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا میں دلیپ سنگھ نہیں تھی کہ یہاں سے بھاگ جاتی۔"

دلیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دلیپ سنگھ کی بہادری کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بزدلی پر طنز، میں نہ سمجھ پایا۔

اور اس وقت پچیس چھبیس برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھی رہی جیسے اسے اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

"نمستے بھابی!" شاردا اپنی جگہ سے اٹھی۔

"میرے بھائی جان۔"

اس نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی تھا کہ نیناں کی آنکھیں اس پر گڑ گئیں جیسے مجرم پوری توجہ سے اپنے فیصلے کی عبارت سن رہا ہو اور اس کی نظریں جج پر جم گئی ہوں اور پھر اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکنی شروع کر دیں اور اس کا سر ایک دم صوفے کی پشت پر لڑھک گیا۔ اسے پھر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کنور رچھپال سنگھ، اس کا خاوند گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور چند ہی لمحوں میں نیناں کی ماں پانی کا گلاس لئے آئی۔ نیناں بڑبڑا رہی تھی۔

"بھائی صاحب میں نے انتقام لے لیا ہے — میں نے انتقام۔۔۔۔۔۔"

ماں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ شاردا نے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے پھانسی کے تختے پر کھڑی ہو اور پھانسی کا رسہ اس کی نظروں کے سامنے جھول رہا ہو۔ شاردا صوفے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے اپنے بازوؤں میں لے رہی تھی۔ ماں خالی گلاس لے کر چلی گئی۔ میں نے اپنی جھولی میں پڑے "مرقع چغتائی" کو ٹٹولا۔ وہ وہیں تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا لیکن نیناں کے کمرے میں اب ایک بھی کتاب باقی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کتابوں کی اتنی بڑی الماری نیناں کے اوپر گر گئی تھی اور نیناں سدا کے لئے اپاہج ہو گئی تھی اور اس کی تصویر کا فریم ٹوٹ گیا تھا اور اس کی تصویر کی جگہ اب دلیپ سنگھ کی تصویر تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"تو اب چلیں شاردا؟"

شاردا نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی کتاب تو پھینٹ کر دو۔

لیکن میں نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا "مرقع چغتائی" میری بغل میں تھا۔ نیناں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بولی تک نہیں۔

چپ چاپ کھڑی ہوگئی اور پھر ہمارے ساتھ برآمدے میں آگئی اور وہاں ایک دم رُک گئی۔ شاردا اور میں احاطے میں دھول اڑاتے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے لحہ بھر کے لئے میں نے نیناں کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں جانے کس شے پر گڑ چکی تھیں۔

میں شاردا کو بازو سے پکڑ کر جلدی جلدی سڑک پر لے آیا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں نے "مرقع چغتائی" نیناں کو بھینٹ کیوں نہیں کیا۔ پر مجھے اس کی عادت کا پتہ ہے وہ پوچھے گی ضرور۔

میں نے جانے کتنے ہی سگرٹ پھونک ڈالے ہیں۔ میرے ارد گرد گھنا دھواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شاردا نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی تو کیا جواب دوں گا؟

مٹی

ابوسعید قریشی

جمیل نعیمہ روز کی شادی کو بیس سال بیت چکے تھے لیکن اولاد کی آرزو اس کی زندگی پر اس خیمے کی طرح چھائی ہوئی تھی جو ناقابلِ رفو ہو۔ اس غم میں میاں بیوی دونوں کے چہرے صحرا نوردوں کی بوسیدہ قناتوں کے تنبوؤں کی طرح جھریوں سے پٹ گئے تھے۔

انہوں نے بزرگوں کے مزاروں پر منتیں مانیں، سیانوں سے سفوف لے لے کر پھانکے، مجذوبوں سے بددعائیں لیں اور برہنہ پا بچوں کو جوتے پہنائے لیکن من کی مراد پوری نہ ہوئی۔

وہ مایوس ہو گئے۔ ایک دوسرے سے مایوس اور قسمت سے مایوس! وہ آسمان کو دیکھ کر نظریں جھکا لیتے اور منہ سے کچھ نہ بولتے۔ امید و ناامیدی کی حد سے گذر کر وہ اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں کچھ نہیں تھا۔

لیکن ایک روز جمیل دوکان سے گھر لوٹا تو اس کی بیوی چاند پر نظریں گاڑے بت بنی کھڑی تھی۔ جمیل نے سن رکھا تھا کہ دیوانگی کے عالم میں آدمی کو چاند سے خاص لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ ضرور اس ٹونے کا اثر ہے جس کے مطابق اس نے سبز پیر کے مزار کی خاک اپنے شکم پر ملی تھی اور آسمان کے نیچے کھلی سے نہا، رنڈا سہ مل، سہاگ کا جوڑا پہن، بالوں میں ربل گوندھ میرے پاس آئی تھی۔ اس تصور سے وہ کانپ گیا۔ عورت کی مجبوری اور احساسِ گناہ کے خیال سے اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی جیسے تنبو میں ڈورے ڈالتے وقت انگلی میں سوئی چبھ گئی ہو۔ اس کا دل پسیج گیا۔

وہ نہایت احتیاط سے اس کی طرف بڑھا کہ چونک نہ پڑے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں!" عورت نے چاند سے نظریں ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ تو ہے! — چاند کی بڑھیا چرخہ کات رہی ہے۔"

"نہیں!"

"تو آخر کون سی نئی چیز لگ گئی ہے اس کو؟ وہی پرانا چاند ہے۔"

جواب ملا: "نہیں — نیا ہے۔"

یہ سن کر نعیمہ روز کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور دیوانی ہو گئی ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اسے بہلانے کے لئے کہا: "یہ تو ہزاروں برس سے یونہی چلا آ رہا ہے۔ وہی آسمان ہے اور وہی چاند، اور آج تو ویسے بھی مہینے کی دسویں ہے۔ چاند یوں بھی نیا نہیں۔"

"مرد کتنے بے وقوف ہوتے ہیں!" عورت نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نظریں جھکا لیں۔

"بے وقوف" کے لفظ سے خیمہ دوز کو پہلے تو دھکا سا لگا کیونکہ ایسی بات اس نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ لیکن آخر کار وہ سمجھ گیا اور وہیں خدا کے حضور سجدے میں گر پڑا جس کی رحمت سے سوکھی بیل ہری ہو گئی تھی۔

اُن گنا مہینہ گذر چکا تھا اور بیوی کو اطمینان تھا کہ اب اللہ کی مہربانی سے سب کام ٹھیک ہو جائے گا لیکن میاں اس کے باوجود فکر مند رہتا کہ بنی بات کہیں بگڑ نہ جائے۔ چنانچہ وہ دن کو چپکے چپکے گھر آتا اور پردے کی اوٹ سے جھانک لیتا کہ سب ٹھیک ہے نا' اور رات کو اندھیرے میں سونے کی عادت کے باوجود دیا جلائے رکھتا اور اٹھ اٹھ کر دیکھتا کہ عورت کے چہرے پر جس کی جھریاں یوں غائب ہو گئی تھیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں، کوئی سایہ تو نہیں تیر رہا۔ اس کے علاوہ اسے ایک اور فکر لاحق تھی کہ دیکھیں لڑکا ہوتا ہے کہ لڑکی ——— وہ لڑکا چاہتا تھا۔

اس کی آرزو پوری ہوئی اور ایک دن یہ خبر بستی میں برسات کی بوندوں کی طرح پھیل گئی کہ جمیل خیمہ دوز کے گھر لڑکا ہوا ہے اور دور نزدیک کے ہمسایوں کے علاوہ وہ خانہ بدوش بھی مبارک دینے آئے جن کے خیمے باہر میدان میں لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گھر کے صحن میں تحفوں کا ڈھیر لگ گیا اور سب نے نومولود کی زندگی اور کامیابی کے لئے دعا مانگی۔

بچے کا نام کمال رکھا گیا۔ اب اس کے باپ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ لڑکا واقعی کوئی ایسا کمال حاصل کرے جس سے ماں باپ کا نام روشن ہو۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ——— سوئی میں دھاگہ ڈالتے وقت اور رکتر بیونت کرتے ہوئے ..... غرض اس کو ہر وقت یہی خیال رہتا کہ وہ کون سا کام ہو سکتا ہے جو کمال کے شایانِ شان ہو۔ یوں نظر آتا تھا جیسے جمیل خیمہ دوز روٹی کمانے کے لئے کام نہیں کر رہا بلکہ ایک نئے شامیانے کا خاکہ تیار کر رہا ہے جو ساری بستی پر چھا جائے۔ جس کو دیکھنے کے لئے راہ چلتے رُک جائیں اور قافلوں کے لوگ جس کی باتیں دور دور کے ملکوں تک پہنچائیں۔

جمیل خیمہ دوز اور اس کی بیوی نے اپنے بیٹے کے لئے کئی منصوبے بناتے اور انہیں بے کار کپڑے کی دھجیوں کی طرح کاٹ کر پھینک دیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ لڑکا لکھ پڑھ کر عالم بنے جو آنکھوں سے خوابوں کی تعبیر معلوم کرے، ستاروں کو دیکھ کر تقدیر کا پتہ بتائے، نبض پر انگلیاں رکھ کر روگ بوجھے۔ ماں باپ، جس سے اولاد کے رشتے ناطے ٹھہرانے سے پہلے۔ میاں بیوی بچوں کا نام تجویز کرتے وقت۔ کسان کھیتوں میں بیج ڈالتے ہوئے اور بادشاہ کشور کشائی پر روانہ ہونے سے قبل اس سے ان کے کمال سے مشورہ کریں کہ تم ہم سب میں دانا ہو۔ تم بتاؤ! ..... نوجوان جس کو اپنے دل کے بھید بتا دیں اور بوڑھے جس کی بزرگی کے قائل ہوں.......

خیمہ دوز نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مطلب مولوی صاحب سے بیان کیا اور ان کے سامنے شیرینی رکھی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔

"ہڈیاں ہماری باقی آپ کا" جمیل نے کہا اور لڑکے کو ملا جی کے سپرد کر دیا۔

لیکن پڑھائی میں کمال کا دل نہ لگا۔ اس کی ماں اسے نہلا دھلا کر مکتب بھیجتی مگر وہ راستے میں مٹی سے کھیلنے لگ جاتا۔ اس کے ہاتھوں میں گیلی مٹی سے عجیب و غریب شکلیں اُبھرنے لگتیں۔ ماں باپ، بلیاں چوہے، مرغے اونٹ ...... بلیاں چوہوں کو تڑپ کر جاتیں اور ان کے پیٹ پھول جاتے۔ اونٹ چادریں تان کر بستروں میں گھس جاتے اور آدمیوں کی طرح خراٹے لینے لگتے ——— اور یہ محلے کا کتا ہوتا تھا، دہلیز پر سر رکھے ایک آنکھ بند کئے چڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان پر لپکتا کمال کی انگلیوں میں حرکت پیدا ہوتی سکتے کے سر پر سینگ اُگ آتے اور وہ بکری بن جاتا۔ بکری کی کمر پر کوہان ابھر آتا اور کھجور کا درخت بن جاتا اور پھر یکایک درخت زمین میں دھنس جاتا اور سانپ بن کر نمودار ہوتا۔ یہیں پھیکا

پھنکارتا ہوا اور سپیرے کی بین پر ناچنے لگتا ——— ارے اڈس گیا!!!

کمال کے ہاتھوں کو شہتوت کی قمچیاں بھی اسی طرح ڈس رہی تھیں۔ اس کی ہتھیلیاں گلہری کی طرح نظر آنے لگی تھیں لیکن اس کے ناخنوں سے مٹی کے ذرے نہیں نکل رہے تھے اور اس کے کپڑوں پر ہر روز کیچڑ کے نئے نشان نظر آتے تھے۔

"ہاتھ دکھاؤ!"

کمال کو اس سزا کا علم تھا جو مٹی سے کھیلنے کا نتیجہ تھی لیکن وہ اپنے ہاتھ کبھی نہ چھپاتا۔

"شرم بھی تو نہیں آتی کم بخت کو!"

شرم! کس بات کی شرم؟ ——— وہ حیرت سے مولوی صاحب کا منہ تکنے لگتا ——— مٹی سے کھیلنے کی شرم! لیکن کیوں؟ ——— مٹی اگر گندی تھی تو ہر چیز گندی تھی ——— اناج، سبزیاں، مکان..... ہر چیز گندی تھی ——— مولوی صاحب نے تو کہا تھا کہ آدمی بھی مٹی سے بنا ہے۔ تو؟ تو؟

لیکن مولوی صاحب کی چٹائی کے نیچے چھپی ہوئی قمچی کے پاس اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ ہاتھ بڑھاتا اور سانس روک لیتا۔

شوکتی ہوئی شاخ خاموش ہوتی تو مولوی صاحب کی آواز آتی:

"آج کا سبق یہی تھا ——— اب جاؤ اور مٹی سے کھیلو"

کمال سر جھکائے مکتب سے نکلتا اور اپنے دکھتے ہوئے ہاتھوں کو گیلی مٹی میں گاڑ دیتا۔ مٹی اس کے ہاتھوں کی ساری ٹیسیں اپنے اندر جذب کر لیتی۔ احسانمندی کے احساس سے وہ سسکیاں لینے لگتا۔ اس کے آنسو گیلی مٹی کو اور بھی نمناک کر دیتے ——— زمین کی بخشی ہوئی مٹی پر اس کے گرم گرم آنسو!!! اور وہ سوچتا کہ اگر دنیا کے سارے کنوئیں سوکھ جائیں اور بستی پر کبھی کبھی برسنے والے بادل بھی بن برسے نکل جائیں تو بھی یہ آنسو مٹی کو نم رکھنے کے لئے کافی ہیں اور اس کی سسکیاں بہتے پانی کی سرگوشیوں اور دور رہٹ کے گیتوں میں گم ہو جائیں۔ وہ خود کو ایک بار پھر دنیا سے ہم آہنگ پاتا اور اس کے ہاتھ پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو جاتے۔

اس کے ہاتھوں کو ملا جی کے مکتب سے ہر روز قمچیوں کا سبق ملتا اور ہر روز وہ مٹی کے مرہم سے آرام پاتے مگر ایک دن مکتب کا دروازہ اس پر بند ہو گیا۔ جمیل کو جب اس کا علم ہوا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے عظیم الشان شامیانہ جو اس نے اپنے تصور میں تعمیر کیا تھا زمین پر آ رہا ہے ——— کسی کھلنڈرے لڑکے نے اس کی طنابیں کاٹ دی تھیں۔

کمال پر اپنے گھر کا دروازہ بھی بند ہو گیا لیکن اس کی ماں جس کے پیٹ میں اس نے ربع صدی قیام کیا تھا اسے اپنے صحن سے نہ نکال سکی۔ رات کو جب خیمہ دوز سو جاتا تو وہ دبے پاؤں اٹھتی اور دروازہ کھول دیتی اور صبح اپنے شوہر کے اٹھنے سے پہلے رات کی بچی ہوئی روٹی بیٹے کے پلو سے باندھ کر اسے پھر باہر نکال دیتی اور وہ دن بھر کھیتوں کے کنارے مٹی سے کھیلتا رہتا۔ اس کی انگلیاں بے کار نہیں رہ سکتی تھیں۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اس کے ہاتھ ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے۔ مٹی میں انہیں عجیب دلفریب عجیب پر اسرار شکلیں نظر آتی تھیں اور وہ ہر شکل کو اس آسانی سے نکال لاتے تھے کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا لیکن کمال کی اس سے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ جاندار وں کی شبیہیں بنانے کے بعد وہ سوچتا کہ ان میں جان کیوں نہیں پڑتی؟ یہ بولتے کیوں نہیں؟ لیکن اس کے ننھے دماغ کو اس کا کوئی جواب نہ ملتا اور اس کی مضطرب انگلیاں، اپنی ناکامی کے احساس سے، بنائی تصویروں کو پھر بے ڈھب گیلی مٹی میں تبدیل کر دیتیں۔

اپنے سوال کے حل کی خاطر اس نے بستی کے آس پاس ہر کھیت، ہر رہٹ، ہر جوہڑ کی مٹی آزمائی لیکن ہر بار مایوسی کا سامنا ہوا۔ اسی دھن میں گھومتا ہوا ایک روز وہ بستی کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئی دنیا میں نکل آیا ہے۔ ہر طرف چکنی مٹی کے انبار لگے تھے اور چھوٹے بڑے، عورتیں، مرد سبھی مٹی سے کھیل رہے تھے۔

یہیں اس نے ایک نوجوان عورت کو دیکھا جس کے خدوخال میں اس کو اپنی ماں کا عکس نظر آیا۔ عورت کے سامنے آٹا پیسنے کی گھریلو چکی کی طرح کا ایک پہیہ سا رکھا تھا لیکن وہ پتھر کا نہیں تھا اور زمین سے کوئی بالشت بھر اونچا تھا۔ عورت نے اپنی آستینیں کندھوں تک چڑھا رکھی تھیں اور اس کی بانہیں اس چکنی مٹی سے بنی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں جس کا ایک تودہ اس کے پاس ہی چمک رہا تھا۔

عورت نے مٹی کے ڈھیر سے ایک پیڑا سا لیا، جس طرح کمال کی ماں روٹی پکانے کے لئے پرات سے آٹا لیتی تھی، اور گھومتے ہوئے پہیے کے محور پر رکھ کر اسے اپنی ہتھیلیوں کی کٹوری میں لے لیا۔ چاک کے مرکز سے لہروں کا ایک پیچ سا ابھرا جیسے گرمیوں میں بگولے اٹھتے تھے اور جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اگر کوئی بچہ ان کی لپیٹ میں آ جائے تو وہ اسے اٹھا کر جانے کہاں لے جاتے ہیں۔ کمال کا رواں رواں جھنجھنا اٹھا جیسے چاک سے بلند ہوتے ہوئے بگولے کی لہروں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

عورت نے چاک کی ہتھی کو گھمایا۔ پیچ کی لہریں اور پُراسرار ہو گئیں۔ یوں نظر آتا تھا جیسے عورت کی سانولی بانہوں سے سنہری چوڑیوں کی گول گول قاشیں اتر اتر کر روشنی کے دائرے بن گئی تھیں اور یہ دائرے چاک کے بیچ میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے یا مختلف منبعوں سے آتی ہوئی روشنی، کہیں سے کم کہیں سے زیادہ ہر آن نئے فاصلوں کا فریب پیدا کر رہی تھی۔ محوِ حیرت بنے ہوئے کمال نے چاک کی لہروں کی جلو میں سہمی عورت کے چہرے کی طرف دیکھا ——— اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر زلفوں کے سائے بھی چاک پر مٹی کے مرغولوں کی طرح آ لپٹ [illegible] رہے تھے اور کمال سوچنے لگا کہ یہ زلفوں کے سائے ہیں یا سایوں کی زلفیں؟

یکایک عورت کی انگلیوں اور ہتھیلیوں نے نہ جانے کیا کیا کہ پیچ کسا اور کہیں سے ایک کٹورا آ گیا ——— کیسا پُرلطف کھیل تھا! لیکن کمال یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ لہریں ——— چاک پر بنتی بگڑتی، جمتی پگھلتی وہ ڈھلتی سنورتی شکلیں آیا عورت کے ہاتھوں سے وہاں پہنچی تھیں یا خود چاک میں موجود تھیں۔ وہ کٹورا کہاں سے آیا تھا ——— آیا وہ لہروں کا عکس تھا یا اوک کا سایہ؟ ...... کمال کا سر چاک پر چڑھتے ہوئے پیالے کی طرح گھومنے لگا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکتا عورت نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور پیالہ آنکھ جھپکنے میں چاک سے علیحدہ ہو گیا۔ کمال کو کچھ ایسا چکر آیا کہ عورت اور چاک اور پیالہ اور مٹی سب گڈمڈ ہو گئے۔ ایسے میں عورت نے مٹی کا ایک اور پیڑا لیا اور کمال کے سوالوں کے گڈمڈ جواب سے پھر عجیب و غریب شکلیں ابھرنے لگیں۔ وہی دلچسپ کھیل پھر شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے چاک کے پاس رکھے ہوئے لکڑی کے ایک تختے پر پیالوں کی ایک قوس بن گئی ——— پیالے جو اپنی یکسانیت کے باوجود الگ الگ پہچانے جا سکتے تھے۔ اس احساس سے کمال کے ذہن میں حیرت و استعجاب کی ایک اور لہر ابھری اور نہ جانے اب کے بار وہ اسے کس ساحل پر پھینکتی لیکن اتنے میں کمال کا سایہ چاک پر پڑا۔ عورت چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے اپنا سر اور سینہ ڈھانپا اور نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

اس کی آواز میں گلہ بانوں کے الغوزے گونج رہے تھے، ببول کی شاخوں میں ہوا کی سرگوشیاں شامل تھیں۔ رہٹ کا گیت گھلا ہوا تھا، چاک کی گنجار تھی۔

کمال نے اسے اپنا نام بتایا۔

"کیسا کمال؟ کس کا کمال؟" عورت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

لیکن خیمہ دوز کا لڑکا اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

"کس بات میں کمال حاصل کیا ہے تم نے؟" عورت نے پوچھا۔ "پیالے بنا سکتے ہو ایسے؟"

"بنائے نہیں کبھی۔" کمال نے جواب دیا۔

"تو اور کیا بنا سکتے ہو؟"

کمال نے اپنے ہاتھ کھول دیئے۔

"کتنی پیاری مینا بنائی ہے تم نے! ... تم ہی جمیل خیمہ دوز کے لڑکے ہو؟"

کمال نے سر ہلایا کہ ہاں لیکن وہ بوکھلا گیا کہ اس عورت کو یہ کیسے معلوم ہو گیا۔

"تمہارا باپ تمہیں عالم بنانا چاہتا ہے لیکن تمہارا جی نہیں لگتا پڑھائی میں ——— ہونہہ! میں بھی پڑھی لکھی نہیں ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ علم کیا کتابوں ہی میں قید ہوتا ہے ... یہ بھی تو علم ہے تمہارے ہاتھوں میں۔" اس نے چاک کو ایک اور چکر دیا اور دیکھتے دیکھتے مٹی کی سست رفتار بے ڈول لہروں میں نئی زندگی جاگ اٹھی۔ "اس کا بھی علم ہے ——— تیر، بیٹھ جاؤ ——— اچھا یہ بتاؤ کمال کہ تم کیا کچھ بنا سکتے ہو؟"

کمال، جس سے آج تک اس بارے میں کسی نے کچھ نہیں پوچھا تھا چہک اٹھا:

"کتے کبوتر، طوطا مینا، گھوڑے گدھے ...... اونٹ بکریاں .... لیکن ———"

"ہاں ہاں! چپ کیوں ہو گئے ——— لیکن کیا؟"

"لیکن جان نہیں ہے ان میں۔" کمال نے جان کے لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مٹی کے اس کھلونے کو جسے اس نے مینا کا نام دیا تھا مسل کر پھر بے وضع گیلی مٹی میں تبدیل کر دیا۔

نوجوان عورت کے چہرے پر کسی اڑتے ہوئے پرندے کے پر کا سایہ تیرتا ہوا نکل گیا اور جس طرح 'سائے' کے تضاد سے 'روشنی' اور چمک اٹھتی ہے اس کے گہرے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرنیں اور بھی شوخ ہو گئیں ——— شوخ لیکن ناقابلِ فہم۔

"اچھا یہ بتاؤ کمال۔" الغوزہ پھر گونجا۔ "ان پیالوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ پیالے کیسے لگتے ہیں تمہیں؟"

"بہت اچھے۔" کمال نے جواب دیا۔

"مگر ان میں بھی تو جان نہیں ہے۔"

"جان؟ ہاں ..... لیکن ———" کمال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اس کی گھبرائی ہوئی نگاہیں عورت کے چہرے پر زلفوں کی طرح ناچنے لگیں جیسے وہ اسی سے پوچھ رہا ہو کہ تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتی ہو۔

"بہت اچھے لگتے ہیں نا تمہیں یہ پیالے۔" عورت نے کہا۔

"ہاں!" کمال نے آہ بھرتے ہوئے کہا جیسے اس کے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"لیکن کیوں؟"

کمال پھر گھبرا گیا۔ عورت ہنسی اور کہا:

"خیر چھوڑو اس قصّے کو ——— تم بھی بنا سکتے ہو ایسے پیالے۔ سمجھے!"

کمال کا چہرہ کھل اٹھا۔

اتنے میں کہیں کھجوروں کے جھنڈ کے اس طرف سے آواز آئی

"مریم!"

اور جیسے مریم کو پکارنے والا اپنی آواز کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ کھجوروں کے سائے سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی کمر میں کالا لاچا تھا لیکن اوپر کا دھڑ ننگا تھا۔ اس کی مچھلیاں بجلیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے گدھے پر مٹی لاد رکھی تھی اور سیدھا چاک کی طرف آرہا تھا جہاں کمال اور وہ عورت بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

نوجوان کو دیکھ کر عورت اپنے چاک کی طرح لہراتی ہوئی اٹھی۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور کمال کو محسوس ہوا جیسے ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی یکایک تیز ہوگئی ہے۔

"آگئے یوسف!" عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں مریم!" نوجوان نے جواب دیا۔ "ارے اتنے پیالے بنا ڈالے تم نے! ——— اور یہ شاگرد ہے تمہارا؟"

"نہیں!" مریم نے کہا۔ "استاد!"

ان کی ہنسی قافلوں کی لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی طرح گونجی اور فضا نغموں سے معمور ہوگئی۔

"اچھا بھئی شاگرد جانے اور استاد ——— پر آج تو ایسی مٹی ملی ہے مریم کہ کوزے آپ سے آپ ڈھلتے چلے جائیں گے۔"

"ہاں بہت نم ہے اور صاف۔ خمیر اٹھاتے دیر نہیں لگے گی۔"

"اچھا بھئی تم لوگ اپنے سبق کی فکر کرو۔ میں ابھی کنوئیں سے نہا کر آتا ہوں۔ رجب کا رہٹ ابھی چل رہا ہے۔"

یوسف کے جانے کے بعد مریم پھر کمال کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں تو تم بھی بنا سکتے ہو یہ کوزے۔"

اس نے کمال کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

چاک کے لمس سے کمال کا رواں رواں لرز اٹھا۔

وہ ہانپنے لگا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ دنیا کی ہر چیز بنا سکتا ہے۔ لہروں کے زینے سے آسمان تک پہنچ سکتا ہے اور چاند تاروں کو چھو کر آسکتا ہے...... اس کے ہونٹوں پر آسودگی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس نے گھوم کر مریم کی طرف دیکھا ——— وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

کمال نے اب گھوڑے گدھے بنانے چھوڑ دیے۔ وہ چپکے چپکے مریم کے یہاں پہنچ جاتا اور اسے اپنا منتظر پاتا۔ پھر دھونا اور اس کا کھیل ہوتا۔ جمیل خمیہ دوز نے اسے گھر سے نکالتے وقت سوچا تھا کہ وہ ایک دن دربدر مارے مارے پھرنے کے بعد وہ آپ سے آپ راہ پر آجائے گا اور اگر لکھ پڑھ کر عالم نہ بن سکا تو اپنا خاندانی کام ہی سنبھال لے گا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ کمال کمہاروں کا شاگرد ہوگیا ہے تو اس کا

دل ٹوٹ گیا۔ اس نے دوکان پر جانا چھوڑ دیا کہ لوگوں کو کیا منہ دکھائے اور ایک رات سویا تو صبح نہ اٹھا۔ کمال کی ماں اس صدمے کی تاب نہ لا سکی اور اس نے بھی اپنے شوہر کی لاش پر جان دے دی۔

کمال جس کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا کمہاروں کے ہاں آ رہا ——— اب وہ ہوتا اور اس کا چاک ہوتا ——— سحر و شام کے دھندلکوں میں، رات کے مخملی اندھیرے اور دن کے تابناک اجالے میں ہر وقت کمال کا چاک چاند تاروں کی طرح گھومتا، گاتا، گنگناتا اور اس کی آغوش سے اٹھتی ہوئی لہریں ہر آن اس کی ہتھیلیوں میں ایک نئی مخلوق ڈال دیتیں ——— ایک کے بعد دوسرا کھلونا۔

مٹھی بھر گیلی مٹی تھی اور وہ تھا ——— اس کے ہاتھ تھے اور عدم سے وجود میں آتی ہوئی وہ لہریں تھیں۔ ان کی سمفنیاں تھیں اور وہ تھا وہ تھا اور گیلی مٹی کے بگولوں کا سرمدی نغمہ! ——— یا پھر اس عورت کی آواز تھی جس نے اس کے ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں کے کٹوروں میں لے کر، اس کی انگلیوں کو چاک کے لمس سے آشنا کیا تھا۔ وہ اسے دیکھتی اور مسکرائی۔

"کمال اب کھانا کھا لو!"

جو کی آدھی روٹی اور پانی کا ایک گھونٹ اور اس کی بانہوں میں وہ طاقت بھر جاتی جیسے وہ ازل تک اپنے چاک کو گردش میں رکھ سکتا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی احسانمند نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھتا، مسکراتا اور سوچتا کہ میں نے اسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔

"کمال اب آرام کرو۔"

اور وہ اپنے چاک کے پاس سو جاتا۔ لیکن اس کی انگلیاں سونے میں بھی کسی خیالی صراحی کے گرد حمائل رہتیں، اس کے شکم میں کچھ ٹہٹہا رہا ہے۔ وہ سوچتا کہ اس کے اندر کون سی شکل اظہار کے لئے بیتاب ہے، اور پھر جانے کیسے مینا، جام میں تبدیل ہو جاتی۔ جام مرتبانوں کی شکل اختیار کر لیتے مرتبانوں سے شہد بہہ نکلتا۔ مٹکے دودھ سے بھر جاتے اور پیالے شفاف پانی سے لبریز ہو کر چھلک پڑتے ——— کمال کانپ کر جاگ اٹھتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہے ہوتے۔ وہ اٹھتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

وہ سونے میں جاگتا اور جاگتے میں سوتا۔ جیسے اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ ان شعاعوں کی دنیا میں جی رہا تھا جو اس روز، جب وہ پہلی بار چاک کے لمس سے آشنا ہوا تھا، مریم اور یوسف کی نگاہوں کے تصادم سے پیدا ہوئی تھیں اور جنہوں نے ڈھلتے ہوئے سورج کو مہر نیم روز بنا دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مریم اور یوسف، ان کا تبسم، ان کی بستی، بستی کے لوگ، زمین، آسمان ہر چیز انہی شعاعوں کا کرشمہ تھی ——— اور وہ چاک، مٹی کا چاک بھی اسی روشنی کا گرداب تھا جس سے نور کے کوزے اتر رہے تھے۔ دنیا کا اندھیرا دور کرنے کے لئے وہ ان کے انبار لگاتے جا رہا تھا۔ ڈھلتے دن کی اداسیاں دور کرنے کے لئے نور کے کوزے جو ایک دن مرد و زن کی نگاہوں کے تصادم سے ظہور میں آئے تھے ——— اور کبھی کبھی تو وہ سوچنے لگتا کہ شاید میں بھی ایک ایسا ہی کوزہ ہوں۔

"کمال تمہارے کوزے زندہ ہو گئے!"

یہ آواز؟ کہاں سنی تھی اس نے یہ آواز؟ کلہ بانوں کا الغوزہ! ——— اور اسے یاد آ گیا۔

اس نے چاک سے نظریں ہٹائیں ——— ظروف کے انبار لگے تھے اور لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے تھے۔ پیالے گردش میں تھے اور صراحیوں سے قلقل کی آواز آ رہی تھی۔

"کمال! تجھ سے پہلے ——— تیری مینا کے بغیر کمال، محفلیں قبرستان کی طرح سنسان تھیں...."

جانے کس کی آواز تھی!

وہ مسکرایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ پھر وہی لہریں تھیں اور پھر وہی چاک کا نغمہ۔ قلقل مینا، قہقہوں اور پازیب کی جھنکار سے گونجتا ہوا نغمہ ——— جیسے صحرا میں کوئی قافلہ اتر آیا تھا۔ ان کے دوش پر اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی صراحیاں تھیں اور ہاتھوں میں اس کے چاک سے اترے ہوئے پیالے ——— لیکن ایک سمت سے اور جانے وہ کون سی سمت تھی، اب بھی صحرا کے سناٹے کی آواز آ رہی تھی ——— ابھی نہیں، اس نے کہا۔ ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا...... اور چاک کو اور تیز کر دیا۔

تیز!

تیز تر!!

اور ایک روز جب وہ چالیس دن سے نہیں سویا تھا، کمال کو اپنے چاک کی محفل میں ایک اور آواز سنائی دی ——— رشمی آنچل تھا یا کیا تھا۔ ہوا کی سرگوشیاں تھیں کہ چاہنے والوں کے سانس؟ جانے کیا تھا ——— اس نے چاک سے نظریں ہٹائیں ——— سبز اور نیلا آسمان فیروزے کی طرح چمک رہا تھا۔ یہیں اس نیلی چھت میں جسے وہ ماں کی گود میں لیٹا پہروں دیکھا کرتا تھا، کمال کو ایک اور نیلا نشان نیچے اترتا ہوا نظر آیا، جیسے آسمان کی ساری نیلاہٹیں سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں اور اس کی وسعتوں میں دوڑتے ہوئے سیاروں کی طرح یہ نقطہ بھی تیزی سے آ رہا تھا ——— کمال نے دیکھا کہ وہ ایک پرندہ تھا۔ ابھی ابھی اسی کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس کے پر نیل کنٹھ، مور، مرغابی اور جانے کون کون سے پرندے کی طرح نیلے تھے، نیلے اور سنہری، سبز اور عنابی، بنفشئی اور فیروزی۔ جیسے ان سب رنگوں کو سیال روشنی میں حل کر دیا گیا تھا۔ پرندے کے سر پر تاج تھا اور اس کے سبز نیلے پروں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ پسے ہوئے ستاروں، مچلتے ہوئے موتیوں کی طرح کبھی ایک رنگ جھلکتا، کبھی دوسرا۔

پرندے نے چاک کے گرد سات چکر کاٹے اور کمال کے سر کو اپنے پروں سے چھوتا ہوا پھر آسمان کی نیلاہٹوں میں غائب ہو گیا، اور جاتے جاتے اپنا ایک پر چاک کے پاس چھوڑ گیا۔

کمال نے ایسے رنگ پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ دیکھے تو خواب میں جو آنکھ کھلتے ہی اُڑ گئے۔ اسے ایک خیال آیا۔

اس نے ایک کوزہ اٹھایا اور اسے اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی دو انگلیوں کے محور پر آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وہی پر تھا اور جیسے تتلی پھولوں سے کھیلتی ہے، پر کوزے کے بدن، قوسوں اور لبوں کو چوم رہا تھا، اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن تھا۔

جانے کب تک، نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں، مہینے اور سال، جمیل خیبہ روز کا بیٹا کمال اسی طرح کوزے اور پر سے کھیلتا رہا اور آخر ایک دن جب کوزے کی گردش ختم ہوئی تو پر کے سارے رنگ، نیلاہٹیں اور شعاعیں کوزے میں جذب ہو چکی تھیں۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ڈھلے ہوئے آسمان کی مٹی کسی آن دیکھے چاک پر ڈھل ڈھلا کر کوزہ بن کے کمال کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں مند گئیں اور ان سے ٹپکنے کے آنسو ڈھلک کر کوزے کی تہہ میں تارا ہو گئے۔

"کمال!"

جانے کون نے نواز اسے پکار رہا تھا؟

"تمہیں یاد ہے کمال، وہ دن یاد ہے تمہیں، جب جمیل خیمہ دوز کے کھلنڈرے بچے کو کسی نے استاد کا لقب دیا تھا ــــ تم نے گمرد و گرما کی اس بستی کو آسمان کا عکس بنا دیا ہے کمال!"

کمال نے مسکرا کر نیلا کوزہ مریم کے قدموں میں رکھ دیا اور سر جھکا لیا۔

روایت ہے کہ ملتان کی کاشی کاری اسی استاد کمال کے شاگردوں کا راز ہے۔ کمال، جس کے ہاتھ مٹی سے آلودہ رہتے تھے، جس نے اپنے فن سے شادی کی، جس کا کوئی بچہ نہ تھا سوائے ان شاگردوں کے جن کے کمال سے استاد کا نام آج بھی زندہ ہے۔

سفید چادر

احمد سعید

"کسی بھنگی سے کہو اس لاش کو اٹھا کر ہسپتال پہنچا دے۔" اڈہ بس کے انچارج نے اپنے اسسٹنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہ بس سروس کا اڈہ ہے قبرستان نہیں۔"

"بہت اچھا حضور لیکن ......" اسسٹنٹ نے جواب دیا۔

"اس کا منہ بھی کسی کتے نے کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ اگر زیادہ دیر پڑی رہی تو کہیں چیلوں یا گدھوں کا شکار نہ ہو جائے۔" انچارج نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "پہلی بس آنے والی ہے۔ اس سے پہلے جگہ صاف ہو جانی چاہیے۔"

"میں ابھی جمادار کو بلاتا ہوں۔" اسسٹنٹ نے جواب دیا۔

"ہاں، اور مت بھولنا کہ آج ..... نیا پرمٹ بھی بنوانا ہے۔"

"فکر نہ کیجئے، میرا بھی آپ کے ساتھ ہی بننا ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ ضرورت کے وقت کام آئے گا۔ آج کل ہی میں بڑے بڑے لوگوں کو ایک شاندار دعوت دینی ہے۔ انہیں ہماری ضرورت ہے ہمیں ان کی ......"

"پھر تو عیش ہیں صاحب!"

"اور میرا کمرہ بھی اچھی طرح صاف کروا دینا۔ رات بھگدڑ مچی رہی۔ اس میں اگر بتیاں جلوا دینا۔" انچارج یہ کہتا ہوا اپنی موٹر کی طرف چل دیا راستے میں ایک لحظہ کے لئے رکا اور کہا "میں آرام کر کے دوپہر کا کھانا کھا کر دفتر آؤں گا۔ اگر ضروری کام ہو تو مجھے اطلاع کر دینا..... باقی تم خود سنبھال لینا۔"

انچارج خداداد خان اپنے ماتحت کو ضروری ہدایات دینے کے بعد گاڑی میں جا بیٹھا۔ اسے ڈرائیونگ کا بہت شوق تھا اس لئے ڈرائیور بہت کم استعمال کرتا گو وہ ہر وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتا۔

خداداد نے گاڑی بیک کی۔ وہ ابھی ایک گز ہی پیچھے ہٹی ہو گی کہ ایک پٹاخہ چھوٹتا سنائی دیا...... موٹر کا پچھلا پہیہ پنکچر ہو گیا تھا۔ خداداد جھنجھلا کر باہر نکلا۔ "کیا حرامزدگی ہے! کھٹری گاڑی کی ٹیوب بسٹ! میں نہ کہتا تھا کہ صحن کی صفائی جلد از جلد...... یہ دیکھو شیشے کے ٹکڑے۔" اس نے طیش میں آ کر ماتحت کے منہ پر زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

موٹر کے قریب، جہاں لاش پڑی تھی، ایک دوائی کی شیشی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی گردن لاش کے ہاتھ میں مضبوطی سے

پکڑی ہوئی تھی۔

"کم بخت بھکاری اور مریض بھی یہاں آکر مرتے ہیں!" خدا امداد لاش کو ٹھوکر لگاتا ہوا اسسٹنٹ کو موٹر بھیج کر واکر گھر بھیج دینے کے لئے کہتا پیدل ہی وہاں سے چل دیا۔ چھوٹے شہر میں اس وقت تانگہ ملنا مشکل تھا۔

اسسٹنٹ نے اپنے ہاتھ سے دوائی کی شیشی کے ٹکڑے اٹھا کر لاش کے قریب رکھ دئے۔ ایسا کرنے میں اس کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ قدرے گھبرا گیا ..... سورج تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ اگر لاش کسی نے وہاں پڑی دیکھ لی تو؟ نہ جانے بھنگی کو آج کیوں دیر ہو گئی ہے اسے یاد آیا کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور پھر اتوار کا دن تھا جب وہ ضرور گرجے جایا کرتا تھا۔ اسسٹنٹ نے سوچا۔ بایں ہمہ فرض شناس تھا۔ آج دیر سے آتا لیکن آتا ضرور۔

نہ جانے لاش وہاں کتنی دیر سے پڑی تھی۔ غالباً اس کی بو سونگھ کر کچھ کتے اس کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے اور کوؤں نے سر پر کائیں کائیں کا شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ اسسٹنٹ نے انہیں مار بھگانے کے لئے ڈنڈا پکڑ لیا لیکن وہ یوں جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ انہیں دور ہٹانے کے لئے اسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ بھاگا بھاگا اڈے کی مختصر سی ورکشاپ میں گیا اور وہاں سے موبل آئیل اور گریز میں تر الیٹا ایک چھوٹا سا کپڑا اٹھا لایا تاکہ اسے لاش کے منہ پر ڈال دے۔ لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی۔ اس کی عمر بمشکل بیس بائیس برس تھی۔ چہرے کے خدوخال سے مظلوم معلوم ہوتی تھی۔ اس عمارت کی مانند جو قبل از وقت حوادثِ زمانہ کے باعث گر گئی ہو۔

اسسٹنٹ نے غور سے دیکھا۔ عورت کی آنکھیں موٹی تھیں، ابرو کمان جیسے، ہونٹ خمدار اور بھرے بھرے لیکن ان پر جابجا عجب کیسے آبلے سے نکل آئے تھے جن میں سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھیں اب نیم وا تھیں اور اوپر کی طرف کسی چیز کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں۔ اسسٹنٹ معاً چونکا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سر پر چیلیں اور کوّے منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ اس کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر رہی ہو۔ "..... کہیں؟ ..... کہیں؟ اسے کہیں دیکھا ہے۔" اس نے سوچا۔ ہاں۔ یہ عورت اکثر دوائی کی شیشی ہاتھ میں پکڑے آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی ہوتی، گردن جھکی ہوتی، پاؤں بوجھل جیسے ان سے بھاری پتھر باندھ دئے گئے ہوں۔ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے کے ساتھ مٹھوں سے گڑی دکھائی دیتی۔

"باؤ! باؤ!! دوائی کے لئے چار پیسے ..... ڈاکٹر کہتا ہے ..... آرام آجائے گا۔ آرام۔" وہ یہ کہتے کہتے رک جاتی — پھر خود کلامی کے انداز میں کہتی۔ "نہ معلوم۔ کب آرام آئے گا۔"

تب اس کی گھگی بندھ جاتی، آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ یوں معلوم ہوتا کہ وہ انہیں پی جا رہی ہے اور یہ الفاظ اس کے منہ سے یوں نکلتے جیسے کسی گہرے غار سے نکل رہے ہوں ..... اس کے پیٹ کی نہلاؤں سے۔ اسے مانگتے شرم سی بھی آتی اور یوں بھی محسوس ہوتا جیسے اپنا حق مانگ رہی ہو۔

"صرف چار آنے ملے ہیں۔ دوائی بارہ آنے کی آئے گی ..... دو دن سے نہیں پی۔ بڑا درد ہو رہا ہے۔" وہ اپنے بیان کی صداقت ثابت کرنے کے لئے مٹھی کھول کر دکھاتی۔ کچھ دیر کے لئے سر جھکائے منیجر کے جواب کا انتظار کرتی۔ کچھ مل جاتا تو بھی نہ ملتا تو بھی جسم کے اس حصے کو مشکل سے اٹھاتے ہوئے واپس مڑ جاتی اور اپنا راہ لیتی۔

اس اثنا میں اسسٹنٹ کو بس آنے کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ لاش راستے میں پڑی تھی۔ کاش وہ اس پر پٹرول ڈال کر ہی اسے

جلا دیتا۔ بس کا راستہ خواہ مخواہ روکے پڑی تھی لیکن وہ اس کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر رک گیا۔ بہرحال وہ لاش کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کس طرح گھسیٹ سکتا تھا۔ بس ہارن دیتی صحن میں آ پہنچی۔ یکدم بریک لگنے کی آواز آئی۔ اسسٹنٹ نے معاً مردہ کے چہرے پر غیر ارادی طور پر میلا کپڑا ڈال دیا۔ بس اس کو راستے میں کھڑا دیکھ کر یکدم رک گئی تھی۔ اس کا ڈرائیور لاش کو دیکھ کر چونک اٹھا: "ایکسیڈنٹ!"

"کہاں؟"

"وہ دیکھو!"

"کوئی مرا پڑا ہے۔"

"کون ہے؟" بس کی سواریاں باہر جھانکتی ہوئی بول اٹھیں۔

"گھبراتے کیوں ہو، کوئی قتل یا خون تھوڑا ہوا ہے:" گاڑی میں سوار ایک پولیس افسر نے بڑی بے اعتنائی سے تبصرہ کرتے ہوئے آرام سے باہر نکلتے ہوئے کہا لیکن اس سے پہلے سب سواریاں اتر کر لاش کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔

"سلام ہے تھانیدار صاحب!" اسسٹنٹ نے پولیس افسر کو پہچانتے ہوئے کہا۔ مذکور بڑے تھانے کا انچارج تھا جو دورے سے واپس آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے لاش کے بارے میں موقع پر تفتیش شروع کر دی۔ لاش ایک نوجوان عورت کی تھی۔ پبلک کے سامنے ایسے کیس کو اپنے ہمراہ سپاہی کو سونپ کر چلے جانا بھی تو اس کی خلاف شان تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ قتل کی واردات نہ تھی۔ نوجوان عورت قدرتی موت مری تھی۔ ناظرین سواریاں اس کا منہ جو کپڑے سے ڈھکا تھا دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں۔

سب انسپکٹر نے سپاہی کو متوفی کا چہرہ بے نقاب کرنے کا حکم دیا۔

"کیا کوئی اسے شناخت کر سکتا ہے؟" اس نے ہجوم سے پوچھا۔

بہت سے لوگوں نے نظریں نیچی کر لیں۔ کچھ آنکھیں بھر آئیں۔ کئی چہروں نے مجبوراً انکار میں سر ہلایا۔

بس ڈرائیور اور عملے کے افراد کے منہ پر لگی مہر سکوت اور مضبوط ہو گئی۔

"اگر اسے کوئی نہیں پہچانتا تو لاوارث سمجھ لینا چاہئے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اتنے لوگوں میں سے اسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا" سب انسپکٹر بولا۔

جواب میں بوڑھے کانسٹیبل نے بڑے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا: "یہ واقعہ تب کا ہے جب جناب پہلی بار اس جگہ تعینات ہوئے تھے۔"

"آدمی اتنے کیسز میں کون کون سا یاد رکھے۔" سب انسپکٹر نے ابرو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"حضور یہ عورت سلیماں ہے۔ پانچ برس ہوئے یہ اسی بس سروس کے دس آدمیوں کے پنجے سے صبح سویرے نکل کر پاگلوں کی طرح ننگی بھاگتی دیکھی گئی تھی۔"

"اوہ، سلیماں! تو آج مر گئی۔ وہ کیس تو مدت کا کلوز ہو چکا ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دو۔ موت کسی اندرونی بیماری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔" سب انسپکٹر بیت کی چھڑی زور سے اپنی ٹانگ پر مارتا ہوا ایک لمحہ کے لئے رک کر لاش کو آخری بار دیکھتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔

مجمع میں سے ایک شخص نے اپنے کندھے سے ایک سفید چادر اتار کر مرحومہ کے بدن پر ڈال دی۔

پاگل کون؟

منظور الٰہی

وہ حسبِ معمول کرسیِ عدل پر متمکن تھا۔ مقدمے پیش ہو رہے تھے، فاضل وکلاء بحث کرتے، مدلل تقریریں کرتے، سزا بحال رہتی یا ملزم بری ہو جاتے، وہ ایک مشین کی طرح کام کئے جا رہا تھا، ایک نظر ملک کے قانون پر تھی دوسری انصاف کے عمومی اصولوں پر، فہرست مقدمات چھٹتی جا رہی تھی کہ پولیس کے دو سپاہی ایک ننگے دھڑنگے کو ہتھکڑی باندھے اندر لے آئے اس کے جسم پر برائے نام لنگوٹی تھی۔ "پاگل ہے حضور، خلقِ خدا کو تنگ کرتا ہے، بچوں کو پتھر مارتا ہے۔" .... "میں پاگل نہیں ہوں۔ میں نے اسلام کی راہ میں پکے مکان اور مال مویشی چھوڑ دیئے اور ہجرت اختیار کی لیکن میرے بھائی اپنی املاک نہ چھوڑ سکے، میں مشرقی پنجاب میں انہیں ملنے گیا تھا لیکن مجھ سے ان کی زبوں حالی نہ دیکھی گئی، میرے دل پر اثر ہو گیا تھا اور میں نے واپس آ کر اپنا مال و متاع لٹا دیا لیکن اب میں اچھا ہوں، مقامی اسلامیہ سکول میں بدستور چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا ہوں، مسلمان پیغمبرؐ کے راستے سے بھٹک گئے ہیں مجھے اس کا بڑا دکھ ہے۔" اس کے لفظوں میں ربط اور تقریر میں تسلسل تھا، وہ سوالوں کا صحیح جواب دیتا تھا وہ پاگل نہیں تھا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔

ایک ماہ بعد اسے پھر پابجولاں لایا گیا، اس کا جنون خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا، اب اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور زبان جواب دینے سے عاری، اسے تن من کا ہوش نہ تھا۔ بیوی کی گریہ وزاری کے باوجود اسے علاج کے لئے پاگل خانے بھیجنے کا حکم ہوا، بیوی بچوں کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ "جب تک محمدو پاگل خانے میں ہے اس کے گھر آٹا برابر پہنچاتے رہنا۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں اردلی سے کہا تھا۔

جیپ کی مسلسل گڑگڑاہٹ کے سوا سڑک کے دونوں طرف اتھاہ اطمانت کا احساس تھا، تا حدِ نظر گندم کی مغرور فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں اب ہم پختہ ہوا ہی چاہتی ہیں، گزشتہ بارش ہمارے حق میں امرت تھی، ہمارے خوشے بھر چکے، ہم اپنے سنہرے خزانے اگل کر دہقان کا دل نہال کر دیں گی، چھ ماہ اِدھر مایوسی کا دورِ دورہ تھا، سالوں کا اندوختہ کسان کی ساری کائنات سیلاب کی نذر ہو گئی تھی، پانی پھر جانے سے زمین اس حد تک نم آلود ہو چکی تھی کہ "وتر" آنا محال معلوم ہوتا تھا، فصل نہ ہوئی تو جئیں گے کس پر؟ یہ تھا سوالیہ نشان ہر کسان کے چہرے پر ...... لیکن بل کھاتی ہوئی مغرور سڑک، ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں نہائی ہوئی چاندنی ایسی اداس روشنی میں لپٹی ہوئی سڑک اور دونوں کنارے پر لہراتے درخت جیسے ایک آسیبی طلسم میں اسیر ہوں، دم بخود ہوں اور گھنیری پُر افسوں زلفوں کے سائے میں مانگ دوڑتی چلی جائے۔

باہر گھٹا ٹوپ اندھیری رات، ایک طوفانی رات چیخ رہی تھی، ہوا کی تیز سیٹیاں اور گیدڑوں کی مہیب دلدوز آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی تھیں

ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی گزشتہ تیرہ مہینوں کو اپنے ہالے میں لئے تھی۔

عالم تصور میں کوٹھی ویسے ہی سجی تھی، نشست گاہ میں Madonna of The street کی تصویر معصومیت کی مظہر، قصر الحمرا کا Facade کانسٹیبل کی Reproductions سب اپنی جگہ آویزاں تھیں، کھانا کمرہ کی دری میں مختلف رنگوں کی آمیزش نرمی کے ساتھ چیک کے رہ گئی تھی جیسے Mosaic pattern ہو۔ چھوٹا حمام اور بالکنی، اونچے دروازوں کو ڈھانپے ہوئے دبیز پردے سب چیزیں اپنی جگہ پر جامد و ساقط تھیں۔ مکین جا چکے تھے لیکن یہ چیزیں کسی سحر کے تابع فرمان (زیر اثر) تھیں۔ اس کے لئے ایک ایسے گھر کا تصور ناممکن تھا جو لٹ چکا ہو جس کی آرائش کی چیزیں ایک ایک کر کے نوچ لی گئی ہوں، کمرے اور برآمدے کوڑا کرکٹ سے اٹ گئے ہوں۔

نقل مکانی تکلیف کا باعث کیوں ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ قیام دو ایک سال سے زیادہ نہیں ہم اس خطۂ زمین سے اس مکان اور پائیں باغ سے مانوس ہو جاتے ہیں، ہم مستقر سمجھ لینے کی بجائے اسے دوام بخش دیتے ہیں، وقتی طور پر سہی۔

آخری دن کئی لوگ ملنے آئے تھے، رخصت کرتے وقت انھوں نے رسمی اور غیر رسمی باتیں کی تھیں، دنیا داری کی باتیں تھیں اور ایسی باتیں بھی جن سے اخلاص کی بو آتی تھی۔ ایک وکیل صاحب نے compliment دیا "جب آپ یہاں آئے تھے تو ہم سمجھے تھے آپ بہت شریف آدمی ہیں۔" اغلباً اس کی سخت گیری کی طرف اشارہ تھا، دریا کے پار بسنے والا بڈھا بابا کالو جو اتنا بہرہ تھا کہ اس سے بات کرتے چیخنا پڑتا، جس نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن اب بیشتر زمین یا تو بٹوارے کی نذر ہو چکی تھی یا سرحد کے قرب کی وجہ سے جاتی رہی تھی، جو خیریت پوچھنے کے جواب میں ہمیشہ دو باتیں کہا کرتا۔ "جی تہاڈا مہرچا ہیدا اے ...... جی بڑی خواہش سیں سکول جیسے بندیاں ہاتی ہو جاوے پر نظر آندا اے حسرت نال ای لے جانی اے۔" آخری ملاقات میں بابا کالو کا گندمی سالخوردہ چہرہ وفورِ جذبات سے تمتما گیا، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ممنون مدد و صحت یاب ہو کر پاگل خانے سے لوٹ آیا تھا۔ وہ آخری ملاقاتی تھا، الوداع کہتے وقت اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں اور بیتاب آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "میں دعا کرتا ہوں قیامت کے دن تو اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ اٹھے، اس روز بھی میں یہ منظر دیکھ سکوں اور میری تشنہ روح اس نظارے سے شادکام ہو۔" اور زود کھردرے گنوارانہ ہاتھوں نے اس کا چہرہ ہالے میں لے لیا۔

اس پر درشت سیرت ہونے کا الزام لگایا گیا تھا حالانکہ وہ کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ عامیانہ پن، عام لوگوں کی سب ambitions اس میں موجود تھیں، شیور لیٹ ۵۶ کی خواہش، گلبرگ میں بنگلہ بنانے کا جنون اور ان آرزوؤں کا ماتم جو امتداد وقت سے حسرتوں میں بدل گئیں ناکردہ گناہوں کے لئے داد طلبی ـــــ گناہ جو جرأت رندانہ کے فقدان کے باعث اس سے سرزد نہ ہو سکے۔ (گناہ جو کر سکنے کی جرأت وہ اپنے آپ میں نہ پا سکا تھا) کبھی بنگلہ بنانے کی خواہش شیورلیٹ ۵۶ پر غالب آ جاتی کبھی بنک بیلنس برقرار رکھنے کا خیال دونوں پر حاوی ہو جاتا (کبھی بیلنس کی توانائی ان دونوں پر بازی لے جاتی) اور اسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایک بے بس مکڑی کی طرح ماہا اور لوبھ کے جال میں پھنس گیا ہے کبھی اس کے سینے میں لاتعلقی اور کبر نفس (خودی اور سماوراثیت) کا الاؤ روشن ہو جاتا حرص و آز اس آگ میں تحلیل ہو جاتی اور کندن دمکنے لگتا، خواہشات کی جگہ خود اطمینانی $\frac{\text{serenity}}{\text{complacency}}$ لے لیتی اور یہ موڈ مہینوں طاری رہتا۔

اسے اپنے گھٹیا پن کا شدید احساس اس روز ہوا جب غصے سے بے قابو ہو کر اس نے ایک بس ڈرائیور کو مارا تھا کیونکہ باوجود ہارن کرنے کے اس نے سڑک کا آدھا حصہ نہیں چھوڑا تھا (آدھی سڑک نہیں چھوڑی تھی) بس ڈرائیور کبھی سڑک نہیں چھوڑتے انہیں سبق کرنا چاہئے لیکن یہ بربریت Boomarang کی طرح خود اس کے اعصاب پر مسلط ہو گئی تھی اور اسے یہ خیال ستاتا رہا کہ بس ڈرائیور پر ہاتھ اٹھانا کمینگی تھی۔

ویران سڑک پر کوئی اکا دکا راہگیر اور خالی تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی Monotonous سست آواز، جس میں تندی نہیں ہوتی (نہ ہو) زندگی نہیں ہوتی، شعلے بلند نہیں ہوتے، سموں کا زمین کو چھونا گوارا کر لیا جاتا ہے اور ہنکنے والا (کوچوان) خون گرما دینے والی (خون کو گرمانے والی، خون میں حدت پیدا کرنے والی) خون کی گردش تیز کرنے والی کوئی شرالاپنا چاہیے تو احساسِ محرومی اس خواہش کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کی روح ایک ایسے گھوڑے کی مانند آگے بڑھ رہی تھی جس کے ارادوں میں عزم و توانائی ہو نہ منزل کا تعین نہ ہو۔ کبھی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ تارِ عنکبوت توڑ دیتا اور ایک ارفع مقام سے اپنا تجزیہ کرتا تو عام دنیاوی خواہشات حقیر نظر آنے لگتیں (دکھائی دکھلائی دیتیں) اور ایک احساسِ برتری کے تحت ان کے پیچھے بھاگنے والے لوگ (ان کا پیچھا کرنے والے لوگ) کیڑے مکوڑے حشرات الارض نظر آتے (دکھائی دیتے) اور اس کا یقین ایمان میں بدل جاتا کہ وہ کوئی بہتر مقصد لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ کبھی وہ یہ ضرور سوچتا انسانی زندگی کا راز کیا ہے؟ عجیب دنیا دکھوں کا گھر ٹھہری تو تخلیقِ آدم سے منشائے ایزدی کیا تھا؟ ہم ہمیشہ کرموں کا پھل اس دنیا میں نہیں پاتے مگر بسا اوقات بڑے بڑے شیطان سستے داموں چھوٹ جاتے ہیں اور چند ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔ ہزارہا سال سے درندگی کا بہیانہ مظاہرہ "دام و دد" کی زبوں حالی اور آرزوئے "انسان" کی تشنہ کامی (اور "انسانم آرزوست" کی تشنہ کامی "اور "انسان" کا قحط الرجال) ظہور پذیر کرنے والے "فرشتوں" کا ہجوم، مذہب کی روح سے بیگانگی، مذہب کے اجارہ داروں کی خود بینی اور عوام فریبی، شرابِ طہور، حور و قصور استعارہ ہے "قربِ جمال" کے لئے قربِ دوست جنت ہے اور فراق میں روح انگاروں پر لوٹتی ہے، خدا کے نیک بندے کون ہیں؟ خدا کیسے ملتا ہے؟ بلھے شاہ رب اُنہاں نوں ملدا نیتاں جنہاں دیاں اچھیاں؟ طاغوتی قوتوں کے بے پناہ سیل سے متاثر ہو کر، زندگی میں سزا و جزا کے فقدان سے متاثر ہو کر، انسان کی مجبوریوں سے متاثر ہو کر اس نے حیات بعد الموت کو استدیاہ کی نظر سے دیکھنا چاہا تھا۔۔۔۔۔۔

"محمد و پاگل خانے سے ٹھیک ہو کر لوٹ آیا ہے کل الوداع کہنے آیا تھا، دعائیں دے رہا تھا"

"تو پھر محمدو نے کیا کہا تھا، کیا دعا دی تھی؟" بیوی نے کھانے کی میز پر پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے کہا تھا۔۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ۔۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور بلکتے بچے کی طرح سسکیاں لینے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ محشر کے تپتے ہوئے صحرا میں وہ تن تنہا اپنے خالق کے حضور ربِ ذوالجلال کے سامنے کھڑا ہے اور گریہ و زاری سے ہم آہنگ ہو کر اس کی روح اک مجسم شعلہ بن گئی ہے اور کمال حدت سے خود اس شعلہ جوالہ کے اندر صد ہا شعلے فروزاں ہو گئے ہیں، پھر ٹپ ٹپ ایک ایک قطرہ گرتا ہے گرم آنسو کا قطرہ، رقت و شرمساری کا قطرہ، ترحم و تضرع کا قطرہ، پھر ان قطروں نے اس سرکش دریا کی شکل اختیار کر لی جو کنارے توڑ کر نکل جاتے اور ان کے بہاؤ سے وہ شعلہ فرو ہونا شروع ہوا اور اسے وہ تسکین محسوس ہونے لگی جس کی لذت کو وہ جسمانی ہیولیٰ میں ترس گیا تھا، تشکک و اوہام کا انبار خس و خاشاک کی طرح اس سیل کے سامنے بہہ گیا، Scepticism کے آبلے پھوٹ گئے اور لایقینی کا مواد بہہ نکلا۔۔۔۔۔۔

جب اس نے سر اٹھایا تو دو خوبصورت آنکھیں اسے حیرانگی سے گھور رہی تھیں۔

مریم

رتن سنگھ

پلنگ نمبر چھ کے مریض بجاج کے دل میں اپنے وارڈ کے تمام مریضوں کے لئے جلن سی پیدا ہوگئی تھی۔ دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک پر شام کے چار بجتے ہی باقی مریضوں کے ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جاتا لیکن اس کے پاس کوئی نہ آتا۔ اسی بات کا اسے غم تھا۔ اس کے پاس آتا بھی کون؟ چند برس پہلے بیوی مرگئی تھی جس کے غم میں ادھیڑ عمر میں ہی اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں۔ گال لٹک گئے تھے۔ اکلوتا لڑکا تھا۔ اس نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ ایک تجارتی جہاز کے ساتھ عرب گیا ہوا تھا اور اس کا تین مہینے سے پہلے واپس لوٹنا ناممکن تھا۔ خود وہ ایک فرم میں معمولی دفتری تھا۔ دن بھر پرانی فائلوں کو چھانٹنا، رکھنا، یہی اس کا کام تھا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی کہ کسی کی خیریت ہی پوچھ لیں۔ ایسا خشک سا ماحول تھا کہ اگر کوئی آدمی دس پندرہ دن کی چھٹی چلا جاتا تو اس دفتر کے کام کرنے والوں کو اس وقت تک پتہ ہی نہ چلتا جب تک کہ دفتری کاروبار کے سلسلے میں دوسرے کے پاس نہ جانا پڑتا۔ ایسی حالت میں کسی کو کیا پتہ چل سکتا تھا یا کسی کو کیا فکر ہو سکتی تھی کہ بجاج ہسپتال میں پڑا ہے یا اس کی خبر ہی لے آئیں۔

جب بجاج ہسپتال میں داخل ہوا تو اسے معمولی بخار اور کھانسی تھی۔ گھر پر کوئی اور دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ اکیلے پڑے رہنے سے اسے بڑی تکلیف اور الجھن سی ہوتی تھی اس لئے اس نے ہسپتال میں داخل ہو جانے کو ہی ترجیح دی لیکن ہسپتال میں آکر اس کی ذہنی الجھن اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک تو بخار اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ سر میں درد رہتا تھا۔ اس پر ملاقات کے وقت جب اس کے پاس کوئی نہ آتا تو وہ پریشان ہو جاتا۔ اس پریشانی سے بچنے کے لئے وہ چار بجنے ہی بلکہ اس سے دس منٹ پہلے ہی چادر سے منہ ڈھانپ کر سونے کی ناکام کوشش کرتا تو تھوڑی دیر بعد پانچ نمبر پلنگ کے پاس رکھے ہوئے لوہے کے ریک پر کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی۔ وہ جانتا کہ پانچ نمبر مریض کا وہ لڑکا آ گیا ہے جو ہر دو منٹ بعد اپنا دایاں کندھا ہلاتا رہتا ہے اور وہ اپنے باپ کے لئے لائے ہوئے پھل وغیرہ ریک پر رکھ رہا ہے۔ وہ کروٹ بدلتا تو سات نمبر کے مریض کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی "پہلے سے اچھا ہوں بس کمر کا درد باقی ہے، یہ ٹھیک ہو جائے تو......" وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھتا۔ بغل کے مریضوں کی طرف گھور کر دیکھتا۔ ایک نظر سارے وارڈ کا جائزہ لیتا۔ ڈیوٹی نرس اپنی میز پر جھکی رجسٹر الٹ پلٹ رہی ہوتی۔ اسی کونے میں آکسیجن کے سلنڈر پڑے ہوئے ہوتے۔ سب کے سب مریض کچھ نیم دراز، کچھ بیٹھے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں کر رہے ہوتے۔ اس سے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کے دل سے ٹیس سی اٹھتی۔ وہ جھنجھلاہٹ میں اپنی انگلیاں چبانے لگتا۔ ایک دن تو اس نے اپنی

چھوٹی انگلی کو اتنے زور سے کاٹ دیا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ پورے وارڈ کے مریضوں اور دوسرے لوگوں کی توجہ اس کی طرف کھنچ گئی۔ ڈیوٹی نرس بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تو اسے خود ہی اپنی حماقت پر غصہ آ گیا۔

اس کے بعد وہ اس ماحول سے دور جانے کے لیئے اپنے پلنگ کے سامنے باہر کی طرف کھلنی کھڑکی سے جھانکنے لگتا جہاں اسے ایک برگد کے پیڑ کا کچھ اوپری حصہ، ایک پرانی وضع کے بنے ہوئے مکان کا چبوترہ، جس کی سفیدی کا رنگ کالا پڑ گیا تھا اور تھوڑا سا نیلا آسمان دکھائی دیتا تھا۔ چبوترہ کسی طرح بھی جاذب نظر نہیں تھا۔ خالی آسمان میں بھی اس کے لیئے کوئی کشش نہیں تھی۔ اس لیئے اس نے سب سے پہلے برگد کی نظر آنے والی شاخوں کا شمار کیا جو کل ملا کر سات ہوتیں۔ پھر وہ کسی نہ کسی شاخ کے پتے گننے میں محو ہو جاتا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، اور نوں! ...... اور پھر وہی سلسلہ۔ کچھ دیر بعد اس کے سر کا درد اور بڑھ جاتا اور کمزوری کے باعث کمرہ گھومتا ہوا جب چادر اوڑھ کر لیٹ لگتا تو اس وقت ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہوتا۔ ملاقاتیوں سے کمرہ خالی ہو گیا ہوتا۔ اس سے اس کے دل کو تھوڑا سا سکون ملتا۔ ٹھیک چھ بجے نرس کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اس کے پاس آتی۔ اس کی نبض دیکھتی، حرارت لیتی، دوا پلاتی اور کھٹ کھٹ کرتی دوسرے پلنگ کی طرف بڑھ جاتی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بجاج پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتا۔ اس وقت سورج ڈھل رہا ہوتا۔ پرندے جنہوں نے اس برگد کے پیڑ پر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے غول در غول لوٹ رہے ہوتے اور اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھتے۔ بجاج ان لوٹتے ہوئے پرندوں کو اس وقت تک گنتا اور دیکھتا رہتا جب تک کہ وہ کمزوری کے باعث دوبارہ تھک نہ جاتا یا اندھیرا بڑھ جانے سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس کا روز کا معمول تھا۔

اسے ہسپتال میں داخل ہوئے پندرہ دن بیت گئے لیکن کسی قسم کا فائدہ ہونے کی بجائے حالت دن بدن دگرگوں ہوتی گئی۔ شروع میں جب وہ آیا تھا تو اس کی حرارت سو ڈگری سے کم ہی ہوتی تھی جو اب بڑھتی بڑھتی ایک سو چار ڈگری تک پہنچ گئی تھی۔ کھانسی پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔ کئی مرتبہ تو وہ چھاتی میں درد بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ذہنی الجھن تھی جو کھانسی اور بخار سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اسے شکایت تھی کہ پانچ نمبر کا مریض رات کو سوتے میں اس قدر زور زور سے خراٹے بھرتا ہے کہ اس کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک دفعہ ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس سے بھی شکایت کی تھی۔ کہنے کو تو وہ یہی کہتا ہے لیکن دراصل اس کی شکایت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس مریض کے پاس جس دن زیادہ ملاقاتی آ جاتے تو وہ بیٹھنے کے لیئے اس کا سٹول لے لیتے جو اس کی چارپائی کے پاس بیکار پڑا رہتا تھا۔ اسے یہ بھی قطعی منظور نہیں تھا کہ جن لوگوں سے وہ نفرت کرتا ہے وہ اسی کی چیزوں کا استعمال کریں۔ اسی لیئے جب تک اس کا سٹول وہ لوگ لئے رہتے وہ دل ہی دل میں جلتا رہتا، کڑھتا رہتا اور بعض اوقات تو وہ دل ہی دل میں انہیں گندی گالیاں بھی دے ڈالتا۔ سات نمبر کے مریض سے تو وہ اور زیادہ جلتا تھا۔ وہ گورے چٹے رنگ کا نوجوان ٹائیفائیڈ کا علاج کرانے کے لیئے اس سے ایک ہفتہ بعد داخل ہوا تھا۔ اب ٹھیک ہو گیا تھا، صرف کمزوری باقی تھی۔ اسے چارپائی سے اٹھ کر باہر برآمدے میں ٹہلنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے برعکس وہ معمولی بخار میں داخل ہوا تھا اور اب دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی اس کے بارے میں تشویش بڑھ گئی تھی۔ پہلے ڈاکٹر اسے دو دفعہ دیکھنے کے لیئے آتے تھے لیکن اب دن میں چھ چھ سات سات مرتبہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر بھی اس کی حالت اس حد تک خراب ہو گئی کہ اس کی زندگی سے ناامید ہو گئے۔ اب اس کی حرارت ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ گئی تھی۔ چھاتی کا درد بھی بڑھ گیا تھا۔

ایک دن وہ کمزوری کی حالت میں تکیے سے ٹیک لگائے حسب معمول کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ ابھی اس نے پند

ایک شاخ کے پتے گننے لگتے کہ ایک آدمی اس سے مخاطب ہوا۔ "بھائی صاحب! اگر اجازت دیں تو آپ کا سٹول لے لوں۔ آپ کا پانی کا گلاس ایک پر رکھے دیتا ہوں۔" اب اس نے سٹول پر پانی کا گلاس رکھنا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ سٹول مانگنے والے کو انکار کر سکے کہ سٹول خالی نہیں ہے۔ بجاج نے نفرت سے سٹول مانگنے والے آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ پانچ نمبر مریض کو ملنے کے لئے آئے ہوئے چند ملاقاتیوں میں سے ایک تھا۔ پھر یکلخت اس کی نفرت کا لاوا جو اس کے سینے میں اُبل رہا تھا پھوٹ پڑا۔

"نہیں۔" اس نے نہایت کمزور ہونے ہوئے بھی پوری طاقت سے چیخ کر کہا۔ اس کے بعد وہ کمزوری کے باعث ہانپنے لگا اور آرام کرنے کے لئے چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

رفتہ رفتہ وہ اس قدر کمزور ہو گیا کہ اس کے لئے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھنا اور کھڑکی سے باہر برگد کے پیڑ کے پتے گننا بھی ناممکن ہو گیا۔ اب وہ پلنگ پر ہی کروٹیں بدلتا رہتا' آہیں بھرتا رہتا اور پاس کے مریضوں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ایک دن صبح وہ سیدھا لیٹا چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ وارڈ کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے اس طرف کروٹ بدلی۔ دیکھا تو وارڈ کے ملازم ایک ضعیف العمر آدمی کو اسٹریچر پر لٹائے لا رہے تھے۔ اسٹریچر کو ڈیوٹی نرس کی میز کے ساتھ بچھی ہوئی لمبی میز پر رکھ دیا گیا۔ نرس نے مختلف رجسٹروں میں مریض کا نام درج کر لینے کے بعد سات نمبر پلنگ کی طرف اشارہ کیا جسے پہلے مریض نے ایک گھنٹہ پہلے خالی کیا تھا۔ جب نئے مریض کو بجاج کے ساتھ والے پلنگ پر لٹا دیا گیا تو اسی وقت کمرے میں ڈاکٹر داخل ہوا۔ اس نے نئے مریض کا معائنہ کیا۔ دوا تجویز کی اور نرس کو کچھ ہدایت کر کے چلا گیا۔ نیا مریض تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کراہتا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا بجاج غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ شاید اس مریض کا کوئی وارث یا دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اسی لئے آج صبح داخل ہوتے وقت کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا کیونکہ جتنے بھی مریض اس نے وارڈ میں داخل ہوتے دیکھے تھے' اس وقت کوئی نہ کوئی آدمی مریض کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اسے ذرا سی تسکین ہوئی اور اسی لئے وہ نئے مریض کے بارے میں مزید جاننے کے لئے بے چین ہو گیا۔ وہ ابھی سوچ نہ پایا تھا کہ کس طرح سلسلۂ کلام شروع کرے کہ نئے مریض نے زور زور سے کراہنا شروع کیا۔ بجاج نے دیکھا' وہ اپنے پیٹ کو پکڑے کراہ رہا تھا۔ بجاج سمجھ گیا کہ نئے مریض کے پیٹ میں شدید قسم کا درد ہے۔ نئے مریض سے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے اس نے پوچھنا شروع کیا:

"آپ کے پیٹ میں درد ہے کیا؟" نیا مریض منہ سے تو کچھ نہ بول پایا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاں میں ذرا سا سر ہلا دیا۔

"کب سے؟" بجاج کے دل میں نئے مریض کے لئے ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی۔

نئے مریض نے کچھ بولنا چاہا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ بتائے اسے کھانسی آنے لگی۔ اتنے میں نرس اسے دیکھنے اور دوا پلانے لگی۔ بجاج ایک طرف لیٹا تھک سا گیا تھا اس لئے کروٹ بدل کر چادر اوڑھ لی۔ وہ چاہتا تھا کہ نئے مریض کو بتائے کہ وہ کسی قسم کا فکر نہ کرے جلد ٹھیک ہو جائے گا' یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے اسے نیند آ گئی۔ شام کو جب وہ سو کے اٹھا تو چار بج چکے تھے۔ ملاقات کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ بجاج نے نئے مریض کی طرف دیکھا تو اسی وقت اس کی نئے مریض کے لئے دن بھر کی ہمدردی نفرت میں بدل گئی۔ یہ دیکھ کر بجاج کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ نئے مریض کے ملاقاتیوں کی تعداد باقی وارڈ کے کل ملاقاتیوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ اس وقت اس نے نئے مریض کے ملاقاتیوں کو گنا تو وہ کل ملا کر سولہ تھے۔ کچھ اس کے پلنگ کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ کچھ پلنگ کا آسرا لے کر بیٹھے تھے۔ باقی دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ٹولی اس کے اپنے پلنگ کے پاس بھی

کھڑی تھی۔ ان کا منہ بھی اس کے پلنگ کی طرف ہی تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا جس سے اسے کسی حد تک خوشی اور دل کو قدرے تسکین سی حاصل ہوئی۔ اس نے سوچا کہ باقی ملاقاتی تو یہی سوچیں گے کہ یہ لوگ اسی کو ملنے آئے ہیں۔ گو یہ بات اسے بعد میں مضحکہ خیز سی محسوس ہوئی لیکن تب بھی اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے اس کا اس ڈھنگ سے سوچنا کافی تھا۔ گو اس میں ہمت نہیں تھی تب بھی وہ کوشش کر کے اٹھا اور پلنگ کے دوسری طرف جہاں تین آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے تکیئے کی ٹیک لگا کر اس طرح نیم دراز ہو گیا جس سے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہو کہ وہ ان سے باتیں کر رہا ہے۔ ان کی بات چیت سے بجاج کو اتنا پتہ چل سکا کہ نیا آیا ہوا بوڑھا مریض بہت بڑا شاعر ہے۔

بجاج کو اپنی زندگی میں نہ تو کبھی شاعری سے لگاؤ رہا تھا اور نہ وہ شاعری کی اہمیت کو ہی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ تب بھی نئے مریض کے لئے تھوڑی دیر پہلے جو جلن اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ کسی حد تک کم ہو گئی اور اسی لئے اس نے اپنے پاس کھڑے لڑکوں میں سے ایک کو بلا کر خود ہی کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اس کا سٹول بیٹھنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ بجاج کی اس پیشکش کو ان لوگوں نے شکریہ کہہ کر قبول کر لیا۔ اس سے بجاج کے دل میں ہلکی سی خوشی پیدا ہوئی۔

نئے آنے والے مریض کے ملاقاتیوں میں ایک آٹھ دس سال کی لڑکی بھی تھی جو دیکھنے میں بڑی بھولی اور بہت باتونی تھی۔ ایک دن جب بہت سے ملنے والے نئے مریض کو گھیرے ہوئے تھے تو لڑکی وارڈ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بجاج نے اشارہ کر کے اسے اپنی طرف بلا لیا۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹی؟"

"سلمیٰ!"

"بہت اچھا نام ہے۔"

لڑکی کچھ شرما سی گئی۔ "دادا بھی یہی کہتے ہیں۔"

"پڑھتی ہو؟"

"ہاں! تیسرے درجے میں۔"

اس کے بعد وہ لڑکی چلی گئی۔ بجاج ہر روز اسے کسی نہ کسی بہانے بلا لیتا۔

"بیٹا ذرا پانی کا گلاس پکڑا دو۔" حالانکہ اسے قطعاً پیاس نہ ہوتی۔ پانی کا ایک گھونٹ لیتا اور پھر گلاس کو رکھ دیتا۔ اس کے بعد لڑکی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کر دیتا۔ لڑکی بھی اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں لڑکی نے بجاج سے عجیب سا سوال کر دیا:

"آپ سے کوئی ملنے نہیں آتا؟"

بجاج نے کمزوری کے عالم میں اپنی کمزور آنکھوں سے اس ننھی لڑکی کی طرف غور سے دیکھا جو جواب کے انتظار میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بجاج نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "نہیں بیٹا" اور پیشتر اس کے کہ لڑکی اس سے دوسرا سوال کرتی وہ قدرے سنبھل گیا "تم جو مجھے ملنے آتی ہو۔"

"میں! میں! میں تو اپنے دادا سے ملنے آتی ہوں۔" لڑکی کچھ دیر رکی اور پھر کہنا شروع کیا۔ "اچھا! کل سے میں تمہارے پاس بھی بیٹھا کروں گی۔ پہلے سے زیادہ۔ مجھے کہانی سناؤ گے نا؟ میرے دادا مجھے روز رات کو کہانی سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب سے وہ بیمار پڑے ہیں بول ہی نہیں پاتے۔" یہ سب وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

تب سے اس لڑکی نے روز بجاج کی پاس تھوڑی دیر بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ اس سے طرح طرح کی عجیب و غریب باتیں کرتی۔ اب بجاج کے دل میں بھی اپنے ساتھی مریضوں کے لئے کوئی جلن نہیں رہ گئی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ صحت ہونے لگی جب بجاج اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ سکے تو لڑکی روز اس سے کہانی سننے کے لئے اصرار کرتی۔ پہلے وہ دن بھر باہر برگد کے پیڑ کے پتے گنتا رہتا تھا اب وہ دن بھر اس ننھی لڑکی کا انتظار کرتا رہتا، سوچتا رہتا کہ آج اس کو کونسی کہانی سنائے گا۔

پندرہ دن کے اندر ہی اندر جس بجاج کی زندگی سے ڈاکٹر نا امید ہو گئے تھے وہ ہشاش بشاش تندرست ہو کر وارڈ سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے فرشتہ ایسی ننھی لڑکی کے ماتھے کو چوما، اسے پیار کیا۔ جہاں اسے صحت یاب ہونے کی خوشی تھی وہاں اسے کچھ غم بھی تھا۔

گولر کا پیڑ

عبدالرحمٰن صدیقی

گولر کی رعایت سے "گولر والا گھر" اور "گولر والی" سارے محلے میں کیا شہر میں دور تک مشہور تھے۔ دیوالی کے تیسرے دیے پاس پڑوس کے بچے گولر والے مکان میں جمع ہو جاتے اور گھنٹوں درخت کی پھننگ پر ٹکٹکی باندھے اس انتظار میں بیٹھے رہتے کہ کب گولر کا پھول کھلے اور کب بڑے ہو کر ان کے شہزادے بننے کی بات پکی ہو۔ گولر کے پھول کے متعلق محلے کے سب بچوں میں مشہور تھا کہ سال کے سال دیوالی کی تیسری رات کو یہ پھول صرف ایک یا دو سیکنڈ کے لیے کھلتا ہے اور جو شخص بھی اس پھول کو کھلتا ہوا دیکھ لے وہ کبھی نہ کبھی بادشاہ ضرور بن جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کبھی بھی کسی کی مراد بر نہ آئی کیونکہ ٹھیک بارہ بجے جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوتی اور پھول کھلنے کا وقت آتا تو اکثر بچوں کی آنکھیں تو نیند سے اس قدر بوجھل ہو چکی ہوتیں کہ ان کا کھلے رہنا بالکل ناممکن ہو جاتا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتے اور جو ایک دو ارادے کے پکے آنکھیں پھاڑے بیٹھے رہتے۔ ان کو بھی ٹھیک بارہ بجے کچھ ایسی جھپک سی آتی کہ پھول کھلنے کے ایک دو سیکنڈ صاف گذر جاتے اور وہ اندھیرے میں بیٹھے تاریکی میں لپٹے ہوئے بڑے سے درخت کی پھننگ کی طرف اس طرح اشارے کرتے جیسے عید کے چاند کو ٹٹول رہے ہوں۔

گرمیوں میں جب بچوں کے منہ دُکھنے آ جاتے تو نہ جانے کہاں کہاں سے عورتیں بچوں کو گود میں اٹھائے گولر والے گھر پر حملہ کر دیتیں۔ درخت کے تنے پر پتھر مار مار کر دودھ کی دھاریں نکالتیں اور روتے ہوئے بچوں کے منہ میں اس کا لیپ کر دیتیں۔ گولر کا دودھ دُکھتے ہوئے منہ کے لیے ویسے بھی اکسیر ہوتا ہے مگر اس درخت میں تو اللہ تعالیٰ نے وہ تاثیر بخشی تھی کہ لگاتے میں بلکتا ہوا بچہ کلکاریاں مار کر ہنسنے لگتا اور اس کے منہ کے ننھے ننھے چھالوں کو آرام آنے لگتا۔ خود بیچاری گولر والی بھی اتنی شریف واقع ہوئی تھیں کہ کبھی انہوں نے کسی ضرورت مند پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ورنہ بھلا اپنے گھر میں کون ہر کسی کے گھسنے کا روادار ہوتا ہے۔ مانا کہ گولر کا دودھ دے کر ان کی اپنی گرہ سے کچھ نہیں نکلتا تھا مگر یہی کیا کچھ کم تھا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر چھنول بھنگن سے لے کر نواب زادے صاحب کی بیگم تک کو، جو اپنی بدمزاجی اور ناک چڑھے پن کے باعث سارے علاقے میں بدنام تھیں اور جن کا محلے میں بہت ہی کم لوگوں سے کسی قسم کا کلام واسطہ تھا، چڑھنے دیتیں۔

جب بچوں کے منہ کا آنا زوروں پر ہوتا اور صبح چھ بجے سے لے کر دن کے نو دس بجے تک گھر میں ماؤں اور بہنوں کا تانتا لگا رہتا تو گولر والی کے آٹھ دس آنے تو یوں ہی گھر آئی ہوئی عورتوں کو پان اور ٹھنڈے پانی سے خاطر کرنے میں اٹھ جاتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود اپنی ہنڈیا ڈلیا چھوڑ کر ان عورتوں کا جن کی گود میں بچے تکلیف اور گرمی کی وجہ سے بلکتے ہوتے، ہاتھ بٹاتیں اور درخت کی چھال سے دودھ نکال کر بچوں کے منہ پر لگا دیتیں۔

گولر کا پیڑ گولر والی کے سارے گھر پر چھتر کی طرح چھایا ہوا تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ درخت بڑا تھا اور گھر چھوٹا تو شاید کچھ بے جا نہ ہوگا۔

برسات کے موسم میں گولر کے ساتھ ساتھ قسم قسم کے کیڑے مکوڑے بھی درخت سے جھڑتے۔ اکثر زرد زرد نیم زہریلے سانپ جن کی خاصی مقدار گھر کے پرانے تہ خانے (جس میں برسوں کا کاٹھ کباڑ اٹا پڑا تھا) محلے کے گندے نالے نالیوں اور کوڑے کے بڑے بڑے ڈھیروں میں آباد تھی، درخت کی ہریالی اور ٹھنڈک کی طرف کھنچے آتے اور وقت بے وقت انگنائی یا صحن میں نکل آتے مگر خدا کی عنایت سے ان سے کبھی کسی گھر والے کو کسی قسم کی ایذا نہیں پہنچی۔

رات برات کو جب کوئی سانپ سنپولا ٹہلتا ہوا نکل آتا تو گولر والی اپنے بچوں سمیت پلنگ پر کھڑی ہو جاتیں اور آیۃ الکرسی یا "جل تو جلال تو" پڑھ پڑھ کر سانپ پر پھونک دیتیں جس سے سانپ یا تو ڈر کر بھاگ جاتا یا پھر خوف زدہ انسانی صورتوں سے کچھ ایسا مسحور ہوتا کہ اپنی جگہ پر بت سا بن جاتا۔ یہاں تک کہ ان کی پرانی خادمہ شکورآ موقع پا کر غافل سانپ کا کام تمام کر دیتیں۔

بوا شکورآ اور سانپ کا تو گویا جنم جنم کا بیر تھا۔ وہ سانپ کا ایسا ڈٹ کر مقابلہ کرتیں کہ بس آج یا تو نہیں یا میں نہیں اور ہمیشہ نہیں تو اکثر ضرور سانپ کو ان کے سامنے اپنی ہار ماننا پڑتی۔ ایک دفعہ ایک سنپولیے نے ان پر بھرپور وار کیا اور ان کے انگوٹھے کو بری طرح ڈس لیا مگر کسی فقیر کی چٹکی کی تاثیر اور "سید صاحب" کی عنایت سے بوا شکورآ بس دو چار روز لوٹ پوٹ کر پھر چاق و چوبند اور بھلی چنگی ہو گئیں۔

یہ "سید صاحب" دراصل بوا شکورآ اور ان کی ہم خیال عورتوں اور مردوں کے نظریے کے مطابق وہ پاک روح تھے جنہوں نے گولر کے قدیمی پیڑ پر اپنا بسیرا بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ خدا بخشے گولر والی کے میاں وکیل صاحب نے اس خیال سے کہ اگر درخت کا صفایا کروا دیا جائے تو نہ صرف کیڑے مکوڑوں کا ڈر جاتا رہے گا بلکہ گھر بھی کافی کھلا کھلا نکل آئے گا، درخت کی بیخ کنی کا فیصلہ کر لیا۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کی بیوی آسانی سے ان کے فیصلے سے متفق نہیں ہوں گی۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی اور بوا شکورآ نے تو میاں کی بات سن کر وہ نیل مچائے کہ اللہ کی پناہ۔ مگر وکیل صاحب کے دل میں بھی کچھ ایسی سمائی تھی کہ انہوں نے کسی کی بھی پروا نہیں کی۔ البتہ اس بات پر ضرور راضی ہو گئے کہ اگر ایسا ہی ڈر ہے تو جس وقت درخت کو کٹوایا جائے اسی وقت درخت کی جڑ میں تین بکروں کا خون چڑھا دیا جائے تاکہ "سید صاحب" کی پیاس ٹھنڈی ہو اور گھر والے ان کے عتاب سے بچے رہیں۔

درخت کی کٹائی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ شام کے وقت ابھی وکیل صاحب واپس گھر نہیں آئے تھے اور گولر والی بیگم تنہا اپنے چھوٹے لڑکے کو لیے اوپر چھت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اسی اثنا میں خدا جانے ان کی آنکھ لگ گئی یا کیا ہوا بہرحال خود ان کا کہنا تو یہی ہے کہ وہ بالکل بیدار تھیں کہ ان کی چارپائی کے پاس ایک عجیب آدمی نمودار ہوا جس کا سر اور منہ لہولہان ہو رہے تھے اور ان پر چاروں طرف پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ زخمی آدمی نے پہلے تو چارپائی کے گرد ایک دو چکر لگائے اور پھر گولر والی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اگر تم نے سامنے والے درخت کو کٹنے دیا تو یاد رکھو تمہارے میاں کی بھی وہی حالت ہوگی جو میری ہے —— اور اس کے ساتھ ہی بہت زور کا ایک مکا ان کے کلیجے پر مارا اور کہیں غائب ہو گیا۔ گولر والی کی تو بس گھگھی بندھ گئی۔ پھر جیسے ذرا انہیں ہوش آیا تو وہ اپنے بچے کو جو ابھی تک بے خبر سو رہا تھا گود میں اٹھا کر ایک دم بدحواسی کے عالم میں نیچے دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی دھم سے دالان میں گر پڑیں۔ ان کی حالت اس وقت بالکل ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی۔ بوا شکورآ نے انہیں بمشکل پانی کا ایک گلاس پلایا اور ان کے پاس بیٹھ کر انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

"دیکھا بوا میں نہ کہتی تھی" شکورآ نے پنکھا جھلتے جھلتے کہا۔ "ان کو ہاتھ لگانا ٹھیک نہیں۔ ابھی کل ہی اونچی مسجد والے امام صاحب بتا رہے تھے کہ تمہارے سید صاحب جلالی معلوم ہوتے ہیں ان کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میرے منہ میں خاک سب کو بھسم کر دیں گے....."

تھوڑی دیر میں وکیل صاحب بھی گھر آ گئے۔ انہوں نے جو بیوی کو اس طرح بدحواس پڑے اور شکورآ کو ان کے سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے

دیکھا نوان کا ماتھا ٹھنکا۔ بیوی کے تو خیر ابھی تک ہوش ہی ٹھکانے نہیں ہوئے تھے جو وہ میاں سے کچھ کہتیں البتہ ننکو را نے وکیل صاحب کو مخاطب کر کے اپنی تقریر کا سلسلہ فوراً جاری کر دیا۔

"دیکھا میاں تم نے بیوی کا کیا حال بنایا ہے سید صاحب نے۔ میں نہ کہتی تھی کہ مت چھیڑو ان کو میاں یہ جلالی ہیں۔ دشمنوں کو راکھ کر دیتے ہیں۔ بس خدا ان کے عتاب سے بچائے ......"

"مگر پہلے یہ بتاؤ کہ ہوا کیا۔ بیگم کی حالت کیسی ہے۔ کب وہ دورہ پڑا ان کو؟" وکیل صاحب نے بوا ننکو را سے بوکھلا کر پوچھا۔

"ارے میاں۔ بیگم کے ہوش ذرا بجا ہوں تو معلوم ہو کہ کیا گذری بے چاری پر۔ بس ننھے کو گود میں اٹھائے اوپر سے بوکھلائی ہوئی نیچے آئیں اور دھم سے گر پڑیں۔ دیکھو نا ہونٹ تک نیلے پڑ گئے ہیں۔ ابھی جو کچھ حواس بجا ہوئے تو ذرا زبان ہلائی اور منہ سے "سید صاحب" "سید صاحب" نکلا۔"

وکیل صاحب کل ماجرا سمجھ گئے اور اس سلسلے میں بوا ننکو را سے بغیر کچھ مزید استفسار کئے بیوی کے پاس بیٹھ کر تسلیاں تشفیاں دینے لگے۔ بیگم کو ہوش تو خاصا آ گیا تھا، میاں کی تسلیوں نے اور اثر کیا اور تھوڑی دیر میں انہوں نے ایک دم ہچکیاں باندھ کر رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا حالت اور سنبھلی اور رونے کا زور کم ہوا تو انہوں نے اٹکتے اٹکتے کل ماجرا میاں کو سنایا۔

بیگم کی حالت اس وقت واقعی اس قدر غیر تھی کہ درخت کے معاملے میں وکیل صاحب کے لئے ان سے کسی قسم کی اور رد و قدح کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بیگم کو یقین دلایا کہ اچھا بابا اگر تمہاری یہی صلاح ہے تو تم جانو تمہارا کام، گھر میں تو آخر تمہیں کو زیادہ رہنا پڑتا ہے۔ اگر تمہیں یہ بھانت بھانت کے کیڑے مکوڑے، سانپ بچھو بھلے معلوم ہوتے ہیں تو پھر بہت اچھا۔ درخت نہیں کٹے گا۔

اس دن کے بعد سے گولر والی پھر کبھی گھر کی چھت پر نہیں سوئیں۔ بڑی سے بڑی گرمی پڑی، میاں بیچارے کہتے کہتے واقعی مر گئے کہ بندی خدا اب تو گولر کے پیڑ کو کوئی نہیں کٹوا رہا جو سید صاحب خواہ مخواہ چھت پر آ کر کسی کو گھونسے ماریں۔ مگر اس اللہ کی بندی نے کبھی بھول کر بھی رات کے وقت کوٹھے کا رخ نہیں کیا۔

اسی اثنا میں وکیل صاحب کا ایک پرانی بیماری کے بڑھنے اور بگڑ جانے کے سبب انتقال ہو گیا اور بوا ننکو را پر ہسٹیریا کا ایک شدید دورہ پڑا۔ سب یہ سمجھے کہ گولر والے سید صاحب اس پر چڑھ بیٹھے ہیں۔ گھر کی انگنائی میں ننکو را بگلیوں کی طرح کھیلتی، سر کے بال نوچتی اور عجیب قسم کی بھیانک آوازیں نکالتی۔

محلے کی مسجد کے مولوی صاحب نے لاکھ جتن کئے کہ کسی طرح سید صاحب کو شیشے میں اتار لیں اور انہوں نے کئی دفعہ خالی بوتلوں پر عمل پڑھ پڑھ کر ان پر سختی سے کاگ لگا دیئے مگر سید صاحب ہر دفعہ کسی نہ کسی طرح بوتل سے ہوا ہو گئے اور ننکو را کے سر پر بدستور سوار رہے۔ حتیٰ کہ اسی آشفتہ سری میں اس بیچاری نے اپنی جان دے دی۔ ڈاکٹر اور حکیم جس وقت آئے تو ڈاکٹر صاحب نے تو "کیس" اپنے ہاتھ میں لینے سے صاف انکار کر دیا اور حکیم صاحب نے فرمایا کہ بس ان کے حق میں دعا کیجئے، دوا کا وقت تو نکل چکا۔

ننکو را کی اچانک موت اور وکیل صاحب کے انتقال سے گولر والی بیگم پر سید صاحب کا رعب اور بھی طاری ہو گیا۔ ان دونوں سانحوں

نے ان کو اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ سائے سے ڈرتیں اور سید صاحب کا نام سن کر تو سچ مچ ان کے جسم میں لرزہ پڑ جاتا۔ پر وہ جو کہتے ہیں نا کہ بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ وکیل صاحب تو خیر بچارے سید صاحب کے متعلق زبانی ہنسی مذاق کر کے چپ ہو جایا کرتے تھے اور دو ایک دفعہ کے فضیحتے کے بعد تو انہوں نے ایسا کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر ان کے دونوں لڑکے، جو اب ماشاءاللہ پڑھ لکھ کر ہوشیار ہو چلے تھے، تو گویا ہاتھ دھو کر سید صاحب کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، بس جب سنو سید صاحب کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔

"کیا جھنکار کھڑا کر رکھا ہے بیچ انگنائی میں۔ کم بخت نے سارے گھر کو گھیر رکھا ہے۔ بھلا ان سید صاحب کو بھی اسی درخت پر ہی آ کر بسنا رہ گیا تھا۔ درخت نہ ہوا آفتِ جان ہو گیا۔ وہ جو سال میں نامِ خدا سیر دو سیر پھل آ جاتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ مگر سید صاحب ہیں کہ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے سر پر جن کے توں سوار ہیں۔" وغیرہ وغیرہ ....

سید صاحب کی شان میں ایسے ایسے کلمات سن کر گھر والی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتیں اور خوب خوب دونوں کو سناتیں کہ کم بختو! سن لو اگر تم نے سید صاحب کو کچھ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی دودھ نہیں بخشوں گی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اولاد ہوتی ہوشیار اور دلدار ہوتے پار، مگر یہاں کم بختی ماری اولاد کے ہوشیار ہوتے ہی دلدر اور آگے آ رہے ہیں۔

کبھی کبھی جب دونوں لڑکے واقعی ضد بحث پر اتر آتے تو اس پر بھی بس نہ کرتے اور دونوں ہاتھوں کی آستینیں چڑھا کر سید صاحب کو مکے بنا بنا کر دکھاتے اور ان کو نیچے اترنے کی دھمکی دیتے جس سے بڑھیا ماں کا کلیجہ دہل جاتا اور وہ پھر خوشامد درآمد سے بیٹوں کو چپ کرانے کی کوشش کرتیں۔ سید صاحب کے خلاف لڑکوں کی مہم برابر جاری تھی۔ حتیٰ کہ بڑی بی کم از کم ذہنی طور پر ان کے خلاف باتیں سننے کی عادی سی ہو گئیں۔ لڑکوں کی باتیں سن کر وہ اب بھی ان کو ہزاروں صلواتیں سنا ڈالتیں، ناک بھوں چڑھاتیں مگر اب وہ کانوں پر ہاتھ رکھے بغیر اپنی ہنڈیا میں چمچہ چلاتی رہتیں۔

ماں کی نیم خاموشی سے دونوں بیٹوں کو اور شہ ملی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جلد از جلد درخت کا قلع قمع کروا دیا جائے گا تاکہ ہمیشہ کے لئے قصہ ہی ختم ہو جائے۔ مگر اس آخری مہم کے لئے ابھی ان کو بہت کچھ زمین ہموار کرنی تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ بڑی بی ایک دم درخت کی بیخ کنی پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوں گی اور ماں کے کلیجے کو خواہ مخواہ جلانا انہیں خود منظور نہیں تھا۔ ماں کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے انہوں نے بڈھے پیڑ اور اس پر رہنے والے سید صاحب کے خلاف لعن طعن کا سلسلہ اور بھی تیز کر دیا۔ چنانچہ اب اگر گھر میں کوئی بدمزگی کی بات ہوتی تو اس کی تان ہمیشہ گولر کے درخت پر ٹوٹتی۔ کسی کے سر میں درد ہوتا تو اس کا ذمہ دار اس ذلیل درخت کو ٹھہرایا جاتا۔ گرمی کے موسم میں باہر انگنائی میں کھانا کھاتے ہوئے کبھی درخت پر سے کوئی کیڑا مکوڑا گر جاتا تو بس غضب ہو جاتا اور بے چارے بے زبان درخت پر لے دے کی پڑنا شروع ہو جاتیں۔ جاڑوں میں ذرا سی دھوپ رک جاتی تو درخت کی شامت آ جاتی اور ساتھ ہی سید صاحب کو بھی صلواتیں سنا دی جاتیں۔

آخر ایک دن دونوں بھائیوں نے ماں کو جا کر یہ فیصلہ سنا دیا کہ درخت تو اب کٹ کر رہے گا۔ بیٹوں کی بات پر بڑی بی نے لے دے تو بہت کی مگر ان کے احتجاج میں اب وہ زور نہیں تھا جو آج سے چند ماہ یا سال پہلے ہوا کرتا تھا اور آخر ان کو ہار کر کہنا پڑا کہ اچھا تو پھر تم جانو تمہارا کام مگر میں کہے دیتی ہوں کہ ہری چیز کو یوں جڑ سے کٹوا دینا اور درخت والے بزرگوں کو خواہ مخواہ چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ اللہ اوپر کی آفتیں اوپر ہی رکھے اور حق ناحق کی مصیبتوں سے بچائے۔

ماں کے ان خدشات پر دونوں بھائیوں نے ماں کی کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ تم خاطر جمع رکھو انشاءاللہ کچھ بھی نہیں ہونے کا۔ خدا جانے

ایسے کتنے ہی درخت روزانہ کٹتے ہوں گے۔ بھلا تم بھی سوچو کہ اگر اس طرح درخت کٹنے سرے ہی سے بند ہو جائیں تو تمہارے چولہے کے لئے لکڑی کہاں سے آئے۔

لڑکے تو ہرانی جنانی پر تلے ہوئے تھے بڑی بی ان سے کب تک سوال جواب کرتیں، ان کو چپ ہی کرنے بن پڑی اور ایک دو روز بعد پچاس ساٹھ سال پرانے گولر کے پیڑ کو جڑ سے کٹوا دیا گیا۔ درخت کے صاف ہو جانے سے گھر میں واقعی ایسی روشنی اور فراخی پیدا ہو گئی کہ بڑی بی خود دل ہی دل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں مگر سید صاحب کا خیال ان کو رہ رہ کر آتا اور وہ ڈر جاتیں۔

خدا جانے یہ سید صاحب کا عتاب تھا یا حالات کا تقاضا کہ تھوڑے ہی دن بعد شہر میں بلوے اور فساد شروع ہو گئے اور درخت کٹنے کے سال بھر کے اندر اندر گولر والی اور ان کے لڑکے اپنا موروثی مکان چھوڑ کر ایک بالکل نئے دیس اور شہر میں ہجرت کر کے آ گئے۔

نیا گھر

کرشن چندر

کردار:

پرانا گھر:

۱۔ شام لعل — رئیس اور لینڈ لارڈ، عمر پچاس سال

۲۔ موتی — اس کا لڑکا، جوان اور خوبصورت

۳۔ جوتی — اس کا دوست ہم عمر

۴۔ موتی کی ماں

۵۔ رینو — شام لعل کی ننھی لڑکی عمر چھ سال

۶۔ کوکو — شام لال کا ننھا لڑکا عمر سات سال

نیا گھر:

۱۔ شانتی — ایک ریفیوجی لڑکی جوان اور سندر

۲۔ اس کی ماں

۳۔ اس کا باپ

۴۔ اس کا دادا

۵۔ گوپی — شانتی کا چھوٹا بھائی عمر دس سال تیز اور طرار

مقام دہلی زمانہ حال

پہلا منظر:

موتی کا کمرہ پرانی وضع کے فرنیچر سے سجا ہوا ہے موتی بے حد اکتایا ہوا ہے۔ کتاب اٹھاتا ہے اور جلدی ہی لے پٹخ کر پھینک دیتا ہے۔ سگریٹ سلگاتا ہے اور اس کے دو ایک کش لگا کر اسے خاکدان میں بجھا دیتا ہے انگڑائی

لیتا ہے۔ جوتی اس کا دوست جس کے چہرے پر گذری ہوئی راتوں کی عیاشی کے نشان ہیں اور شراب میں ڈوبے ہوئے کے ملے ہیں وہ اپنے دوست موتی کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے اور دھوئیں کا بادل موتی کی طرف پھینکتا ہے۔ موتی کھانستا ہے۔ جوتی ہنس کر سامنے کی کھڑکی کھولتا ہے۔ کھڑکی کھلتے ہی مقابل کے مکان کی بالکونی نظر آتی ہے اس بالکونی میں ایک لڑکی دھوپ میں کھڑے ہو کر اپنے بال سکھا رہی ہے معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی نہا کر نکلی ہے اس کے چہرے پر تازگی ہے، جوانی کی چمک ہے اور رخسار کھلی ہوئی دھوپ میں تمتماتے جاتے ہیں جوتی مڑ کر موتی سے کہتا ہے۔

جوتی :۔ ارے یار دیکھو۔ دیکھو تمہارے پڑوس میں کون نئی لڑکی آئی ہے۔

موتی :۔ کون؟ یہ جو سامنے کھڑکی میں بال سکھا رہی ہے؟

جوتی :۔ ہاں ہاں وہی تو لڑکی ہے اسی کو تو لڑکی کہتے ہیں کیا بات ہے اس میں۔

موتی :۔ یہ ایک بھیوجی لڑکی ہے۔

جوتی :۔ کہاں سے آئی ہے؟

موتی :۔ راولپنڈی سے۔

جوتی :۔ کیا کام کرتی ہے؟

موتی :۔ کمرشل انسٹی ٹیوٹ میں ٹائپ سیکھتی ہے۔

جوتی :۔ دیکھ دیکھ میرے یار موتی۔ خود بھی مسکرا رہی ہے سورج اس کے دانتوں میں ہنس رہا ہے کیا بات ہے اس میں۔

موتی :۔ جوتی کھڑکی سے ادھر آ جا میرے بھائی یہ تاک جھانک اچھی نہیں۔

جوتی :۔ دیکھنے دے کوئی مدت کے بعد کوئی چیز دیکھنے کو ملی ہے ورنہ تمہاری گلی میں تو ایک سے ایک گوبر گنیش لڑکی بھری پڑی ہے۔

موتی :۔ یہ ریفیوجی لڑکیاں دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں مگر سنا ہے ان کا چال چلن اچھا نہیں ہوتا۔

جوتی :۔ ہاں پیارے سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ ریفیوجی لڑکیاں بڑی آسان ہوتی ہیں۔ تم نے کبھی اس کا پیچھا کیا؟

موتی :۔ نہیں بھائی۔

جوتی :۔ تو آج ہو جائے پیارے۔

موتی :۔ ہو جائے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

جوتی :۔ یہ لڑکی اکیلی ہے؟

موتی :۔ ارے بیوقوف اس کی ماں ہے جو ہماری گلی کے کپڑے سیتی ہے۔ اس کا ایک بھائی ہے، نو دس سال کا، گوپی وہ بس سٹاپ پر سنترے کی کھٹی میٹھی گولیاں بیچتا ہے۔ ایک بڈھا دادا ہے جو دن رات کھانستا رہتا ہے اور بیمار رہتا ہے۔ ایک باپ ہے۔

جوتی :۔ وہ کیا کرتا ہے؟

موتی : ۔ جانے کیا کرتا ہے وہ صبح جاتا ہے شام کو آجاتا ہے ۔میرے خیال میں تو وہ کوئی کام نہیں کرتا بس دن رات سڑکیں ناپتا رہتا ہوگا۔
جونی : ۔ اس لڑکی کا نام کیا ہے؟
موتی : ۔ شانتی!
جونی : ۔ شانتی ۔ نام شانتی ہے مگر دل کو بہت تکلیف دیتی ہے ۔اسے دیکھ کر دل عجیب طریقے سے اشانت ہو جاتا ہے ۔ کیا بات ہے اس میں ۔ شانتی ـــ شانتی ـــ

(دور سے آواز آتی ہے)

شانتی کی ماں کی آواز : ۔ شا ـــ نتی ـــ

(آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

دوسرا منظر :

شانتی کا کمرہ جیسے کسی غریب اور لٹے ہوئے ریفیوجی کا کمرہ ہو سکتا ہے ۔ اُدھ ٹوٹی چار پائیاں ، تہ کئے بستروں کی گٹھڑیاں ، ایک طرف چولہا اور چند برتن دیواروں پر بے ترتیبی سے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ٹرنک ایک طرف پڑے ہیں ۔ ماں چولہے کے قریب بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے جہاں ماں بیٹھی ہے وہاں سے بالکونی اور بالکونی میں کھڑی ہوئی شانتی اور شانتی سے پرے شام لعل کے مکان کی کھلی کھڑکی نظر آ رہی ہے ۔
ماں جلدی سے پرات چھوڑ کر اٹھتی ہے اور بالکونی میں جاتی ہے ۔

ماں (شانتی کے قریب جاکر) شانتی!
ماں (اور قریب سے) شانو!
شانتی : ۔ ہاں ماں جی!
ماں : ۔ ٹیپ سیکھنے نہیں جائے گی؟
شانتی : ۔ جاؤں گی ماں جی بال تو سکھا لوں ۔
ماں : ۔ آگ تیرے بالوں کو ۔ دیکھ سامنے ہی کھڑکی سے شام لعل کا لڑکا دیکھ رہا ہے اور وہ سامنے کی کھڑکی سے ......
شانتی : ۔ ہاں ماں میں دیکھ رہی ہوں سامنے کی تین چار کھڑکیاں کھل گئی ہیں مگر میں کیا کروں دھوپ بھی تو اسی بالکونی میں آتی ہے ۔
ماں : ۔ ہائے کدھر گیا میرے راولپنڈی والا گھر کھلے آنگن میں دھوپ دوال بروال کرتی ہوئی آتی تھی ۔
شانتی : ۔ ماں راولپنڈی نوں یاد نہ کر ۔
ماں : ۔ چھجے کے نیچے دہی دا بھرا ہوا مٹکا اور ادھر دھمر چھاچھ کی چلتی ہوئی مدانی ۔
شانتی : ۔ ماں اس گھر نوں یاد نہ کر ۔
ماں : ۔ اور ایک کونے میں سندر بچھڑے نوں پیار کر دی ہوئی میری گوری گائے ۔

شانتی (چلّا کر): ماں!

ماں (بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر): اچھا بیٹی اب میں کچھ نہ بولوں گی۔ کچھ نہ بولوں گی۔ تو اس کھڑکی سے ادھر آجا۔

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

(بڈھے دادا کے کھانسنے کی آواز)

بڈھا دادا:۔ کھڑکی کیوں بند کر دی؟ دھوپ آ رہی تھی۔

شانو:۔ دادا جی وہ . . . . . . وہ . . . . .

ماں:۔ وہ بے شرم لڑکے میری شانو کو دیکھ رہے تھے۔

دادا:۔ جان سے مار ڈالوں گا، جان سے مار ڈالوں گا۔ وہ نہیں جانتے فقیر چند کو، بخشی فقیر چند راولپنڈی والے کو۔ علی یار کے میلے میں مجھ سے نگڑا پنجہ لڑانے والا کوئی نہ تھا (کھانستا ہے) میں بڈھا ہو گیا ہوں مگر آج بھی میرے ہاتھوں میں دم ہے۔ کمبختوں کا گلا گھونٹ دوں گا۔ کون دیکھ رہا تھا میری بچی کو؟ کون دیکھ رہا تھا؟

شانو:۔ جانے دو دادا جی۔

دادا:۔ وہ نہیں جانتے بخشی فقیر چند کو۔ لٹی کے میلے میں میں نے ملسی جیل کے کرم داد سے پنجہ لڑایا تھا، برابر کی چوٹ رہی تھی۔ کرم داد بڑا اکھڑا جوان تھا۔ میلے میں ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کباب کھائے تھے۔ یہاں کوئی کباب ملتے ہیں کتّے کے گوشت کے کباب، ارے کباب تھے لٹی کے میلے کے اور وہ پورن حلوائی کی مٹھائی یہاں کے حلوائی مٹھائی بنانا نہیں جانتے (کھانستا ہے) مجھے یاد آتا ہے وہ لٹی کا میلہ راجہ بازار کی سڑکوں کی جھانکیاں۔ شانو کی ماں! ایک دفعہ میں شانو کے پتا کو لٹی کے میلے میں لے گیا تھا اور ہیرا کا کا گم ہو گیا تھا۔ اس وقت سارے میلے کو پہرہ پور پہرہ دارے کے زور آور خان نے کھنگال ڈالا تھا اور ہیرا کا کا ڈھونڈ لیا تھا اور جب میں نے زور آور خان کو دس روپے کا نوٹ دینا چاہا تھا اس نے نوٹ زور سے میرے منہ پر مار کر کہا ـــــ بخشیا ـــــ میں پٹھان ہاں میری بے عزتی نہ کر۔ جیسا تیرا پتر ویسا میرا پتر ـــــ اور یہاں میری پوتی دھوپ میں بال نہیں سکھا سکتی۔

(رونے لگتا ہے)

ماں:۔ نہ کرو یاد وہ دن۔

شانو (چلّا کر) دادا جی!

دادا (بہتے آنسو پونچھتے ہوئے) اچھا پتر۔ اچھا پتر اب میں ناں بول ساں۔ اپنی جبان سی لواں گا جس طرح تیری ماں محلّے کے کپڑے سیتی ہے۔ کلتے یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ بخشی فقیر چند کی بہو محلّے بھر کے کپڑے سیئے گی۔

(سسکتا ہے)

ماں:۔ کام کرنا برا نہیں۔ کام کرنے میں کوئی بے عزتی نہیں۔

شانتی:۔ اچھا میں جاتی ہوں ـــــ گوپی کہاں ہے؟

ماں:۔ وہ تو کب کا گیا بس شاپ پر سنترے کی گولیاں لے کر۔

(شانتی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے)

تیسرا منظر:

بس سٹاپ (سڑک پر شور، بس کے رکنے کی آواز)

جونی :- وہ رہی تمہاری شانتی۔ اسی بس سٹاپ پر جائے گی۔

مونی :- جانے دو یار۔

جونی :- ڈر گئے ابھی سے چلو چلیں میں تمہارے ساتھ ہوں آج اس کا پیچھا کریں گے۔

(گوپی گولیوں کا ڈبہ کھٹکھٹاتے ہوئے آتا ہے)

گوپی :- کھٹی میٹھی گولیاں سنترے کی مزے دار گولیاں۔ لے جاؤ بابو! گولیاں گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچائیں۔ سردیوں میں گرمی لائیں۔ کھٹی میٹھی گولیاں۔

ایک مسافر :- لاؤ دو آنے کی دے دو۔

گوپی :- یہ لو بابو ایک آنے میں دو مزے۔

مسافر :- وہ کیسے؟

گوپی :- منہ میں ڈالو تو پان کا مزا آئے زبان پر رکھو تو پان کی طرح کھل جائے۔

مسافر :- بہت تیز ہے یہ لڑکا۔

دوسرا مسافر :- ریفیوجی ہے۔

گوپی :- اے بابو۔ مسٹر صاحب! گولی لے کر کدھر چلے پیسے تو دیتے جاؤ۔

پہلا مسافر :- ارے ہاتھ کیوں پکڑتا ہے دیکھتا نہیں بس چھوٹی جا رہی ہے۔

گوپی :- ایک بس جا رہی ہے تو دوسری بس آ رہی ہے۔ مگر بابو میری روٹی کدھر جا رہی ہے؟

پہلا مسافر :- یہ لو۔ پریشان نہ کرو۔ سالا!

گوپی :- زبان سنبھال کے بات کرو لالہ میں گولیاں بیچتا ہوں عزت نہیں بیچتا ہوں۔

پہلا مسافر :- تیری عزت کی ایسی کی تیسی (دھکا دے کر) سالا بالشت بھر کا لونڈا گز بھر کی زبان گستاخ۔ زبان دراز۔

(بہت سے لوگ ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مجمع کا شور)

آوازیں :-

۱۔ کیا کرتے ہو؟

۲۔ اس چھوٹے سے لڑکے کو پیٹتے ہو۔

۳۔ تمہیں شرم نہیں آتی ننھے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے؟

۴۔ ارے یہ بابو ہے بھائی اسے کچھ مت کہو۔

۵ - ادھر آ ادھر آ دے۔ تیرے بابو دی باپی لڈھاں ہم کو ریفیوجی سمجھ کر منہ اٹھاتا ہے۔
۶ - تم کو شرم نہیں آتی؟
۷ - اب اس بچے کو مارا تم نے تو ہم تم کا منہ وڈھ دیوے گا۔

دوسرا مسافر: - دیکھا آپ نے ان ذلیل ریفیوجیوں میں کتنا ایکا ہے ایک کو چھیڑو چھتے کی بھڑوں کی طرح سب کے سب گلے پڑ جاتے ہیں۔

ایک بڈھا: - اور زبان تو دیکھئے کس قدر گنوار ہیں جاہل لٹھ۔

دوسرا بڈھا: - ارے صاحب جب سے یہ ریفیوجی آئے ہیں دلّی کی وہ زبان ہی نہ رہی۔ وہ گھلاوٹ وہ لوچ۔

پہلا بڈھا: - وہ دلّی دلّی نہ رہی۔

(بس چلی جاتی ہے)

(گوپی سسک رہا ہے)

شانتی (بھاگ کر اس کے قریب آتے ہوئے): کیا ہوا گوپی؟

گوپی: - مجھے ایک بابو نے مارا ہے۔

شانتی: - کیوں مارا؟

گوپی: - وہ میری روپی نہیں دیتا تھا۔

شانتی: - پھر تو نے کیا کیا؟

گوپی: - میں نے اس کا ہات پکڑ لیا جب اس نے پھر بھی روپی نہیں دی تو میں نے اس کا ہات کاٹ کھایا۔ وہ چلانے لگا اور مجھے مارنے لگا۔

شانتی: - تو۔

گوپی: - تو میں نے اپنی روپی وصول کر لی، میں نے اپنی روپی نہیں چھوڑی شانو۔

(روتے روتے ہنسنے لگتا ہے)

شانتی: - تیرا یہ ہات دکھتا ہے؟

گوپی: - نہیں نہیں اب تو نہیں دکھتا۔

شانتی: - اس نے تجھے بہت مارا؟

گوپی: - نہیں بہن۔

شانتی: - ارے تجھے تو بہت چوٹ لگی ہے گھٹنے سے خون بہہ رہا ہے

گوپی: - سوکھ جائے گا۔

شانتی: - چل تجھے گھر واپس لے چلوں۔

گوپی: - نہیں میں تو ساری گریاں بیچ کے ہی گھر جاؤں گا۔

شانتی: - میرے ویر تو بڑا بہادر ہے۔ تجھے تو سکول میں پڑھنا چاہئے۔ دیکھ جب میں ٹائپ سیکھ کر دفتر میں نوکری کروں گی تو اپنے ویر کو سکول

میں داخل کرا دوں گی۔

گوپی : ۔ تو جلدی جلدی سے ٹائپ سیکھ لے نا پھر۔ مجھے سکول میں پڑھنے کا بہت شوق ہے (سرگوشی سے) تیری بس آ رہی ہے بہن۔

گوپی : ۔ ٹھنڈی میٹھی گولیاں کھٹی میٹھی گولیاں گرمیوں میں ٹھنڈی سردیوں میں گرم کھٹی میٹھی گولیاں۔

شانتی : ۔ لے میری بس آ گئی۔

گوپی : ۔ یہ دو گولیاں لیتی جا بہن۔

جوتی : ۔ ارے وہ جا رہی ہے شانتی۔ وہ جا رہی ہے آگے بڑھو آگے بڑھو۔

(بس چلنے کی آواز)

گوپی کی آواز : ۔ کھٹی میٹھی گولیاں میٹھی کھٹی گولیاں۔

(آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(لاری چلی جا رہی ہے بیک گراؤنڈ میں لاری چلنے کی آواز)

جوتی : ۔ ارے آگے بڑھ جا موتی۔

موتی : ۔ تو آگے جا۔

جوتی : ۔ وہ تو بیٹھ گئی —— ساتھ کی سیٹ خالی ہے بیٹھ جا۔

(موتی ہچکچا رہا ہے)

موتی : ۔ نہیں تو بیٹھ جا۔

جوتی : ۔ موتی تو کس طرح کا رئیس زادہ ہے ناک کٹوائے گا اپنے خاندان کی۔ جا آگے جا کر اس کے ساتھ بیٹھ جا ورنہ کوئی اور بیٹھ جائے گا۔ زندگی میں پھر ایسا موقع کبھی ہاتھ نہ آئے گا کیا بات ہے اس میں۔

(موتی جا کر شانتی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے)

موتی : ۔ ساری —— آپ کو دھکا لگا یہ بس کم بخت چلتی ہے اس طرح۔ ہاتھی کی طرح —— جھومتے ہوئے۔

شانتی : ۔ بس تو ٹھیک جا رہی ہے آپ ہی کچھ گھبرائے معلوم ہوتے ہیں۔

موتی : ۔ ساری —— آپ —— میرا مطلب ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

شانتی : ۔ ضرور دیکھا ہوگا اس دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔

موتی : ۔ وہ .....

(خاموشی کا وقفہ بس چلی جا رہی ہے)

موتی : ۔ دیکھئے۔

شانتی : ۔ کدھر دیکھوں؟

موتی : ۔ وہ —— میرا مطلب یہ ہے —— کہ دیکھئے نہ آپ ہمارے محلے میں رہتی ہیں۔

شانتی :۔ جی ہاں!
موتی :۔ کیا آپ کا نام......
شانتی :۔ جی میرا نام شانتی ہے آپ کا نام موتی ہے آپ شام لعل رئیس لینڈ لارڈ اور پروپرائٹر کے لڑکے ہیں آپ کا مکان ہمارے غریب خانہ کے بالکل سامنے ہے۔ آج صبح جس وقت میں بالکنی میں کھڑی بال سکھا رہی تھی آپ اور آپ کا دوست دونوں مجھے کھڑکی سے گھور رہے تھے۔
موتی :۔ تب تو آپ اور ہم دونوں پڑوسی ہیں۔
شانتی :۔ ہم سات ماہ سے آپ کے محلے میں رہتے ہیں اس بات کا خیال آپ کو آج کیوں آیا؟

(خاموشی)

موتی :۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔
شانتی :۔ مجھے معلوم ہے۔
موتی :۔ اوہ۔

(خاموشی)

موتی :۔ میرا جی چاہتا ہے آپ کو ہمیشہ دیکھا کروں۔
شانتی (خاموش رہتی ہے)
موتی :۔ میرا جی چاہتا ہے آپ سے محبت کروں۔
شانتی (خاموش رہتی ہے)
موتی :۔ آج سینما میں بہت خوبصورت تصویر لگی ہے "ہم سب چور ہیں"
شانتی :۔ آپ بہت بڑے بور ہیں۔

(موتی خاموش ہو جاتا ہے)

موتی (پھر ہمت کر کے) : دیکھئے ـــ میرا جی چاہتا ہے آج آپ کو سینما دکھاؤں۔
شانتی :۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے منہ پر طمانچہ لگاؤں۔

(سڑاک سے ایک زوردار طمانچہ موتی کے جڑ دیتی ہے)

آوازیں :۔ کیا ہوا ـــ کیا ہوا؟
شانتی :۔ کچھ نہیں بس کنڈکٹر ـــ بس روک دو ـــ میرا سٹاپ آگیا ہے۔

(چلی جاتی ہے لاری سٹارٹ ہوتی ہے)

مسافر :۔ کیا ہوا صاحب ـــ کیا ہوا۔ (لوگوں کی آوازیں)
موتی :۔ ارے کیا ہوا صاحب ـــ میرے دوست کی کہنی غلطی سے لڑکی کے لگ گئی اس نے الٹ کر بیچارے کے طمانچہ جڑ دیا۔

ایک آدمی : ـ اے صاحب یہ ریفیوجی لڑکیاں ۔۔۔۔۔۔

چوتھا منظر :

(شانتی کا کمرہ ۔ گوپی کی سسکیوں کی آواز)

ماں : ـ کی ہویا گوپی ؟

گوپی : ـ مینوں کوکو کی ماں نے مارا ہے ۔

(زور زور سے سسکتا ہے)

موتی کی ماں : ـ ہاں ہاں میں نے گوپی کو مارا ۔

شانتی کی ماں : ـ تو نے میرے معصوم بچے کو کیوں مارا بہن ؟

موتی کی ماں : ـ یہ معصوم بچہ ہے ؟ یہ معصوم بچہ ہے ؟ اس نے میری رینو کو چٹیا سے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا اور کوکو کو مکا مار کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا کہتا تھا تیرا خون پی جاؤں گا ۔ یہ تو خونی ہے خونی تیرا معصوم بچہ ـــ گوپی ـــــ وہ تو محلے کے بچوں نے چھڑا دیا ۔ ورنہ ـ

شانتی کی ماں : ـ لڑکے آپس میں لڑا ہی کرتے ہیں ۔

موتی کی ماں : ـ کوئی نہیں لڑتے ۔ ہمارے محلے میں کوئی نہیں لڑتے لیکن جب سے تم ریفیوجی آئے ہو ۔

شانتی کی ماں : ـ ریفیوجی ہم خود سے نہیں بنے بہن ـــــ یہ تو ہم بنا دیے گئے ہیں نہیں تو مجھ کو کیا ضرورت تھی کہ میں اپنا بھرا ہوا گھر چھوڑ کے تمہارے سڑے محلے میں آباد ہوتی ؟

موتی کی ماں : ـ ہمارا محلہ سڑا ہوا ہے ؟ ہمارا محلہ سڑا ہوا ہے ۔ اری سڑی ہوئی تو تم ہو اور تمہارے ریفیوجی لوگ ہیں اور سڑی ہوئی تمہاری قسمت ہے ۔ جانے کہاں کہاں راولپنڈی سے کہ کدو بھنڈی سے یہ لوگ آئے ہیں ہماری دلی کے نام کو بٹہ لگانے کے لئے ۔ بے شرم ـ بدذات ـــ ایک تو میرے بچے کو پیٹا، میری رینو کا فراک برباد کر دیا ۔ دس روپے گز کا کپڑا لیا تھا پچھلے ماہ میں نے ۔ تم لوگ کیا جانو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا ایسا کپڑا ۔ یہ ریفیوجی لوگ نے آکر سب ستیاناس کر دیا ہے ـــ ماں ہے تو کپڑے سیتی ہے، باپ ہے تو سڑک پہ ناپتا ہے ۔ بیٹی ہے تو ٹائپ کرتی ہے ـــ لڑکا ہے تو گولیاں بیچتا ہے ـــ سب کام کر لیتے ہیں یہ لوگ شریفوں کی طرح بیٹھنا بھی نہیں جانتے ـــــ اور اوپر سے اکڑتے ہیں ۔

شانتی کی ماں : ـ ہاں اکڑتے ہیں ـــ اور ٹھیک اکڑتے ہیں ـــــ اور کیوں نہ اکڑیں ہم تمہارا دیا کھاتے ہیں ؟

موتی کی ماں : ـ دیا نہیں کھاتی ہو تو میرے مکان میں کیوں رہتی ہو ؟

شانتی کی ماں : ـ مکان میں رہتی ہوں تو کیا کرایہ نہیں دیتی مفت میں رہتی ہوں ؟ ہر مہینے کی پہلی کو تمہارے منہ پر پانچ روپے مارتی ہوں ۔

موتی کی ماں : ـ منہ پر مارا اپنے خصم کے ۔

شانتی کی ماں : ـ تیرے خصم کے منہ پر نہ ماروں جس کا کالے کتے کا سا منہ ہے ۔

موتی کی ماں : ـ کالا کتا تیرا خصم ـــ تیرا باپ ـــ تیرا دادا ـــ تیرے دادے کا دادا ـــ تیری سات پشتیں ـــ

شانتی کی ماں: ۔ ٹھہر ——— تیری سات پشتیں ابھی ٹھیک کر دیتی ہوں ۔

(عورتوں کی لڑائی کی آوازیں ——— بچاؤ بچاؤ ——— تیرا خصم ہی آ کے بچائے گا ۔ مار ڈالا ——— چھال اونہ پیٹے ——— نک کٹ پیٹے)

(عورتیں چلی جاتی ہیں ۔ دادا کھنکارتے اندر آتے ہیں)

دادا: ۔ مار ڈالوں گا ——— جان سے مار ڈالوں گا ——— جس نے میری بہو کے ہاتھ لگایا اس کا خون پی جاؤں گا ۔ یہ لوگ بخشی فقیر چند کو نہیں جانتے ۔ گھوڑا گلی کے میلے پر . . . .

شانتی کا باپ: ۔ پتا جی آپ ذرا چپ رہئے ——— کیا بات تھی ؟ کیوں جھگڑا ہوا ؟

(ماں سسکتی ہے)

شانتی کی ماں: ۔ مجھیں یاد نہیں ۔

شانتی کا باپ: ۔ یاد نہیں محلے میں اتنا بڑا فساد تو نے کھڑا کر دیا ——— مالک مکان کی بیوی کو پیٹ ڈالا اور تجھے کچھ یاد نہیں ۔

شانتی کی ماں: ۔ ہاں یاد آیا ——— اس نے نہاتوں نے نہاڈے پتا جی نوں کالا کتا کہا تھا ۔

دادا: ۔ کالا کتا ——— مجھے کالا کتا کہا ——— میرے بیٹے کو کالا کتا کہا اور تو میری بہو ہو کر ——— بخشی فقیر چند راولپنڈی والے کی بہو ہو کر چپ ہو کر سن رہی تھی ——— او تو مر کیوں نہ گئی ؟

شانتی کا باپ: ۔ پتا جی اب آپ چپ رہیں ۔ ہمیں معاملے کو کسی طرح سے نپٹنا ہے کہ نہیں ۔ ایک تو ہم لوگ پہلے ہی مصیبت میں ہیں ۔ لٹے پٹے آئے ہیں ، اوپر سے یہ مصیبت ——— اچھا نیک بخت بتا اس کی عقل تو نہیں پھر گئی تھی جو اس نے کالے کتے کی گالی دی تو نے بھی تو کچھ کہا ہوگا ۔

شانتی کی ماں: ۔ اس نے مجھے طعنہ دیا کہ میں اس کے مکان میں رہتی ہوں میں نے کہا میں مفت کوٹھڑی ہی رہتی ہوں پانچ روپے ہر مہینے تیرے خصم کے منہ پر مارتی ہوں ۔

شانتی کا باپ: ۔ تو نے ایسی بات کیوں کہی تو اچھی طرح جانتی ہے کہ شام لعل مالک مکان ہے کتنی مہربانی کر کے یہ مکان پانچ روپے کرایہ پر ہم کو دیا ہے بھاگوان آج دلی میں پانچ روپے پر مکان کہیں نہیں مل سکتا ۔

شانتی کی ماں: ۔ ایک ہی تو سڑا ہوا سا کمرہ ہے نہ اس میں دھوپ آتی ہے نہ ہوا آتی ہے ۔ ہمارے راولپنڈی میں تو پانچ روپے سے پانچ کمروں والا کھلا مکان مل جاتا تھا ۔

شانتی کا باپ: ۔ او ہو ——— راولپنڈی کی بات اور ہے ——— دلی کی بات اور ہے ۔ تو یہ بتا تو نے یہ لڑائی کیوں کی ؟

شانتی کی ماں (رو کر) : ۔ میں نے کہاں لڑی وہ تو خود ہی مجھ سے لڑنے کے لئے آ گئی ۔ ایک ذرا میرے گوپی نے رینو اور کرکو کو مارا تھا بس اس پر میرے معصوم بچے کو اس نے روئی کی طرح دھن کے رکھ دیا ۔ تم اسے تو کچھ نہیں کہتے ہو اور مجھ پر غصہ نکالتے ہو ——— تو لے لو ——— اٹھا لو اپنے اس بچے گوپی کو اور پھینک دو کوٹھڑی سے باہر ——— لے لو معصوم کی جان ۔ کیوں وے تو کیوں لڑا کرکو اور رینو سے ؟

(اسے زور زور سے مارتی ہے)

(ماں بیٹیا دونوں زور زور سے رونے لگتے ہیں)

شانتی کا باپ :- اری کیا کرتی ہے۔ کیا ہوا ہے تمہیں ——— کیا تمہاری مت ماری گئی ہے ——— گوپی کی ماں کیا ہوا تمہیں؟

شانتی کی ماں :- کیا ہوا ہے مجھے؟ نہ بھگوان مجھے ریفیوجی بناتا نہ آج ہماری یہ حالت ہوتی۔ (زور زور سے روتی ہے)

(کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

(دروازہ کھولا جاتا ہے۔ دروازے میں شام لعل کھڑا نظر آتا ہے)

شانتی کا باپ :- آؤ اندر آجاؤ شام لعل جی!

شام لعل :- جی نہیں آپ کی بڑی عنایت ہے میں یہیں ٹھیک ہوں۔ اس وقت آپ سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ پہلی تاریخ کو آپ ہمارا مکان خالی کر دیجئے۔

شانتی کا باپ :- مگر......

شام لعل :- اگر مگر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلی تاریخ کو مکان خالی ہو جائے بس ———

شانتی کا باپ :- مگر میں نے تو شام لعل جی...

شام لعل :- میں کچھ سننا نہیں چاہتا ——— بس ——— پہلی تاریخ کو مکان کو خالی کر دیجئے ——— بہت ہو گیا اس محلے میں آج تک جھگڑا نہ ہوا تھا۔ لیکن جب سے تم ریفیوجی آئے ہو کوئی دن خالی نہیں جاتا (زور دے کر) کوئی دن خالی نہیں جاتا۔

شانتی کا باپ :- اب میں کیا کہوں آپ سے ——— بہت شرمندہ ہوں۔

شام لعل :- بس ——— مجھ پر اتنا احسان کیجئے ——— پہلی کو مکان خالی کر دیجئے ——— رہا شرمندہ ہونا اس کی بات جانے دیجئے ——— شرمندہ ہونا تو آپ کی قوم جانتی ہی نہیں۔

دادا :- ہماری قوم کو گالی دیتے ہو ——— پوری قوم کو گالی دیتے ہو ——— سالے!

شانتی کا باپ :- پتا جی!

دادا :- سالے بخشی ففیر چند راولپنڈی والے کو نہیں جانتے ہو ٹانگیں چیر کے رکھ دوں گا۔

شانتی کا باپ :- پتا جی!

دادا :- ٹانگیں چیر کے رکھ دوں گا ——— مجھے بڈھا نہ سمجھو نکالو اپنے محلے سے کوئی تگڑے سے تگڑا جوان جو مجھ سے پنجہ لڑا لے۔ خون پی جاؤں گا جو میری قوم کو گالی دے گا۔ (زور زور سے کھانستا ہے)

پانچواں منظر: شام لعل کا گھر ——— ایک دالان

(گھر میں داخل ہوتے ہوئے)

شام لعل :- ہونہہ ——— قوم کو گالی نہ دو ——— بڑے آئے قوم والے ——— اتنی ہی تگڑی قوم تھی تمہاری تو یوں دربدر کی ٹھوکریں کیوں کھاتے پھرتے

یہاں آکے مرے۔

موتی کی ماں: ۔ نوٹس دے آئے ؟

شام لعل: ۔ دے آیا۔

موتی کی ماں: ۔ کیا بولا ؟

شام لعل: ۔ اجی کیا بولتا مکان خالی کرنا پڑے گا اسے ۔

موتی: ۔ مگر پتا جی کرایہ تو وہ باقاعدہ دیتے تھے ۔ ہر مہینے ـــ اور بھی تو دیکھئے کرایہ دار ہیں ہمارے دس دس ماہ ہو جاتے ہیں ایک ماہ کا کرایہ وصول نہیں ہوتا وہ پتھر والے چمن لعل جی نے تو ڈیڑھ سال سے کرایہ نہیں دیا۔

شام لعل: ۔ موتی مجھے بڑی حیرت ہے کہ تو ان کم بخت ریفیوجی کی طرفداری کر رہا ہے ۔

موتی: ۔ طرفداری تو نہیں کر رہا ہوں پتا جی سچی بات کہہ رہا ہوں ۔ ان میں اور کتنی بھی خرابی کیوں نہ ہو وقت پر کرایہ دے جاتے تھے ۔ مزاج میں اکڑپن ضرور ہے مگر یہ قومی عزت کی نشانی ہے ۔ آپ ان ریفیوجیوں میں سے کسی ایک کو بھیک مانگتا ہوا نہیں پائیں گے سب کے سب کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں ۔

موتی کی ماں: ۔ یہ شانتی کا پتا کیا کام کرتا ہے ۔ میں نے اسے کوئی کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ صبح گھر سے نکلتا ہے شام کو جوتیاں چٹخاتا ہوا گھر آتا ہے ۔ کپڑے اس کے پھٹے ہوئے ہیں ۔ صورت ہر لفنگوں ایسی مگر بیٹی کو ٹائپ سکھانے ضرور بھیجے گا ۔ ہونہہ !

موتی: ۔ ماں جی میں بتاؤں شانتی کا پتا کیا کام کرتا ہے ؟

موتی کی ماں: ۔ کیا کام کرتا ہے ؟

موتی: ۔ سٹیشن پر قلی گیری کرتا ہے ۔

موتی کی ماں: ۔ قلی گیری ؟

موتی: ۔ ہاں ـــ جس روز میں ڈیرہ دون سے واپس آیا سٹیشن پر جس قلی نے میرا اسباب اٹھایا وہ یہی شانتی کا باپ تھا ۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنا چہرہ چھپانا چاہا ۔ مگر میں نے اسے پہچان لیا میں نے آج تک یہ بات کسی کو نہیں بتائی ـــ مگر ـــ

موتی کی ماں: ۔ اچھا یہ بات ہے ـــ کرنا قلی گیری اور رلٹا رئیسوں سے ۔

موتی: ۔ یہ رئیسی کب تک چلے گی ؟

شام لعل: ۔ جب تک چلے گی ، چلے گی ـــ اور جس دن نہیں چلے گی اس دن میں پستول کی گولی سینے پر مار کر مر جاؤں گا ۔

موتی: ۔ مگر میں تو کوئی کام کرنا چاہتا ہوں پتا جی ۔

شام لعل: ۔ تو کر لو ـــ کوئی شریفانہ کام کر لو ـــ میں نے کب منع کیا ہے ۔ اپنے سیٹھ مرلی منوہر دریبے والے ہیں نا ان سے جوہریوں کا کام سیکھ لو میں نے تمہیں سو دفعہ کہا ہے ۔

موتی: ۔ میں جوہری نہیں بننا چاہتا ہوں ـــ فوجی بننا چاہتا ہوں ۔

شام لعل: ۔ فوجی ؟ سپاہی ؟ ہمارے خاندان میں تو آج تک کوئی نہ ہوا ۔

موتی : ۔ نہیں ہوا تو کیا ہوا اب ہو جاؤں گا میں ۔
موتی کی ماں : ۔ مگر میرا بیٹا — میرا بچہ — میرا لعل سپاہی بنے گا ؟
موتی : ۔ ماں ! وہ جو فوج میں ہیں وہ سب اپنی ماں کے لعل ہیں ۔
موتی کی ماں : ۔ نا میں نہ جانے دوں گی تجھے فوج میں ۔
موتی : ۔ مرغی کی طرح چھپا کے رکھ لو اپنے پروں کے نیچے کہیں ہوا نہ لگ جائے تیرے بیٹے کو ۔
موتی کی ماں : ۔ کیوں اس گھر میں تجھے کیا تکلیف ہے نوکر چاکر — روپیہ پیسہ ۔ عیش و آرام — کس چیز کی تکلیف ہے بیٹا مجھے بتا دے ۔
موتی : ۔ نوکر چاکر ، روپیہ پیسہ ، عیش و عشرت یہاں سب کچھ ہے ماں مگر کام نہیں ہے اور میں کام کرنا چاہتا ہوں ۔ کوئی ایک کام کرنا چاہتا ہوں ۔

(اور کمرہ سے باہر بھاگ جاتا ہے)

شام لعل : ۔ پہلے زمانوں میں ہم لوگ سیر تماشہ مانگتے تھے ، عیش و عشرت کے سامان مانگتے تھے ۔ شراب ، عورت ، روپیہ ، جاگیر — اب ہمارے بیٹے کام مانگتے ہیں — موتی کی ماں رئیسی ختم ہو گئی اب ہمارے بیٹے کام مانگتے ہیں ۔ (آہ بھر کر) آج سے دلی کی رئیسی ختم ہو گئی ۔

(لوگوں کا شور ہو رہا ہے پر سنائی دیتا ہے)

شام لعل : ۔ کیا ہوا ؟
ایک آواز : ۔ موٹر کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ۔
شام لعل : ۔ کہاں ؟
ایک آواز : ۔ اپنے محلے کے سامنے رینو اور کوکو کھیل رہے تھے ۔
موتی کی ماں : ۔ ہائے میرے رینو اور کوکو کو کیا ہوا — ارے لوگوں میں تو لٹ گئی ۔
ایک آواز : ۔ آپ کے رینو اور کوکو بالکل صحیح سلامت ہیں انہیں وقت پر گوپی نے دوڑ کر دوسری طرف دھکا دے دیا ۔ مگر خود نیچے آ گیا ۔
موتی کی ماں : ۔ کہاں ہے میری رینو ۔ میرا کوکو — ارے لوگو میری تو آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے ۔ جلدی سے میرے بچوں کی صورت دکھا دو ۔
وہی آواز : ۔ یہ رہے آپ کے دونوں بچے ۔
موتی کی ماں : ۔ میری رینو (منہ چومتی ہے) میرے کوکو (منہ چومتی ہے) ارے مہابیر جی کے مندر میں پرساد لے کے جاؤ پانچ روپے کا ۔
رینو : ۔ ماں وہ لوگ گوپی کو ہسپتال لے گئے ہیں ۔
موتی کی ماں : ۔ ارے کوئی بھوانی ماتا کے مندر پر بھی چڑھاوا لے کے جاؤ دس روپے کا ۔
کوکو : ۔ ماں — گوپی کا خون بہہ رہا تھا اور لوگ کہتے تھے گوپی مر جائے گا ۔ ماں لوگ کیسے مرتے ہیں ؟

(اداس سنگیت کی ایک درد ناک دھن)

چھٹا منظر:

ایک خیراتی ہسپتال کا وارڈ

نرس، اردلی، کمپونڈر، ڈاکٹر ہسپتال کا کام کر رہے ہیں۔

آوازیں:۔

۱۔ سرنج صاف کر دی؟

۲۔ تیرہ نمبر کو انسلین کا انجکشن مارو۔

۳۔ اٹھائیس نمبر کی پٹی کھل گئی ہے۔

۴۔ نرس بی وارڈ میں سات نمبر کے بیڈ پر نیا مریض آ گیا۔

ڈاکٹر (ماتیاک کے قریب):۔ اب آپ مریض کو دیکھنے جا سکتی ہیں۔

شانتی:۔ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر:۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے صرف ایک ٹانگ ٹوٹی ہے دو ماہ پلاسٹر میں رکھنا پڑے گا۔

شانتی:۔ مگر ڈاکٹر صاحب —— میرا بھائی۔

ڈاکٹر:۔ کہہ جو رہا ہوں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارا بھائی بالکل ٹھیک ہو جائے گا مگر میں نے اسے بے ہوش کر دیا ہے اسے جگانے کی کوشش نہ کرنا۔

موتی:۔ ڈاکٹر صاحب کیا میں اسے —— مس شانتی!

شانتی:۔ آئیے آپ بھی آ جائیے —— مسٹر موتی!

شانتی:۔ گوپی میرے ویر —— میرے بھائی گوپی!

(گوپی بے ہوش ہے اور مدھم مدھم مسکرا اٹھے نے رہا ہے)

موتی:۔ میں آپ سے معافی مانگنے کے لئے آ رہا تھا کہ مجھے اس ایکسیڈنٹ کا پتہ چلا۔ پھر جب تک آپ کے ماں باپ یہاں رہے مجھے آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں کہہ نہیں سکتا میں کس قدر شرمندہ ہوں۔ آپ سے کہا آپ مجھے کبھی معاف کر سکیں گی؟

شانتی:۔ زندگی میں انسان اگر معاف نہ کرے تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

موتی:۔ حیرت ہے اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے ایسی سمجھداری کی باتیں کیسے سیکھ لیں۔

شانتی:۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہم نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے، بہت سے دکھ اٹھا لئے ہیں اور ہر دکھ ایک تجربہ ہوتا ہے جو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔

موتی:۔ میری زندگی ہمیشہ خوشی میں گذری اس لئے مجھے کچھ یاد نہیں۔ کوئی صبح یاد نہیں، کوئی شام یاد نہیں۔ ایسی فراغت کی زندگی رہی کہ دل میں کوئی حسرت ہی نہ رہی۔ اس دیوانے کو تم نہ سمجھ سکو گی جس کے دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔

شانتی :۔ مگر میں اس دیوانے کو خوب سمجھتی ہوں جس کے دل میں حسرتیں ہی حسرتیں رہ جائیں اور کبھی کوئی امید پھول بن کر نہ کھلے۔
موتی :۔ مگر ایک دن میرے دل کے ویرانے میں ایک کھڑکی کھلی اور میں نے تمہیں دیکھا۔
شانتی :۔ (آہستہ سے) اور میں نے تمہیں دیکھا۔
موتی :۔ تم میری پہلی حسرت!
شانتی :۔ تم —— میرے پہلے پھول —— میری بالکونی کے سامنے بہت سی کھڑکیاں کھلتی رہیں اور بہت سی آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ میں ایک خوب صورت لڑکی ہوں اور میں اپنی خوبصورتی کی قوت کو پہچانتی ہوں —— محلے میں —— بازار میں —— دوکان پر —— سڑک پر —— دفتر میں —— ہر جگہ مجھے اس کی قوت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اس لئے میں ان دیکھنے والوں کی نظریں بھی پہچانتی ہوں اور میں نے کہیں پر وہ بات نہ دیکھی جو تمہاری آنکھوں میں دیکھی۔ وہ نظر —— وہ نگاہ —— وہ ادا —— اس کی وہ پاکیزگی اور شرمیلاپن میرے دل میں ایک پھول کی طرح کھلتا چلا گیا۔ لوگ تو دیکھتے ہیں مجھے اور اپنی نگاہوں سے خریدتے ہیں مجھے اور اس طرح آوازیں کستے ہیں مجھ پر جیسے میں کوئی عورت نہیں ہوں سینما کا اشتہار ہوں۔ مگر تم نے ان مہینوں میں کبھی ایک بار نظر سے نظر ملا کر میری طرف نہ دیکھا، کبھی ایک بار بھی میرا نام تک نہ لیا اسی لئے بس کے واقعے میں گھبرا سی گئی۔ میں نے تمہیں دو چانٹے لگا دئے۔ تمہیں دکھ تو ہوا ہوگا لیکن اس دکھ کا تم کیسے اندازہ کرو گے جہاں کبھی کوئی پھول نہ کھلا ہو اور ہزاروں ویران لمحوں کے بعد ایک پھول کھلے اور وہ بھی یوں ایک طمانچے سے کچل دیا جائے —— تم مجھے بہت بے شرم لڑکی سمجھتے ہوگے —— ریفیوجی لڑکیاں بہت آسان ہوتی ہیں —— دیکھنے میں —— مگر ان کے دل کو جیتنا بہت مشکل ہے۔
موتی :۔ میں فوج میں بھرتی ہو رہا ہوں۔
شانتی :۔ بہت اچھا کر رہے ہو —— آدمی بن جاؤ گے۔
موتی :۔ بس میں جو کچھ ہوا وہ میرے دوست نے مجھے ورغلایا تھا مگر وہ جو کچھ ہوا ٹھیک تھا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ تمہارے ان دو طمانچوں نے میرے دل کے اندر بہت سی باتوں کو ختم کر دیا۔ پہلی بار مجھے دوسرے کی عزت کا اندازہ ہوا۔ عزت جو روپے سے نہیں ہوتی —— قوم اور مذہب سے نہیں ہوتی —— رسم و رواج کی پابندی اور ماں باپ کے ڈر سے نہیں ہوتی بلکہ شخصیت کے کردار سے ہوتی ہے۔
موتی :۔ تم مجھے خط لکھا کرو گی؟
شانتی :۔ میرا باپ ایک قلی ہے۔
موتی :۔ وعدہ کرو کہ میرے خطوں کا جواب دو گی۔
شانتی :۔ میری ماں محلے کے کپڑے سیتی ہے —— میرا بھائی بس سٹاپ پر سنترے کی گولیاں بیچتا ہے —— میں دفتر میں ٹائپ کرنے جاتی ہوں —— میں ایک ریفیوجی لڑکی ہوں —— ریفیوجی لڑکیاں بڑی آسان ہوتی ہیں۔
موتی :۔ میرے ایک خط کا جواب دے دیا کرنا۔

شانتی (سہلاکر) :۔ اول ہوں۔
تم خط نہ لکھوگی تو پھر —— پھر —— دنیا ایک کیسے ہوگی —— پرانے رسم و رواج کیسے مٹیں گے —— دلوں کو دلوں سے دور کرنے والے تفرقے کیسے ختم ہوں گے —— نیا ہندوستان کیسے پیدا ہوگا —— ہمارا نیا گھر کیسے بنے گا —— شانو —— شانو!

تال لچھمی —— ہم تو خط نہ لکھیں گے تمہیں تم ہمارے کون ہوتے ہو؟

(کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ موتی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہنسی ایک گیت میں گھل جاتی ہے —— پنجابی کا گیت ہے —— ڈھولک کی دھاپ ہے۔ چند سیکنڈ کے بعد گیت فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے ——)

پردہ

روپیہ چلتا ہے

آغا بابر

افرادِ تمثیل :-

منشی	معمر آدمی ۔ عینک لگائے صدری پہنے جیسے منشی ہوتے ہیں ۔
جیواں	تیز طرار عورت عمر پینتیس سال ۔
رحموں	تیز طرار عورت عمر پینتیس سال ۔
خان	نوکدار مونچھیں ۔ کھلا کرتا ۔ گھیر دار شلوار ۔ تنگ واسکٹ جس کی جیبیں بٹنوں سے سجی ہوئی ہیں ۔ ہاتھ میں ڈنڈا ۔
اجنبی	گاؤں کا رہنے والا تیس سالہ جوان ۔ سادہ لباس ۔
مولوی نمبر (۱)	ڈاڑھی مونچھ ۔ شرعی شلوار ۔ پرانی شیروانی ۔ سر پہ ترکی ٹوپی ۔
مولوی نمبر (۲)	ڈاڑھی مونچھ ۔ پاجامہ ۔ لمبا کرتا ۔ صدری ۔ سر پہ امرد ہی ٹوپی ۔
دو بچے	عمر سات سال ، پانچ سال ۔
دو راہگیر	ڈھول والا اور ڈھنڈورچی ۔

گلی کا پردہ ۔

(منشی اور جیواں جھگڑتے ہوئے داخل ہوتے ہیں ۔)

منشی ۔ جیواں ۔ مجھے تم پہ ہنسی آتی ہے اور غصہ بھی ۔ جب کہتی ہو میرے پاس تو کرایہ بھی نہیں ۔

جیواں ۔ منشی جی ۔

منشی ۔ چپ رہ ۔ منشی جی منشی جی ۔ بیٹا بابو بنا پھرتا ہے ۔ کپڑے دیکھے ہیں تم نے جو تُنے سلائے ہیں اُس نے ۔ کاٹی ہوگی جیب کسی کی ۔

جیواں ۔ اب تو اُس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے منشی جی ۔

منشی ۔ کام چھوڑ دیا ہے تمہارے بیٹے نے ؟ کیا میں مان جاؤں گا جو تم کہو گی ۔ مجھے کرایہ چاہیئے ۔ سنا ۔ دو مہینے کا ۔ ایک

مہینے کا دیا تو منہ پر مار دوں گا۔

جیواں۔ منشی جی۔ روپیہ کہاں سے آئے۔

منشی۔ مجھے کیا پتہ۔ کہاں سے۔ باتیں زیادہ نہ کیا کرو۔ بیٹے سے پوچھ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔

جیواں۔ وہ تو آج ساہوکار ہے۔ کل کنگال۔ کہتا ہے روپیہ چلتا ہے۔

منشی۔ چلتا ہے یا دوڑتا ہے۔ بولتا ہے یا چپ رہتا ہے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں۔ اب آیا تو بے عزتی کروں گا۔ سُن رکھ کان کھول کر۔ ہاں۔ (جاتا ہے)

خان۔ (دوسری طرف سے داخل ہوتا ہے) یہ کیا منشی بکتا جھکتا رہتا ہے۔ چلتا ہے کہ دوڑتا ہے۔ بولتا ہے کہ چپ رہتا ہے۔

جیواں۔ (ہنس کر) روپیہ۔

خان۔ جیواں۔ روپیہ تو واقعی چلتا ہے۔

جیواں۔ بولتا بھی ہے۔ دور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔

خان۔ روپیہ خود بخود بولتا ہے۔ یہ تو سچ ہے۔

جیواں۔ سننے والے کان چاہئیں۔ بس خانصاحب۔

خان۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں اب؟ گھر سے کبھی نکلتی نہیں۔ بس بیٹھی حقہ پیتی رہتی ہو۔

جیواں۔ اب نکلنا ہی پڑے گا۔ برکتے کے بچے نے اپنی پوشاکیں سلائی ہیں۔ اور مجھے ایک اوڑھنی تک لے کر نہیں دی۔

خان۔ میں نے برکت کو دیکھا ہے۔ آج کل بڑا سفید پوش نظر آ رہا ہے۔

جیواں۔ جبھی تو تین روز سے گھر نہیں آیا۔

خان۔ چھوڑو۔ وہ تو اُس کا پرانا دستور ہے۔ تم آپ بڑی سمجھدار ہو۔ نکلو نا کسی روز گھر سے۔ آسامیاں تو ہل ہی جایا کرتی ہیں۔

جیواں۔ ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ سنا ہے رحموں آج کل بڑے ہاتھ رنگ رہی ہے۔

خان۔ ضرور رنگ رہی ہو گی۔ وہ تمہاری طرح تھوڑی ہے کہ بس حقہ لے کر سارا دن ڈیوڑھی میں بیٹھی رہے۔ (دونوں چلے جاتے ہیں۔ گلی کا پردہ اُٹھتا ہے پیچھے بازار کا پردہ ہے)

(اجنبی اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے رحموں داخل ہوتی ہے)۔

رحموں۔ کیوں بھائی کس کو دیکھ رہے ہو؟ رستہ تو نہیں بھول گئے۔

اجنبی۔ نہیں رستہ تو نہیں بھولا۔ میں کوئی سرائے وغیرہ دیکھ رہا ہوں۔

رحموں۔ مسافر ہو گے۔

اجنبی۔ ہاں بہن۔ کہیں رات تو کاٹنی ہوئی نا۔ میرے ساتھی ابھی تک نہیں آئے۔ کچھ خرید و فروخت کا ارادہ تھا۔

رحموں۔ اچھے گھر کے نظر آتے ہو۔ سرائے میں رات کاٹو گے تو وہاں کے اُچکوں کو خواہ مخواہ شک ہو جائے گا جیب میں جو پانچ چھ سو ہے گنوا بیٹھو گے۔

اجنبی۔ پانچ چھ سو! اونہہ ۔ میں تو غریب آدمی ہوں ۔ کُل دو سو تو ہے سارا۔

رحمول۔ یہ بھی بڑا ہے بھائی ۔ کوئی لوہے کا سامان تو نہیں خریدنا؟

اجنبی۔ ہاں ۔ خریدنا ہے ۔ کیوں؟

رحمول۔ میرا بھتیجا لوہے کی دوکان کرتا ہے ۔ آج کل کاروبار بڑا مندا ہے ۔ میں نے کہا ۔ اگر لوہے کا سامان خریدنا ہے تو یہ قریب ہی دکان ہے ۔ ایک نیا گاہک بن جائے اُس کا ۔ اس وقت دکان پر ہی ہوگا۔

اجنبی۔ اچھا ۔ مگر پہلے رات کاٹنے کا ٹھکانا ڈھونڈنا ہے مجھے۔

رحمول۔ میرا بھتیجا اپنی دوکان پر سونے کے لئے جگہ بھی دے دے گا۔ دوکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا احاطہ ہے۔

اجنبی۔ اچھی رونق ہوتی ہوگی اُس کی دکان پر۔

رحمول۔ لوگ تو آتے ہی رہتے ہیں ۔ کئی تو بندھے گاہک ہیں اُس کے ۔ تم چل کے دیکھ لو ۔ یہ قریب ہی تو ہے۔

اجنبی۔ اچھا ۔ (دونوں جاتے ہیں ۔ بازار والا پردہ اُٹھتا ہے ۔ سٹیج کے دائیں طرف ایک چارپائی بچھی ہے ۔ پاس ایک اور حقہ پڑا ہے ۔ بائیں طرف لکڑی کی ایک دیوار کھڑی ہے جس میں کواڑ لگے ہوئے ہیں ۔ تالا لگانے کے لئے کنڈی بھی ہے ۔ بائیں طرف سے رحمول اور اجنبی سٹیج پر آتے ہیں)

رحمول۔ اس تکلیف کی معافی دینا بھائی ۔ میں تمہیں لائی اور دکان بند نکلی ۔ میرا بھتیجا کسی برات کے ساتھ چلا گیا ہے۔

اجنبی۔ پھر؟

رحمول۔ پھر اب کل سہی۔

اجنبی۔ اب مجھے باہر چھوڑ آؤ ۔ میں تو اس بازار کی بھول بھلیوں سے واقف نہیں۔

رحمول۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ یہاں نہیں ہوگا ۔ تم جانتے ہو ہم بھی غریب آدمی ہیں ۔ میں نے سوچا میرے بھتیجے کی گاہکی ہو جائے گی ۔ اس کے گاہک دور دور سے آتے ہیں ۔ یہ ساتھ ہی احاطہ ہے ۔ یہ ایک کوٹھڑی سی ہے (کواڑ کھولتی ہے) میں تو کہتی ہوں آرام سے یہیں رات سو رہو ۔ چارپائی اور تکیہ موجود ہے ۔ اندر سے کنڈی لگا لینا باہر کے دھکے کھانے سے کیا برا ہے ۔ میں دری لا دیتی ہوں ۔ حقہ موجود ہے۔

اجنبی۔ خیر وہ تو کوئی بات نہیں ۔ میرے پاس سگرٹ ہیں ۔ میں سوچ یہ رہا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے۔

رحمول۔ یہ خانقاہ شریف کا چورما میرے دوپٹے میں بندھا ہے ۔ (دوپٹے کے پلو سے کھولتی ہے) یہ لو ۔ ابھی یہی کھاؤ ۔ کھانا میں لے آتی ہوں ۔ میرا گھر دور نہیں۔

اجنبی۔ بس بس اتنا چورما ہی بڑا کافی ہے ۔ کھانے کی تکلیف نہ کرنا بہن۔

رحمول۔ اچھا بھائی ۔ میں چلدی ۔ صبح آؤں گی ۔ تم اسے اپنا گھر ہی سمجھو۔

اجنبی۔ اچھا ۔ مہربانی ۔ (اندر سے دروازے کی کنڈی لگا کر چارپائی پر سو جاتا ہے ۔ سٹیج کی روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو کر بجھ جاتی ہے پھر جلتی ہے ۔ اجنبی خراٹے لے رہا ہے ۔ مرغ کے اذان دینے کی آوازیں آ رہی ہیں ۔ رحمول چادر کی بکل مارے

دروازے پر آکر کنڈی کھٹکھٹاتی ہے)

اجنبی۔ ارے بھئی کون آگیا ہے۔ صبح سویرے۔ منہ اندھیرے۔ کھولتا ہوں دروازہ۔ صبر کرو۔ (دروازہ کھولتا ہے) آ بہن نور کے تڑکے ہی آ پہنچی تو تو۔

رحموں۔ کیا بتاؤں بھائی تمہیں کہ مجھ پر کیا مصیبت بنی ہے۔

اجنبی۔ تمہاری آواز بھاری ہے۔ آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

رحموں۔ رات رو رو کر کاٹی ہے۔

اجنبی۔ کیوں ؟

رحموں۔ اِس بندی کا شوہر آٹھ برس سے افریقہ گیا ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے مرگیا ہے۔ کوئی کہتا ہے اُس نے وہاں دو شادیاں کرلی ہیں۔ اُس کے بال بچے ہیں۔ اب کوئی دیکھے یہ میری عمر ہی کیا ہے۔ میں پہاڑ سے دن کس کے لئے گزار دوں۔ میں اپنی یہ خوبصورتی۔ یہ جوانی کیوں ضائع کردوں۔ اِن لمبے گھنگھریالے بالوں میں تیل دانتوں میں دنداسہ، آنکھوں میں سُرمہ کس کے دکھانے کو لگاؤں۔ میرے عطر پھلیل اور مہندی کا سنگار کون دیکھے آہ اِس نصیبوں جلی کا دنیا میں کوئی نہیں ——

اجنبی۔ تیرا بھتیجا ؟

رحموں۔ بھتیجے کو پتہ لگ گیا تو وہ ساری عمر نہ بولے میرے ساتھ۔ بھائی میں کیا کروں۔ لوگوں کی غلامی اور مزدوری کرکے تنگ آ چکی ہوں۔ ایک آدمی کہتا ہے کہ اگر میں آج طلاق لے لوں تو وہ میرے ساتھ نکاح کرنے کو تیار ہے۔ نہیں تو اُسے مجھ سے اچھے رشتے مل رہے ہیں۔ بھائی، میں نے تیرے ساتھ نیکی کی۔ تجھے سونے کو جگہ دی خدا کے لئے میری مدد کرو اب ......

اجنبی۔ ہاں۔ ہاں۔ کیا مدد کروں۔

رحموں۔ تمہارا کچھ ہرج بھی نہیں۔ یہ پچیس روپے میں نے پیسہ پیسہ کرکے جوڑے ہیں۔ تم لے لینا۔

اجنبی۔ مگر بتاؤ بھی نا ....

رحموں۔ تمہارے پاس دو سو ہے۔ یہ ملا کر دو سو پچیس ہو جائیں گے۔ تمہیں کیا نقصان ہے۔

اجنبی۔ مجھے تو فائدہ ہی ہے۔ مگر بتاؤ تو کام کیا ہے ؟

رحموں۔ اک ذرا سی بات ہے۔ تم میرے ساتھ چلے چلو اور چودھری صاحب سے کہدو کہ یہ میرے نکاح میں ہے۔ مجھ سے بنتی نہیں ہے۔ زبان کی تیز ہے۔ میں طلاق دیتا ہوں۔ میں قبول کرلوں گی۔

اجنبی۔ یہ عجیب بات کہی تم نے ؟

رحموں۔ تم شہر میں اجنبی ہو۔ تمہیں پچیس روپیہ مفت کے مل جائیں گے۔ تمہارا بھی فائدہ میرا بھلا۔ اگر تم ہمت کرو تو میری کئی ملنے والیاں طلاق لینے کی خواہشمند ہیں۔ اور تمہارا کام چلانا میرا ذمہ۔ یقین کرو دن بھر میں دس بیس

طلاقیں تو کہیں گئی نہیں۔ فی طلاق دس دس بھی لینے لگو تو حساب کر و کیا بنا۔ میں کہتی ہوں زمانہ بہت بُرا آن لگا ہے

اجنبی۔ ہوں ــــــ اگر تمہارا خاوند آگیا تو........

رحموں۔ اُسے آنا ہوتا تو آج تک نہ آگیا ہوتا۔ وہ تو خود مجھ سے کہتا تھا کہ طلاق لے لو۔ سُنے گا تو خوش ہوگا۔

اجنبی۔ اچھا؟ تو پھر.....

رحموں۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ روپے پچیس یہ لو۔

اجنبی۔ لاؤ۔

رحموں۔ ان کو بھی رومال کے ایک کونے میں باندھ لو۔

اجنبی۔ یہ لو۔ تو پھر چلیں۔ کوٹھڑی کو تالا لگائے دیتے ہیں۔

رحموں۔ ہاں خود ہی لگا دو۔ میرے ہاتھوں میں تو آج طاقت نہیں۔

(پردہ گرتا ہے۔ مولوی نمبر ا چارپائی اٹھائے داخل ہوتا ہے۔ چارپائی بچھا کر اس پر دری بچھاتا ہے۔ پھر حقہ لاتا ہے۔ پھر دو چار موٹی موٹی کتابیں رکھ کر عینک لگاتا ہے اور پڑھنے میں معروف ہو جاتا ہے۔ اجنبی اور رحموں داخل ہوتے ہیں۔)

رحموں۔ سلام علیکم۔ مولی صاحب۔

مولوی۔ وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے بی بی؟ کیسے آئی ہو۔

رحموں۔ مولی صاحب۔ یہ میرا شوہر ہے۔ مجھے طلاق دیتا ہے۔

مولوی۔ تمہیں کوئی عذر ہے۔

رحموں۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔

مولوی۔ کیوں بھئی میاں۔ تم نے طلاق دی؟

اجنبی۔ جی ہاں مولوی صاحب۔ دی طلاق۔

رحموں۔ انہوں نے دی۔ میں نے منظور کی۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں اس لئے میں ہی آئی ہوں نصیبوں جلی۔

مولوی۔ طلاق کی وجہ؟

اجنبی۔ بنتی نہیں۔ عورت زبان دراز ہے۔

مولوی۔ ہمل۔ مہر کا روپیہ پیسہ لے لیا بی بی۔

رحموں۔ جی۔ مولی صاحب۔ میں نے وصول پایا۔

مولوی۔ جاؤ۔ پھر ہوگئی طلاق۔

رحموں اور اجنبی۔ سلام علیکم۔

مولوی۔ سلام علیکم ــــــ (سٹیج کے ایک طرف جا کر اجنبی کہتا ہے)

اجنبی۔ اچھا کھیل کھیل رہی ہو۔
رحموں۔ کیسا کھیل؟ (اس کا گریبان پکڑ لیتی ہے)
اجنبی۔ ہائیں۔ میرا گریبان تو چھوڑ دو۔
رحموں۔ تار تار کر دوں گی تمہارا گریبان۔ اعتبار کیا ہے تمہارا۔ میرا روپیہ جو گھر رکھ آئے ہو۔ دیدو۔
اجنبی۔ نیک بخت تیرا مہر ادا کر چکا ہوں۔ تو نے مولوی صاحب کے سامنے قبول کیا ہے۔
رحموں۔ دھجی دھجی کر دوں گی تیرا گریبان۔ اتنا ظلم کرتے ہو مجھ بندی پر دن دہاڑے۔ ارے لوگو۔ دیکھو میرا حق مارتا ہے بے ایمان۔
مولوی۔ (کتاب پر سے نظریں اُٹھا کر) ارے بھئی۔ کیا شور مچایا ہے تم نے صبح صبح۔ ہیں ہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔
رحموں۔ (رو کر) مولی صاحب۔ اِس بے ایمان نے مہر کا روپیہ مجھے دیا ہے بلا شک۔ مگر چلتے وقت اِس کے پاس ہی امانت رکھ آئی۔ ہائے رستے میں کہاں لئے پھرتی۔ اب جو کہتی ہوں چل کر مجھے روپیہ ادا کر تو بے ایمان مُکرتا ہے مردوا۔
مولوی۔ کیوں بے تو انسان ہے کہ شیطان۔
رحموں۔ جب تک کوڑی کوڑی ادا نہ کرے گا۔ اِس کی جان اپنی جان ایک کر دوں گی۔
اجنبی۔ مگر سنو تو وہ روپیہ میرا ہے۔
مولوی۔ ارے احمق۔ وہ روپیہ تمہارا اب کیسے ہُوا؟ کیا تو نے کبھی طلاق نہیں دی۔ حقِ مہر تیرا باپ ادا کرے گا۔
رحموں۔ مولی صاحب خدا گواہ اِس نے دو سو روپیہ لال رومال کے کونے میں باندھا۔ میں نے امانت رکھا اس کے پاس۔ دوسرے کونے میں اس نے پچیس روپے الگ باندھے ہیں۔ یہ بے ایمان گھر رکھ کر آیا ہے۔ آپ ساتھ چلئے۔ اگر نہ نکلیں تو میری ہڈی پسلی ثابت نہ چھوڑیئے۔
مولوی۔ ابے شیطان کے بچے، بچاری کا روپیہ ابھی ادا کر دے ورنہ مقدمہ لڑتے لڑتے مر جائے گے۔
رحموں۔ (رو کر) یہ نیک کام ہے مولی صاحب آپ خدا را ساتھ چلیں۔ طلاق دلوائی ہے اِس نوسرباز سے تو یہ کام بھی کر دیں۔ میں دنیا میں تنہا ہوں۔
مولوی۔ ہاں میں ساتھ چلتا ہوں۔ (پردہ گرتا ہے۔ پردہ گرنے کے ساتھ ہی مولوی رحموں اور اجنبی داخل ہوتے ہیں)
مولوی۔ دیکھو اس کی صورت کتنی نیک ہے مگر باطن کتنا سیاہ۔ توبہ ہے پروردگار، توبہ ہے۔ دُنیا میں کیسے کیسے لوگ بس رہے ہیں۔
رحموں۔ ہائے ایک تو مجھے ناحق چھوڑا۔ طلاق دی۔ اب کہیں محنت مزدوری کر کھاؤں گی۔ نوکری کر لوں گی۔
مولوی۔ امانت کا روپیہ۔ توبہ۔ توبہ۔ دوزخی ہے دوزخی۔
رحموں۔ (رو کر) ساری عمر چابکوں سے مارتا رہا اور میں نے اُف نہیں کی۔

مولوی۔ تم روؤ نہیں۔ اتنا اندھیر کہاں ہے۔ کہ عورت کا کوئی روپیہ مارلے۔
رحمول۔ بس آپہنچے مولی صاحب (پردہ اٹھتا ہے۔ پیچھے وہی منظر ہے کوٹھڑی والا)
رحمول۔ تالہ کھول اب۔ کیا چپ شاہ کا بالکا بنا ہے جیسے زبان ہی نہیں۔ (اجنبی تالہ کھولتا ہے)
مولوی۔ چلو تم آگے۔ (داخل ہوتے ہیں رحمول آگے ہے)
رحمول۔ یہ دیکھئے مولی صاحب تکیہ کے نیچے۔ آپ ہی رومال کھول کر دیکھئے اسی طرح اغنت رکھے ہیں۔
مولوی۔ ہوں۔ ہم تو پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ یہ شیطان جھوٹا ہے۔
اجنبی۔ مگر یہ میرے ہیں۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔
رحمول۔ ہاں مولی صاحب پچیس روپے اِس کے ہیں۔ خدا کو جان دینی ہے۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ یہ اِسی کے ہیں۔
مولوی۔ بس کمبخت رذیل جھوٹے اب چون وچرا کی مجال نہیں۔ ایک ایک کر کے گن لو بابا۔ یہ تمہارا حق ہے اب تمہارا اس موذی بے ایمان سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

(پردہ گرتا ہے)

(خان اور اجنبی داخل ہوتے ہیں)

خان۔ اب رونے دھونے سے کیا فائدہ۔ اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو روپیہ مل جائے گا۔
اجنبی۔ مل جائے گا۔
خان۔ ہاں مل جائے گا۔ ہمارے ساتھ آؤ۔
اجنبی۔ چلو۔
خان۔ اُس عورت کا حلیہ کیسا ہے؟
اجنبی۔ بس خانصاحب گندمی رنگت تھی۔ سر کے بال کھچڑی تھے کمر سیدھی تنی ہوئی۔ بڑی باتونی۔ آنکھ بھوں کے اشارے بغیر بات نہیں کرتی۔
خان۔ رہتی کہاں ہے؟
اجنبی۔ مجھے چھوٹے محلے لے گئی تھی۔
خان۔ بس ٹھیک ہے سمجھ گیا۔ وہی عورت ہوگی۔
اجنبی۔ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔
خان۔ بس آپہنچے۔ دیکھو اس مکان میں ہم جائیں گے۔ وہاں جو عورت رہتی ہے۔ بہت سمجھدار ہے روپیہ اسکی مدد سے ملیگا
اجنبی۔ تو چلئے۔
خان۔ ٹھہرو ہم دستک دیں۔ (ڈنڈے سے دستک دیتا ہے)
جیواں۔ کون ہے۔ (سائڈ میں سے باہر آتی ہے) اچھا خانصاحب۔

جیواں۔ آپ کے ساتھ یہ کون ؟

خان ۔ اس کا کام ہے ۔ میرا خیال ہے ۔ خو۔ رحموں نے اسے چکمہ دے کر لوٹ لیا۔

جیواں۔ رحموں نے ؟ اچھا ! حلیہ کیا تھا بھائی ۔

اجنبی ۔ گندمی رنگ گھنگھر والے بال ۔ تنی ہوئی کمر ۔ ۔ ۔ ۔

جیواں۔ بس وہی ۔ سمجھ گئی ۔

خان ۔ وہ آسے چھوٹا محلہ لے گئی ۔

جیواں ۔ چکمہ کیا دیا اُس نے ؟

اجنبی میرے پاس روتی ہوئی آئی ۔ بولی میرا شوہر لاپتہ ہے ۔ میں مہندی کا سنگار کسے دکھاؤں ۔

جیواں ۔ یا روں پٹنی ۔ اچھا پھر ؟

اجنبی ۔ کہنے لگی تم یہ پچیس روپے لے لو اور مولوی صاحب سے کہہ دو میں اس کا خاوند ہوں طلاق دیتا ہوں ۔

جیواں۔ تمہارے پاس کتنا روپیہ تھا ۔

اجنبی ۔ دو سو ۔ مولوی کے پاس جا کر طلاق دی ۔ باہر نکلے تو میری گردن کو آئی اور شور مچایا کہ میرا مہر دو سو روپیہ ہضم کرتا ہے میں نے اس کے پاس امانت رکھی تھی ۔ لوگ اکٹھے ہو گئے ۔ مولوی آگیا ۔ اُسے لے کر چھوٹے محلہ آئی ۔ جس کوٹھڑی میں مجھے پناہ دی تھی ۔ وہاں تکئے کے نیچے میں نے باندھے ہوئے تھے دو سو ۔ ہزار جھک ماری کہ روپیہ میرا ہے ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جیواں ۔ ہوں ۔ ملی کہاں تھی تمہیں ؟

اجنبی ۔ خانقاہ کے قریب ۔

جیواں ۔ وہیں جاتی ہے شکار پھانسنے ۔

خان۔ خو ۔ بہن جیواں اب روپیہ نکالنے کا کوئی تدبیر کرو ۔

جیواں۔ خانصاحب میں تو اس کے خون کی پیاسی ہوں ۔ اُس سے روپیہ نہ نکلواؤں تو باپ کی بیٹی نہیں ۔

خان ۔ خو ۔ دیکھا کتنا دلیر عورت اے ۔

جیواں۔ بھائی تمہارا روپیہ کیا کھوٹی کوڑی دلوا دوں گی ۔ وہ شتل ہے کیا مال ۔ مگر ایک شرط ہے ۔

اجنبی۔ کیا ؟

جیواں۔ وہ سنی ہے شل ۔ ساری جاتی دیکھیئے تو آدھی دیجو بانٹ ۔

اجنبی۔ ہاں ۔

جیواں۔ اللہ سنو جو میں کہوں کرنا ہوگا ۔ آدھا روپیہ ہمارا ہوگا ۔ ورنہ ہم کیوں محنت کریں ۔ جھگڑا مول لیں ۔

اجنبی۔ اچھا

خان۔ ہاں ہاں اُسے کیا انکار ہو سکتا ہے۔

جیواں۔ جیواں روپیہ تو یوں نکل سکتا ہے یوں۔ (چٹکی بجاتی ہے)

خان۔ تو چلو پھر۔

جیواں۔ ہاں چلو۔ (دو قدم چلتے ہیں)

خان۔ جیواں اب کرنا کیا ہوگا۔

جیواں۔ کرنا یہ ہے کہ مدرسے میں رحموں کے دو لڑکے پڑھتے ہیں۔ ایک کا نام یعقوب ہے عمر ہو گی کوئی سات سال دوسرا غلام سرور چار یا پانچ برس کا ہوگا۔ تم بھائی ان دونوں کو بلانا۔

اجنبی۔ میں بلاؤں؟

جیواں۔ ہاں ہاں تم ان دونوں کو بلانا اور کہنا چلو میرے ساتھ۔ مدرسے کا مولوی پوچھے تو کہنا کل میں نے ان کی ماں کو طلاق دے دی۔ حق مہر کا روپیہ ادا کر دیا۔ میں اب اپنے دونوں لڑکے اس ڈائن کے پاس نہیں رکھنا چاہتا مگر دیکھو ہچکچانا نہیں۔

خاں۔ خو۔ کتنی دماغ دار عورت ہے۔

جیواں۔ بس آگے بات ہم کریں گے۔

اجنبی۔ بیوی کہہ کر تو یہ سزا پائی ہے اب بیٹے پیدا کرکے نجانے کیا ہو؟

جیواں۔ نہیں تم تسلی رکھو۔

اجنبی۔ اب کہیں دور تو نہیں جانا۔

جیواں۔ نہیں وہ سامنے مسجد ہے نا بس تم جاؤ اللہ کا نام لے کر۔ جیسا میں نے کہا ہے (پردہ اُٹھتا ہے۔ جیواں اور خان ایک طرف کونے میں ہو جاتے ہیں۔ اجنبی ہمت سے آگے بڑھتا ہے۔ جیواں اور خان اشاروں سے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اجنبی سٹیج کے دائیں طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ اے جناب۔ اے بھائی صاحب ذرا یعقوب اور غلام سرور کو بھیج دینا۔ ایک لمحہ کا وقفہ جس میں وہ پلٹ کر پھر خان اور جیواں کی طرف دیکھتا ہے جو اُسے آہستہ آہستہ شاباش کہتے ہیں۔ اجنبی پھر کہتا ہے۔ اے بھائی صاحب میں نے کہا تھا غلام سرور اور یعقوب کو بھیج دیں۔)

پیچھے سے آواز۔ دیکھئے وہ آ تو رہے ہیں۔

اجنبی۔ اچھا بڑی مہربانی (یعقوب اور غلام سرور آتے ہیں) چلو جھوکرو۔ گھر چلو۔

چھوٹا لڑکا۔ (رو کر) ہائے ماں۔

اجنبی۔ ماں کا ہیبلا۔ چل سیدھا ہو کر۔

مولوی نمبر ۲۔ (داخل ہوتا ہے) ہیں ہیں۔ یہ بچوں کو کیوں کھینچے لئے جا رہے ہو۔ (قریب آ کر) اتنا ظلم اچھا نہیں۔ آپ کون ہیں؟

چھوٹا لڑکا۔ ہائے ماں۔

اجنبی۔ ہمارے لڑکے ہیں لئے جاتے ہیں آپ کون ہیں بیچ میں خواہ مخواہ۔

مولوی نمبر۲۔ تمہارے لڑکے ہیں ؟ مگر یہ کیا ہلڑ ہے کہ اس طرح کھینچ کرے جاؤ۔ کیا بگاڑا ہے ان کمسنوں نے تمہارا ہائے بلانا ان کی ماں کو یہ کون یزید آگیا ہمارے مدرسے میں۔

اجنبی۔ یزید تو ہوگا تیرا کوئی بڑا۔ آیا ہے بڑا مولوی بن کے۔ تیرے باپ کا اجارہ ہے۔ ہم لئے جاتے ہیں اپنے لڑکوں کو۔ تو کون ہے۔ اِن کی ماں ہے ؟

مولوی نمبر۲۔ آجاتی ہے ان کی ماں بھی۔ پتہ چل جائے گا تو کون ہے۔ اور میں کون ہوں۔

جیواں۔ (آگے بڑھ کر) مولی صاحب انہوں نے اِن بچوں کی ماں کو طلاق دے دی تو کیا ان کا حق نہیں۔ جہاں چاہیں بچوں کو رکھیں۔

مولوی نمبر۲۔ ایں !!!

رحموں۔ (ہاتھ نچاتی ہوئی آتی ہے) ارے یہ میری پرانی سوت ہے آگئی کچھ لگنوں کو ساتھ لے کر۔ یہ تیری ساری مکاری ناک رستے نہ نکال دوں تو اپنے باپ سے نہیں کسی چمار سے۔

جیواں۔ اری چمارن میں تجھے کچا نہ کھا جاؤں تو میرا نام بھی جیواں نہیں۔

رحموں۔ دیکھ تو کیسا مزا چکھاتی ہوں تجھے۔ یہ رے ہٹ مولوی (مولوی کو دو ہتھڑ مارتی ہے) ارے مردوئے تو کون ہے میرے بچوں کو ہاتھ لگانے والا۔

اجنبی۔ اِن کا باپ۔

جیواں۔ جب تو نے اس سے طلاق لے لی کل اونچی مسجد میں مولی صاحب کے روبرو تو آج وہ اپنے بچوں کو خواہ کنوئیں میں ڈالے خواہ دریا میں دھکا دے تو کون روکنے والی۔

خان۔ خو۔ مولوی صاحب۔ آپ عقل کے ناخن لو۔ یہ عورت شیطان کی خالہ ہے۔ جب اس نیک مرد نے اپنی عورت کو طلاق دے دی تو باپ کا اختیار ہے بچوں کو جہاں چاہے رکھے۔

جیواں۔ اور لڑکے بھی سیانے ہیں مولی صاحب۔

مولوی۔ توبہ توبہ یہ بات تھی۔ مجھے حاشا وکلا علم نہ تھا کہ ان لڑکوں کے باپ نے ان کی ماں کو طلاق دے دی ہے۔ استغفار معاملہ بہت نازک ہے۔ لے جاؤ بھائی بچوں کو۔ تم مالک ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔

رحموں۔ ہائے رے مولوی۔ تیرا خانہ خراب۔ بچے بندی نے جنے۔ بندی نے پالے۔ تو کہتا ہے ان پر میرا حق نہیں (روتی ہے)

مولوی۔ میرے مدرسے میں آج تک یہ طوفان بدتمیزی برپا نہیں ہوا تھا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ عدالت میں جا کر جھگڑا کرو (جاتا ہے)

خان۔ ہاں ہاں چلو ہٹو یہاں سے۔ اُدھر فیصلہ چکالو۔
رحمو۔ کس بات کا فیصلہ رے؟
جیواں۔ جو کل حق مہر کا دو سو روپیہ مار لیا تو نے اور کس بات کا فیصلہ۔
رحمو۔ اوئی میرے بچوں کا ہاتھ تو چھوڑ دو۔ ہائے کس طرح ان کے بازو لال ہو گئے ہیں۔
خان۔ پہلے دو سو روپے سیدھے ہاتھ سے رکھ دو پھر اپنا بچے لے جاؤ۔
جیواں۔ ہاں ہاں خانصاحب۔ اس کے گھر ہی کی طرف تو جا رہے ہیں۔ روپیہ نہ دے گی تو بچوں سے ہاتھ دھوئے گی۔
رحمو۔ جاؤ رے جاؤ میں خرچ سے بچی۔
اجنبی۔ چل بے ماں نے بھی جواب دیا۔
لڑکا۔ (روتے ہوئے) ہاں ماں۔ ماں۔
رحمو۔ ہائے میرے لاڈوں پلے۔ میرے لال کس طرح سہمے کھڑے ہیں چل رے موذی لے لے اپنا روپیہ۔
جیواں۔ اندر جا کر روپیہ لے آ۔ ورنہ اپنے محلہ میں بدنام ہو کر رہو گی۔
رحمو۔ ہائے رے یہ موئی ڈائن کہاں سے آملی تجھ پاپی کو (کہتے ہوئے جاتی ہے)
خان۔ بس اب خاموش رہو۔ روپیہ بس اب آیا کہ آیا۔
رحمو۔ (آتی ہے) لو پکڑو اپنا روپیہ۔
جیواں۔ میاں پورا کر لو۔
رحمو۔ پورا ہی ہے اری بیرن۔ کس وقت کا بدلہ لینا تھا تو نے۔
خان۔ کیوں ٹھیک ہے روپیہ۔ پورا کر لیا۔
اجنبی۔ ہاں ٹھیک ہے۔
رحمو۔ لا پکڑا میرے بچے۔ ہائے میں قربان میں واری۔ (بچوں کو لے کر جاتی ہے)
خان۔ حق بحقدار رسید۔
جیواں۔ آئی تھی ٹھگنے۔ کیوں کیسے پانی کیا؟
خان۔ لاؤ اب بہن جیواں کا حصہ۔
جیواں۔ ہاں تھوڑی جان ماری ہم نے؟
اجنبی۔ یہ لو پورے کر لو بہن۔
جیواں۔ ٹھیک ہے۔ اچھا بھائی جیتا رہو۔
خان۔ خوش رہو۔ اب زیادہ اِدھر اُدھر مت پھرنا۔
اجنبی۔ توبہ میری خانصاحب جی۔ آپ نے میری گئی گذری رقم دلوا دی ۔۔۔۔۔۔

جیواں۔ دلوانے والا تو وہ خدا ہے بھائی۔ میں کون اور تو کون۔ اچھا اللہ بیلی۔ (اجنبی آتا ہے) میں نے کہا خانصاحب دیکھنا تو وہ منشی جا رہا ہے۔

خان۔ ہاں وہی ہے۔

جیواں۔ (آواز دیتی ہے) منشی جی۔ اے منشی جی۔

منشی۔ (داخل ہوتا ہے) کیا ہے۔ میں تمہاری طرف ہی جا رہا تھا۔

جیواں۔ میری طرف نہ جائیے۔ یہ لیجئے کرایہ۔ (کرایہ کے روپے اُسے دیتی ہے)

منشی۔ شاباش۔ اب کہاں سے آگیا روپیہ؟

جیواں۔ بس چلتا ہے روپیہ۔ آج میرا ہے کل تیرا ہے۔

(خان اور جیواں ایک طرف کو جاتے ہیں اور منشی دوسری طرف)

(اتنے میں دنگل کے ڈھنڈورے والا آتا ہے۔ ایک آدمی ڈھول بجا رہا ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں گھنٹی ہے وہ ساتھ ساتھ گھنٹی بجا رہا ہے۔)

(پانچ چھ آدمی ڈھنڈورا سننے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں اُن میں اجنبی بھی ہے)

ڈھنڈورے والا۔ سن لو۔ سن لو آگیا۔ دنگل کے ڈھنڈورے والا۔ اک شاندار دنگل اک زبردست دنگل ہو رہا ہے آپ کے شہر کے اندر۔ پنڈال اور اکھاڑے کا انتظام اعلےٰ اور اچھا۔ پہلوان پھرتیلے اور سجیلے بڑی بڑی دور سے آ رہے ہیں۔

پہلا جوڑ ——— ننھو پہلوان امرتسرئے کا ——— دینے پہلوان انبالے والے کے ساتھ ہو دیگا۔

دوسرا جوڑ ——— لنگے سنار کا ——— نوجے گوجر کے ساتھ ہووے گا۔

تیسرا جوڑ ——— پھکے پہلوان پٹھے گام لسٹیئے کا ——— لاڈو نائی پٹھے نتھاں والے کے ساتھ ہووے گا۔

اور چوتھا جوڑ ——— حافو کنجر پٹھے امام دین قلعی گر کا ——— شدی پہلوان برجاں والے کے ساتھ ہووے گا۔

اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے جوڑ بھی ہوویں گے۔ ٹکٹ دو روپے، ایک روپیہ اور آٹھ آنے ہوگا۔ جس بھائی کو لینا ہو۔ تکیہ سبحان شاہ اور بڑے اکھاڑے سے لے سکتا ہے۔ (ڈھنڈورہ سننے والے لوگ چلے جاتے ہیں دو آدمی رہ جاتے ہیں۔)

اجنبی۔ یہ راستہ بسوں کے اڈے کی طرف جاتا ہے۔

ایک آدمی۔ ہاں سیدھے چلے جاؤ۔

اجنبی۔ ہائے میں لٹ گیا۔ میری جیب میں روپیہ نہیں۔

ایک آدمی۔ کتنا تھا؟

اجنبی۔ ایک سو۔

ـ آدمی۔ جیب کاٹ لے گیا کوئی۔

ـمرا آدمی۔ کوئی کون ارے بھئی۔ ابھی یہاں مجمع میں برکت کھڑا دیکھا تھا میں نے۔

ـبی۔ برکت کون ہے؟

ـمرا آدمی۔ بڑا انیکھا جیب تراش ہے۔

ـبی۔ ہائے میں تو بس ڈھول سننے کو ایک پل کی پل کھڑا ہوا ہوں۔

ـلا آدمی۔ بس کر گیا صفایا۔ تم کس باغ کی مولی ہو۔ وہ تو دور سے جیب میں پڑے روپیہ کی آواز سن لیتا ہے۔

ـمرا آدمی۔ کون برکتے۔ اور پھر اس کی ماں۔ اونہہ اُن کے جیاٹے درخت کبھی ہرے نہیں ہوئے۔

(پردہ گرتا ہے)

اور دوسری فارسی میں ہے۔ ان دونوں زبانوں میں ایسی ہم قافیہ و ہم زمین غزلیں بہت کم ملتی ہیں
فیصلہ کر سکیں گے کہ فراق کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ دونوں غزل
چمکا دیا ہے۔
(ادارہ)

قندِ پارسی

گورکھپوری

ہر اک بینندہ دنیائے نورے و نارے ۔۔۔ کہ آفاق بر عشق دار و حصارے
بہر شعرِ بیدار روئے حسنِ نگارے ۔۔۔ نفس را نوائے تن آئینہ دارے
بہر جلوۂ جسم پنہاں نگاہے ۔۔۔ ز سر تا قدم نرگسِ شرمسارے
جمالِ سکوں شیوہ تصویرِ تمکیں ۔۔۔ دلِ بے قرارے و بے اختیارے
ز تاریخِ دوراں مرا رنجِ جاناں ۔۔۔ شرابے شرابے خمارے خمارے
زہے رنگ و بو دیگرے ہر چمن را ۔۔۔ ریاضے ریاضے بہارے بہارے
بداں جلوہ را بست تکرار زنہار ۔۔۔ ادائے ادائے نگارے نگارے
دلا عشق را دی بدائے کشیدند ۔۔۔ کنم طرح آنہا کہ کردند کارے
مکن ذکرِ عقبےٰ کہ سرمست ہستم ۔۔۔ بہ کیفیتِ ہستیِ مستعارے
کند عزم ایں ہمت آں خوش خرامے ۔۔۔ ہر اک وقفہ از زندگی انتظارے
بر آں ساعدِ ناز دامن نہادہ ۔۔۔ کہ برگے بجنبد بہ سر شاخسارے
پسِ پردۂ یاس رخشندہ مقصد ۔۔۔ نمایاں شود از غبارے سوارے
کسے می شناسد چساں آدمی را ۔۔۔ گہے اہرمن گاہ پروردگارے
بہ وجد دار و رسن را نبر کن ۔۔۔ گناہِ محبت کنم آرے آرے
بہ یک وقت ہمراز غماز لطف رنجش ۔۔۔ دریغا کہ شد پردہ در پردہ دارے
نماند نطف ہر دو عالم تمامتر ۔۔۔ بہ یک جنبشِ نرگسِ فتنہ کارے
خزاں ہا چہ؟ یک عشوۂ چہرہ پوشی ۔۔۔ بہاراں چہ؟ یک جلوۂ گلعذارے
بصد ناز بندِ قبا برکشائی ۔۔۔ چمن زارِ فردوس ہا در کنارے

ترا جانِ من سر خوشی ہا مبارک
فراقِ جہاں دیدہ غم دوستدارے

ان دونوں غزلوں میں بڑے لطف کی چیز یہ ہے کہ ایک ہی زمین میں پہلی غزل اردو میں ہے جس کا مصنف ایک ہی شاعر ہو فارسی زبان کا اہل اور لطیف مذاق رکھنے والے اس امر کا میں فراق نے اپنا مخصوص اسلوب بیان اور انداز احساس یعنی اپنے رنگ کو خوب خوب

قندِ ہندی

فراق

تجھے دیکھ کر رو پڑے ہیں بچارے
یہ دیوانے ہیں کتنے بے اختیارے

سکھاتے ہیں کلیوں کو کھلنا یہ کم کم
لبِ ناز کے نیم خندہ شرارے

کہاں کشتیاں ڈال پائیں گی لنگر
کہ بہتے چلے جا رہے ہیں کنارے

کرے عرضِ غم جس قدر ناز کم ہے
وہ سن کر ذرا مسکرا دے تو بارے

انھیں میں تو ملتی ہے صبحِ بہاراں
یہ رخسار تیرے بہت پیارے پیارے

دلِ زخم زخم ایک گنجِ نہاں ہے
کہ جھولی میں ہیں سیکڑوں ماہ پارے

شبِ غم زبانیں تو کیا کھل سکیں گی
نگاہوں کی آواز تجھ کو پکارے

جیئے بارہا تھام کر موت کا ہاتھ
مرے بارہا زندگی کے سہارے

میانِ فنا و بقا کشتیِ دل
کبھی اس کنارے کبھی اُس کنارے

مرے دل میں محفوظ ہیں کچھ صحیفے
کئی سالناموں کے ہیں یہ شمارے

دل آزردہ ہو کر تو حسن اور نکھرا
مژہ پر تری مسکراتے ہیں تارے

ارے موت سے پہلے ہی مر چکے ہیں
یہ دولت کے مارے یہ ثروت کے مارے

تغزّل کی رنگیں نوائی کے شعلے
تری انگلیوں کے حنائی اشارے

نگاہِ تماشا سے اُٹھنے کو کہنا
کہ جب حسن بھی عشق کا روپ دھارے

کبھی کاش میری غزل کو سجائیں
نگاہِ سخن سنج کے استعارے

کمر سے لپیٹے وہ ست رنگ آنچل
کریں کاش قوسِ قزح کے اشارے

کفِ پا کو چھونا تو سوءِ ادب ہے
کہو تو ابھی توڑ لاؤں ستارے

ب ایسے ہیں رنگِ فلک دیدنی ہے
ابھی لے چلے ہیں بسیرے ستارے

فراقِ حزیں کا نہ ماتم کریں گے
وہ مرتا نہیں ہے جسے عشق مارے

فراق گورکھپوری

تو ہے سر بسر کوئی داستاں ہے عجیب عالمِ انجمن
یہ نگاہِ ناز زباں زباں یہ سکوتِ ناز سخن سخن

یہ شعور رہا عقدہ افگنی یہ ادائے نرگسِ پُر فتن
کہ پلا پلا کے لنڈھا بھی دے یہ تری نگاہِ پیالہ زن

نہ زیادہ ظرف سے دے نہ کم کہ ہیں ہاتھ اس کے نپے تلے
وہی آنکھ ضامنِ ہوش بھی وہی آنکھ ساقیِ انجمن

یہ کمالِ جذبِ دلِ تپاں کبھی بدلے گردشِ آسماں
کوئی صبحِ رُوئے چمن چمن کوئی شامِ زلفِ شکن شکن

وہ گناہِ آدمِ اولیں کہ ہے مستقبل کا وہی امیں
ہیں بشر کے خون میں آج بھی کئی چشمہ ہائے مئے عدن

یہ بھی اک بہانہ تھا کھانے کا تری کج کلاہیوں کی قسم
سرِ شاخسار دکھا گئے کئی بار غنچے جو بانکپن

وہ تبسمِ لبِ نازنیں وہ بہارِ پیکرِ دل نشیں
وہی نیم خندہ کلی کلی وہی تازگی چمن چمن

یہ خیالِ محفلِ دوستاں کسی اجنبی کا ہے یہ بیاں
وہ جہاں نہ سمجھیں مری زباں وہی قسمتوں سے ملا وطن

کوئی چیز آڑے تو آ گئی کہ بخیر ہو گیا خاتمہ
مری بیکسی نے اڑھا دیا مرے آنسوؤں کا مجھے کفن

مرے ساتھیوں کو یہ غم ہے مری نور و نار کی زندگی
جو ادھر حرم کا چراغ ہے تو ادھر بھی کفر ہے شعلہ زن

کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکنِ آہواں ہے دمِ خمار ترا بدن

کبھی دادِ شوق نہ دے سکا مرے دل کو پرتوِ دلبری
کہ لرز اٹھا ہے یہ آئینہ جو لچک گئی ہے کوئی کرن

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ مری شاعری ترا پیرہن

تجھے منزلیں بھی ہیں رہگزر مجھے رہگزر بھی ہیں منزلیں
یہی فرق ہے مرے ہم سفر یہ ترا چلن وہ مرا چلن

کوئی میری آنکھوں سے دیکھتا تری بزمِ نازکی وسعتیں
وہ ہر ایک گوشہ مکاں مکاں وہ ہر ایک لمحہ زمن زمن

نہ ہے اکھڑی اکھڑی یہ زندگی نہ ہے کھوئی کھوئی یہ زندگی
مجھے کیا وطن میں سکوں ہو کہ وطن ہی آج ہے بے وطن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع سے کبھی ایزداں کبھی اہرمن

کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو
کہ غزل ہوئی تو شعور میں وہی کیفیت ہے وہی تھکن

یہ اداس اداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

○

فراق گورکھپوری

ہمنوا کوئی نہیں ہے وہ چمن مجھکو دیا — ہم وطن بات نہ سمجھیں وہ وطن مجھکو دیا
اے جنوں آج ان آنکھوں کی دلا کر مجھے یاد — تو نے سو خطہ آہوئے ختن مجھ کو دیا
مژدۂ کوثر و تسنیم دیا اوروں کو — شکر صد شکر غمِ گنگ و جمن مجھکو دیا
ڈھک لیے تاروں بھری رات نے ہستی کے عیوب — آنسوؤں کا شبِ غربت نے کفن مجھ کو دیا
پر فرشتوں کو دئے تو نے تو کیا غم اس کا — یہی کیا کم ہے کہ انساں کا چلن مجھ کو دیا
ارضِ جنت کے بھی بس میں نہیں جس کا دینا — ہند کی خاک نے وہ سوزِ وطن مجھ کو دیا
قدِ رعنا کی قسم نرم صباحت کی قسم — عشق نے کیا چمنِ سرو سمن مجھکو دیا
مل گیا تجھ کو جمالِ رخِ رنگیں کا چمن — دلِ سوزاں کا یہ تپتا ہوا بن مجھکو دیا
وہ ترے بطل سے لائے جو مجھے حق کی طرف — تو نے ایمان مرا شیخِ زمن مجھ کو دیا
میرے دل سے مرا ہر شعر کہ اٹھا تو نے — عشوہ زارِ نگہِ سامری فن مجھ کو دیا
نعرۂ حق نے کیا مرتبۂ عشق بلند — منصبِ جلوہ دہ دار و رسن مجھ کو دیا

شاعرِ عصر کی تعدید نہ کچھ پوچھ فراق
جو کہیں کا بھی نہ رکھے گا وہ فن مجھکو دیا

○

مجید امجد

اک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار

لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید
ڈھونڈو کہیں سے کوئی نگاہِ خدا شکار

اس انجمن میں دیکھیے اہلِ وفا کے ظرف
کوئی ادا شناس ہے کوئی ادا شکار

آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون، زکارِ قضا شکار

ظلِ ہما کی اوٹ میں چلتے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

جولاں گہ حیات انہی کی ہے دوستو،
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدعا شکار

مجید امجد

کہانی، ایک ملک کی

راج محل کے دروازے پر آکے رُکی اک کار
پہلے نکلا لمبا، پتلا، بودا،
میل کچیل کا تودہ
حقہ تھامے اک میراسی
عمر اس کی کوئی اسّی بیاسی،
پیچھے اس کا نائب، تمباکو بردار،
باہر رینگے اس کے بعد قطار، قطار
عنبر بار،
نمبردار،
ساتھ سب ان کے دُم چھلّے،
ایلے آتے!

راج محل کے اندر۔ اِک اک رتناسن پہ
کوڑھی جسم اور نوری جامے،
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے،
مفتی اور علّامے،
ماجھے، گامے،
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جُبّہ پہ تمغہ اور جیب میں چاقو،
نسلِ ہلاکو!

راج محل کے باہر، گہری سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی، فولاد کے پنجے،
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں،
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں!

بھکارن

مجید امجد

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگذر کے دو رویہ سبزہ و کشت
چار سُو ہنستی رنگتوں کے بہشت

صد خیابانِ گل — کہ جن کی طرف
دیکھتا ہی نہیں کوئی راہی!
سُرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی

آن کر جھک گئی ہے رستے پر،
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے:

"میں کہاں روز روز آتی ہوں،
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک،
جانے والو! بس اک نگاہ کی بھیک!"

○

مجید امجد

امیدِ دیدِ دوست کی دنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بجھا کے ہم

وہ راستے خبر نہیں کس سمت کھو گئے
نکلے تھے جن پہ رختِ غمِ دل اٹھا کے ہم

پلکوں سے جن کو جلتے زمانوں نے چن لیا
وہ پھول اس روش پہ ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی تو پھر وہی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
ابھرے ہیں، بادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

موجودگی

مجید امجد

پھر آج دل میں کوئی موجِ غم پگھلتی ہے
شبِ خیال میں قندیلِ عود جلتی ہے
پھر اک ادائے حجاب
رسومِ دہر کی زنجیر اُتار آئی ہے،
بہار آئی ہے
رسومِ دہر کی اس سنگدل فصیل کے پار —
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار،
محبتوں کے سراب،
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی جھنک
مرے دکھے دل تک!
ہر اک طرف — ہوسِ دید کے نیستاں میں
کسی حسین سی موجودگی کی خوشبوئیں —
خمارِ قرب کے خواب،
ہزار غم کہ جنھیں کیفِ شوق کی نیندیں
پیامِ تسکیں دیں!

نرگس

مجید امجد

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز اک نئے بہروپ میں، روز اک نئے انداز کے ساتھ
اپنی ان کانپتی ہوئی انکھڑیوں کی پُرشمک طنّاز کے ساتھ
روز اک تازہ صنم خانۂ آہنگ میں در آئی ہے

ایکٹریس! روپ کی رانی! تجھے معلوم نہیں
کس طرح تیرے خیالوں کے بھنور میں جی کر
ان تمناؤں کا تلخابۂ نوشیں پی کر
میں نے اک عمر ترے ناچتے سایوں کی پرستش کی ہے!

تو نے اس عظمتِ صد رنگ سے جس جذبے کو
آج تک اپنے لئے مزدِ ہزار اشک سمجھ رکھا ہے
وہ محبت مرے سینے میں تڑپتی ہوئی اک دنیا ہے
جو ترے قدموں کی ہر چاپ پہ چونک اٹھتی ہے

کاش میں بھی وہی اک عکسِ درخشاں ہوتا —
دلِ انساں سے ابھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس —
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہوا ناموِ فغاں شخص
جس کے پہلو میں تری روح دھڑک سکتی ہے

ظہورِ آدم

جگن ناتھ آزاد

کرۂ ارض
ایک سوالیہ نشان — اور
عقلِ انسانی کی نارسائی

ہماری یہ زمیں یہ عنصر کا گہر خوشبوؤں کا گہوارہ خلا میں رقص کرتا گھومتا روشن ترین تارہ
تمدن کا مہکتا بوستاں تہذیب کا گلشن ہنر کی آبرو، سائنس کا گھر، علم کا مسکن
کہانی فلسفے کی، داستاں عشق و محبت کی مسلسل آج تک جاری فغاں عشق و محبت کی
یہ دنیا شاعروں کی اور افسانہ نگاروں کی یہ مسکن حسن بینوں کا یہ محفل حسن کاروں کی
حسینوں کا یہ جمگھٹ انجمن روشن جبینوں کی یہ محفل ماہ پاروں کی یہ منزل نازنینوں کی
گرجتی، شور کرتی ایک دنیا کارخانوں کی کہانی حوصلوں کی ولولوں کی اور اُٹھانوں کی
خزانہ سیم و زر کا لعل و گوہر کا، نگینوں کا وطن الماس و یاقوت و زمرد کے دفینوں کا
نمک کی کان، میٹھے پانیوں کا منبع و مخزن قیامت خیزیوں جولانیوں کا منبع و مخزن
اُٹھائے ہاتھ پر طوفان کو، طوفانی جہازوں کو سمیٹے اپنے دل میں سینۂ فردا کے رازوں کو
سرشت اس کی سکوں بھی ہے مسلسل سخت کوشی بھی سمندر کی گرج بھی ہے چٹانوں کی خموشی بھی

یہ نور و نار کا گہوارا بھی ہے ظلمت کدہ بھی ہے
سرا ماتم کی بھی ہے اور یہ عشرت کدہ بھی ہے

مگر آخر یہ کیا شے ہے خرد اس جستجو میں ہے یہ پردہ کاش کھل جائے بشر اس آرزو میں ہے
خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری انتہا کیا ہے میں خود اس فکر میں رہتا ہوں میری ابتدا کیا ہے

یہ وہ صورت ہے جو انسان سے جانی نہیں جاتی
نہیں جاتی یہاں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی

شعلے اور دھوئیں سے مادّے تک — کروڑوں سال کا طبعی عمل

خرد نے اس کو میزانِ تجسس میں جو تولا ہے — تو اتنا ہی بشر کی جستجو نے راز کھولا ہے
کہ یہ خاکی کرہ تھا ابتدا میں پیکرِ ناری — جواب اک پھول ہے وہ اصل میں تھا ایک چنگاری
بساطِ لامکاں پر یہ زمیں سوزاں ہیولا تھی — یہ گلزارِ تمنا آگ کا رقصاں بگولا تھی
بگولا آگ کا جلتا رہا جلتا رہا صدیوں — یہ آتش کا چمن پھیلتا رہا پھیلتا رہا صدیوں
مسلسل وقت کی زحمت عمل پیرا رہی اس پر — کروڑوں سال کی مدت عمل پیرا رہی اس پر
تو ٹھنڈی ہوگئی اک روز اس کی سطح بیرونی — نتیجہ تھا کروڑوں سال کی محنت کا افسونی
چٹانیں ہوگئیں طاری اسی باہر کی دنیا پر — کہاں کالی چٹانیں اور کہاں یہ آگ کا منظر
تپش کو چھوڑ کر اب تھی ہماری خاک خاموشی — چٹانوں کی بھیانک اور مہیبت ناک خاموشی
مکاں سے لامکاں تک ایک خاموشی ہی خاموشی — زمیں سے آسماں تک ایک خاموشی ہی خاموشی

جہاں میں خامشی کی داستاں ہی سے عبارت تھا
یہ منظر اک سکوتِ بیکراں ہی سے عبارت تھا

چٹانوں کا سماں تھا وقت کی چشمِ پریشاں میں — چٹانوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا بزمِ امکاں میں
چٹانیں ایک گہری نیند میں سوئی ہوئی دنیا — چٹانیں ایک اپنے آپ میں کھوئی ہوئی دنیا
یہ گہری نیند میں سوتی رہیں سوتی رہیں صدیوں — ادھر ان پر مسلسل بارشیں ہوتی رہیں صدیوں
مسلسل بارشیں تھیں وقت کا اک معجزہ گویا — ملا تھا صبر کا دنیائے خاکی کو صلہ گویا
چمک اٹھی انھیں کے فیض سے قسمت چٹانوں کی — چٹانیں بن گئیں بنیاد لاکھوں داستانوں کی
جو پانی بارشوں کا اس طرف سے اس طرف آیا — تو اپنے ساتھ ذرّوں کو اٹھا لایا بہا لایا

تہہ میں جمتی گئیں ذرّوں سے اور بنتی گئی مٹی
ضمیرِ کہنگی سے کندہ چلی تھی یہ نئی مٹی

صبحِ ازل

یہ مٹی بارشوں میں سر بسر ڈوبی ہوئی مٹی — یہ پانی میں سراپا تر بتر ڈوبی ہوئی مٹی

یہ مٹی اپنی دنیا چھوڑ کر جب آ گئی ہوتی مٹی   یہ مٹی اک مسلسل نیند سے جب جاگی ہوتی مٹی
یہ مٹی جس کو پہلی زندگانی یاد تھی اب تک   یہ مٹی نور کی جس کو کہانی یاد تھی اب تک
یہ مٹی جلوۂ پُرنور سے جس کا تعلق تھا   یہ مٹی اک شعاعِ طور سے جس کا تعلق تھا
یہ مٹی جس کو پہلی زندگانی یاد آتی تھی   اُسے پھر آرزو اک روشنی کی گدگداتی تھی
تمنائے تجلّی پھر اُسے بیتاب رکھتی تھی   تمنا خاک میں بیتابیٔ سیماب رکھتی تھی
بالآخر رنگ لایا ایک دن یہ جذبِ پنہانی   نہ تھی بادلوں میں یکا یک سورج کی تابانی
دعائیں کامیاب آئیں تمنا کامگار آئی   امیدوں کے چمن میں رقص فرماتی بہار آئی

کچھ اس صورت سے چمکا خاک کی تقدیر کا تارا
کہ تھا ذرّے کے گھر مہمان خورشیدِ جہاں آرا

یہ تھی ذوقِ نظارہ پہلی سحر دنیائے ویراں کی   شعاعیں خاک کے دامن پہ تھیں خورشیدِ تاباں کی
یہ تھی صبحِ ازل یہ ابتدائے زندگانی تھی   یہ فردا کی بشارت تھی نویدِ شادمانی تھی
یہ وہ منظر ہے جو لفظ و بیاں میں آ نہیں سکتا   اسے آزاد مضمونِ سخن پہنا نہیں سکتا
اسے تو نے جو دیکھا ہے زباں دہرا نہیں سکتی   قلم خاموش ہے تابِ بیاں دہرا نہیں سکتی
یہاں اصغر کا اک شعرِ منور یاد آتا ہے   کہ جب الفاظ مل جاتے ہیں دل تسکین پاتا ہے

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

کرن سورج کی گردوں سے اُتر کر خاک پر آئی   تو اس کو چار جانب اک نئی دنیا نظر آئی
کہیں تو صاف پانی تھا کہیں کیچڑ نظر آئی   کہیں ہر گام پر تصویرِ جوہر کی ابھر آئی
کوئی منظر تھا ظلماتی کوئی جلوہ تھا مہتابی   کہیں تھے خشک ذرّے خاک کے قطرے کہیں آبی

وہ ذرّے جن کو اک دن نجد کا میدان بننا تھا
وہ قطرے جن کو اک دن نوح کا طوفان بننا تھا

روئے زمین کا پہلا معجزہ — بے جان مادّے کے بطن سے زندگی کی پیدائش

جمودِ مادہ کی داستاں دہرا رہا ہوں میں   جو پہلے آ چکا ہے وہ بیاں دہرا رہا ہوں میں
وہ خشکی تھی کہ پانی تھا فقط بے جان تھی دنیا   بظاہر وقت کے دل کا کوئی ارمان تھی دنیا
چٹانوں کا جہاں تھا وقت کی گردش سے بے پروا   سکوتِ بیکراں تھا وقت کی گردش سے بے پروا

چٹانیں تھیں کہ ذرّے تھے وہ کیچڑ تھی کہ پانی تھا — غرض جو کچھ تھا پابندِ سکوتِ جاودانی تھا
یہ ایسے ساز تھے جن سے صدا کوئی نہ اٹھتی تھی — یہ تھے خاموش لب ان سے دعا کوئی نہ اُٹھتی تھی

مہیا تھے تلاطم کے سبھی سامان دنیا میں
مگر یہ سب کے سب بے جان تھے بے جان دنیا میں

کروڑوں بلکہ اربوں سال یہ نقشہ رہا جاری — کہ عنصر ہیں مگر سارے کے سارے زیست سے عاری
مگر چشمِ فلک نے اک نرالا ہی سماں دیکھا — کسی شے کو کسی خلیہ کو۔ پانی پر رواں دیکھا
یہ ہے کیا چیز یہ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا — کبھی اس سمت یہ نقطہ کبھی اس سمت جاتا تھا
اُدھر دوڑا، اِدھر بھاگا اُدھر لڑھکا اِدھر آیا — اُسے پانی کا ریلا جس طرف چاہا بہا لایا
مگر اک دن جڑیں اس نے پکڑ لیں دور پانی میں — اُسے ٹھہراؤ حاصل ہو گیا اپنی روانی میں

بڑھا اوپر کی جانب اور پودا بن گیا آخر
ریاضت کا یہ ثمرہ مادّے نے پا لیا آخر

"آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا"
(میر)

یہ خلیے اور اس کی زندگی کا ایک پہلو تھا
ادھر اک اور پہلو پر نمو کا کام جاری تھا
وہ تھی شاخِ نباتاتی تو یہ تھی شاخِ حیوانی
مگر اس شکلِ انسانی سے پہلے اس پہ کیا گزرا
وہ اک خلیہ کبھی جو تھا رواں پانی کے دامن میں
تو اس نے ہیئتوں کے رنگ بدلے سینکڑوں لاکھوں
جڑیں اس رنگ سے اُس نے جو پکڑیں گہرے پانی میں
تو آخر یہ رکاوٹ بن گیا اک رینگتا کیڑا
یہ کیڑا آج مینڈک، کل ہے بچھو سانپ ہے پرسوں
انھیں برسوں نہ کہیے ان کو صدیوں سے سوا کہیے
تو جب جا کر کہیں اتنی سمجھ میں بات آتی ہے
یہ ایسا معجزہ ہے علم ہی نے جس کو کھولا ہے
تکلّم کی فسوں کاری اسے سمجھا نہیں سکتی

زمیں پر زیست کی تابندگی کا ایک پہلو تھا
زبان و وقت پر بس ارتقاء کا کام جاری تھا
اسی کے ارتقاء نے پائی اک دن شکلِ انسانی
قیامت ہے نہ تھا کم اس پہ جو بھی ماجرا گزرا
جو بیٹھا آن کر اک دن مقدّر کے نشیمن میں
حیاتِ مادہ نے ڈھنگ بدلے سینکڑوں لاکھوں
رکاوٹ اس نے بھی جب پا لیا اپنی روانی میں
طبیعت کا جھکاؤ بن گیا اک رینگتا کیڑا
اسی صورت سے گزرے مادّے کی زیست پر برسوں
ہزاروں سال کی مدّت کو اک لحظہ نما کہیے
کہ کیسے نیست سے ہستی خمیر اپنا اُٹھاتی ہے
اسے سائنس نے تحقیق کی میزان میں تولا ہے
خرد سائنس سے ہٹ کر یہ نقطہ پا نہیں سکتی

اسے رنگِ تغزل میں بیاں کرنا نہیں ممکن
یہ پتھر ہے اسے آبِ رواں کرنا نہیں ممکن
یہ باریکی ہے وہ جو علم کی رگ رگ میں ساری ہے
ترنم اس کو محفل میں بیاں کرنے سے عاری ہے
یہ وہ حد ہے جہاں جذبے کو ہم مسحور پاتے ہیں
یہاں ہم نطق کو اظہار سے معذور پاتے ہیں
خرد جب تک درِ تحقیق پر چل کر نہ جائے گی
یہ رمزِ ارتقاء اس کے تصور میں نہ آئے گی

اٹھایا پست سے مٹی نے جب دل خمیر اپنا
تو روشن کر لیا اپنی ریاضت سے ضمیر اپنا
وہی بچھو، وہی مینڈک رہا گرمِ سفر صدیوں
بنایا وقت نے کیڑے کو اپنی رہگذر صدیوں
تو کیڑا سانپ بچھو اور مینڈک کیسے چلا آگے
وہ وقت اب آ رہا تھا اس کا جب بخت رسا جاگے
کہیں انداز مچھلی کے، کہیں تیور چرندے کے
کہیں اشجار کی شاخوں میں نغمے تھے پرندے کے
ہوا پھر رونما اک دورِ نو آہستہ آہستہ
بڑھی کچھ اور آگے کو یہ خو آہستہ آہستہ
چرندوں میں نمایاں ہو گیا اک جانور بندر
یہ حیراں تھا مگر تھا ایک حد تک دیدہ ور بندر
یہی ذوقِ نمو بندر سے انساں بن گیا اک دن
جو تھا روٹھا مقدر ارتقا سے من گیا اک دن
زمینِ پست کی تقدیر کا تارا چمک اٹھا
نگاہِ وقت میں تابندہ نظارا چمک اٹھا
وہ جس کا منتظر تھا اک زمانہ آج آ پہنچا
کہ بن کر آدمی مخلوق کا سرتاج آ پہنچا

اسی تصویر کا دوسرا رُخ

وید بھگوان کا نظریہ

کہانی ہے یہی جو علمِ نو کے لب پہ رہتی ہے
مگر روحانیت اس باب میں کچھ اور کہتی ہے
مقدس وید نے یہ راز یوں ذہنوں پہ کھولا ہے
اسے میزانِ روحانی میں اکثر اس نے تولا ہے
خدا ہے، روح ہے یا مادہ ہے، جاودانی ہیں
ازل کے یہ حقائق ہیں ہمیشہ غیر فانی ہیں
نہ ان کی ابتدا کوئی نہ ان کی انتہا کوئی
تسلسل بیکراں ہے یہ نہیں اس کا سرا کوئی
یہی نکتہ بالآخر کرشن نے گیتا میں دہرایا
تعلق جب بدن سے روح کی دنیا کا سمجھایا

انجیلِ پاک کی رُو سے

بقولِ انجیلِ اقدس کے خدا روزِ ازل سے ہے
یہ ذاتِ حق کا ہے جو سلسلہ روزِ ازل سے ہے

ازل میں آج کی اس بزمِ رنگیں کا یہ عالم تھا
خدا کی روح تھی اور پانیوں پر رقص پیہم تھا
خدا ہی صانعِ عالم ہے خالق زندگانی کا
خدا ہی ہے مسبب بحرِ ہستی کی روانی کا
اسی کے فیض سے مٹی میں موجِ زندگی آئی
اُسی کے نور سے ظلمات میں تابندگی آئی

قرآن مجید کے مطابق

کلامِ پاک فرماتا ہے یوں اس باب میں اے دل!
کہ یہ انسان اور انسان کی یہ گرمیٔ محفل
فقط تعمیلِ حرفِ کُن میں اس کا راز پنہاں ہے
نتیجہ حرفِ کُن کا ہے زمیں ہے وہ کہ انساں ہے

اصل مقصد کی جانب

میں شاعر ہوں مجھے اس بزم میں پیغام اے ساقی!
اٹھا انساں کی عظمت کا چھلکتا جام اے ساقی!
کہ میں اس جام کے اک گھونٹ سے سرشار ہو جاؤں
یہی پھر کیف دل میں صفحۂ قرطاس پہ لاؤں
پلا وہ جام جس سے زندگی بیدار ہو جائے
مرے افکار کی تابندگی بیدار ہو جائے
مرا ہر لفظ برسائے تجلی شانِ آدم کی
مرا ہر شعر بن جائے تجلی شانِ آدم کی
مری تابِ تکلم دے ثبوت اس ہوشمندی کا
کہ میرا شعر ہو آئینہ انساں کی بلندی کا
مرے افکار کے سوزِ نہاں سے یہ ضیا اُبھرے
مرے اشعار کے حسنِ بیاں سے یہ نوا اُبھرے

سلام

سلام اے آدمِ خاکی! سلام اے سرِ افلاکی!
سلام اے رازِ خود بینی! سلام اے رمزِ بیباکی!
سلام اے آدمِ فانی! سلام اے جلوۂ باقی!
سلام اے بزم ہائے ہاؤ ہو سلام اے بزم کے ساقی!
سلام اے شورشِ طوفاں سلام اے لذتِ ساحل
سلام اے منزلِ جادہ سلام اے جادۂ منزل
ترے آنے سے اس ظلمت کدے میں روشنی آئی
کہ تیرے ساتھ آئی جس قدر ضو افگنی آئی
چمک سورج میں تیری غنچہ و گل میں مہک تیری
ضیا تیری ستارے میں ہے کوندے میں لپک تیری
تڑپ بجلی میں تیری روشنی مہتاب میں تیری
سکوں ساحل میں تیرا گھن گرج گرداب میں تیری
خموشی پھول میں تیری ہے بلبل میں نوا تیری
نسیمِ صبح میں دامن کشِ دل ہے ادا تیری

ترے ہونٹوں پہ نغمے وید اقدس کے مچلتے ہیں
تری صورت میں پنہاں رام کی شانِ جلالی ہے
ذبیح اللہ کا جذبہ ہے تیرے دل میں عشق طپیدہ
ترے ہر ولولے میں مارکس کا انکار پنہاں ہے
شجاعت تیرے بازو میں ہے رستم اور ارجن کی
علی کا علم تجھ میں زور تجھ میں حوصلہ تجھ میں
تری آنکھوں سے ظاہر قیس کی دیوانگی بھی ہے
تفکر دانتے کا ولولہ تجھ میں کولمبس کا
عزائم تیرے بے پایاں تخیل بے کراں تیرا

مسیحی وعظ کے اسرار تیرے دل میں پلتے ہیں
ترے چہرے پہ یوسف کا عیاں رنگِ جمالی ہے
گورونانک کی بھگتی ہے ترے سینے میں خوابیدہ
ترے ہر جذبے میں اقبال کا اقرار پنہاں ہے
عقیدت ہے ترے احساس میں پوشیدہ لچھمن کی
سرِ میداں حسین ابنِ علی کا ولولہ تجھ میں
منو کی تیری چتون سے عیاں فرزانگی بھی ہے
ترا ذوقِ تماشا ہے کہاں آخر ترے بس کا
زمین و آسماں تیرے مکان و لامکاں تیرا

فروزاں ہے محمد کی ضیا سے تیری پیشانی
سلام اے آدمِ خاکی! سلام اے آدمِ فانی

رباعیات

جوش ملیح آبادی

ہم پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک روز
اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک روز
بے مہر نگاہوں کی گزرگاہ ہے اب
یہ چہرہ، جو نظروں کا حرم تھا اک روز

اک یاد کا شیشہ کل جگر میں ٹوٹا
اک دل کا حباب چشم تر میں ٹوٹا
اک غرق جزیرہ حافظے میں اُبھرا
اور نیند کا آب گینہ سر میں ٹوٹا

اللہ رے بے کسی کی خاموش کراہ
اس کرب کی ملتی نہیں آفاق کو تھاہ
کھلتی ہے لبوں پہ بے نوائی اپنی
آنکھوں سے کبھی کبھی نکلتی ہے وہ آہ

دم توڑ چکی ہیں رنگ رلیاں دل کی
چٹکیں گی نہ اب پھول کے کلیاں دل کی
میلا سا جہاں روز لگا رہتا تھا
سنسان پڑی ہیں اب وہ گلیاں دل کی

○

اثر لکھنوی

جس دم خیالِ نرگسِ مستانہ آ گیا — میخانے میں سمٹ کے پری خانہ آگیا
ہر جلوہ اک حجاب ہے یا تھا نظر نواز — یہ کون بزمِ ناز میں بیگانہ آگیا
ساقی نے اس ادا سے دیا مسکرا کے جام — رندوں کے لب پہ نعرۂ مستانہ آگیا
آشوب گاہِ عشق کی اللہ ری وسعتیں — دامن میں ذرّے ذرّے کے ویرانہ آگیا
کیسا ملال ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی — ناکامیوں کا یاد جب افسانہ آگیا
مژدہ کہ انکھڑیوں میں کسی کی بغیر مے — رنگِ نشاط جوشیٔ پیمانہ آگیا
تیرے نثار گریۂ سرشار آرزو — اشکوں کو طرزِ لغزشِ مستانہ آگیا
آہ و فغاں کا خندۂ گلجوش ہے جواب — کس شوخ پر تو اے دلِ دیوانہ آگیا
کوئی نہ کوئی ربط ہے سوز و گداز میں — کھنچ کر حریمِ شعلہ میں پروانہ آگیا
ہوش و خرد خراب ہیں جس کی تلاش میں — جیبِ جنوں میں وہ دُرِ یکدانہ آگیا
ساقی کا التفات تھا ہم پر بھی ایک دن — آنکھیں لڑیں کہ دور میں پیمانہ آگیا
تھی شمع اشکبار خود اپنے ہی حال پر — اُوپر سے جلنے مرنے کو پروانہ آگیا

اک جرم ہے کہ جس کی تلافی نہیں اثر
لب پر جو کوئی حرفِ حریفانہ آگیا

○

احمد ندیم قاسمی

کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا
چاند ابھرا تو اندھیرا چمکا

صبح کو راہ دکھانے کے لئے
دستِ گُل میں ہے دیا شبنم کا

وقت سستا کے بڑھے گا پھر سے
غم مقدر تو نہیں آدم کا

مجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

حسن کی جستجوئے پیہم میں
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا

ہوئے اس دور میں فتوے جاری
کہ غزالوں کو جنوں ہے رم کا

مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے نم کا

اب سیو چاکِ گریبانِ حیات
کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

قطعات

اختر انصاری

نئے تقاضے

ہمارے جام میں صہبائے آرزو نہ ڈھلی
کسی طرح نہ کھلی اس دلِ حزیں کی کلی
یہ دُکھڑے بھول کے اخترؔ مہ و نجوم کے ساتھ
سحر کے زمزمے چھیڑو کہ رات بھیگ چلی!

چھلکی ہوئی مے

تمام عمر رہے جو رہینِ حسرتِ مے
نہ چکھی اور اسی حسرت میں مر گئے ہیہے ہے
زمیں مطالبہ کرتی ہے اُن کے حصّے کا
ہمارے جام سے اکثر چھلک ہی جاتی ہے!

نشاطِ غم

کلائی جو دِفلک کی مروڑ سکتے ہیں
طلسمِ جبرِ مقدر کو توڑ سکتے ہیں
عبث ہے جرعۂ راحت کہ اپنے غم سے ہم
ہزار قلزمِ عشرت نچوڑ سکتے ہیں

ایک تضاد

نسیمِ باغ کی فرحت کہاں سے لائے تم؟
شگفتہ پھول کی نزہت کہاں سے لائے تم؟
تمہاری زیست تو اخترؔ اجاڑ صحرا ہے
یہ لالہ زارِ طبیعت کہاں سے لائے تم؟

○

قتیل شفائی

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
اپنی تو یہ حسرت ہے کسی طرح سحر ہو

خوشبو کی ندی پھوٹ بہے ریشۂ گل سے
اک موجِ صبا کا بھی جو گلشن سے گذر ہو

مایوس بھلا کیوں ہو کوئی سنگدلوں سے
شاید کسی پتھّر کے بھی سینے میں شرر ہو

دل جان کے زاہد نے جسے توڑ دیا ہے
آجائے مزا وہ بھی جو اللہ کا گھر ہو

کس منہ سے کرے اب کوئی جنّت کی تمنّا
ممکن ہے وہاں پھر کوئی ممنوع شجر ہو

ہو جائے عبادت میں تری دید بھی شامل
مجھ سا جو زمانے کا بھی معیارِ نظر ہو

اے چارہ گرو سیرِ ہوس خوب ہے لیکن
زندانِ وفا میں کوئی دیوانہ اگر ہو

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ابنِ انشا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا انشاجی سودائی ہیں

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بیکل بیکل رہتا ہے، ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارا
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا انشاجی سودائی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سنا اور غش کھایا، اک ذکر پہ آپ اداس ہوئے
وہ عقل میں افلاطون سنے، وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کو پہنچے ہیں، وہ بی اے، ایم اے پاس ہوئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا انشاجی سودائی ہیں

گر عشق کیا ہے تب کیا ہے، کیوں شاد نہیں آباد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے، وہ قیس نہیں فرہاد نہیں
جو جان لیے بن ٹل نہ سکے، یہ ایسی بھی افتاد نہیں
کیا ہجر کا دارو عنقا ہے؟ کیا وصل کے نسخے یاد نہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے، تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں، پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشاؔ بھی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے، انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں، کیا انشاؔ کو سمجھانا ہے؟
اس لڑکی سے بھی کر لیں گے، گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑے یا تکمیل کرے، یہ عشق ہے یا افسانا ہے؟
یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے
یہ باتیں کیسی باتیں ہیں، جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

○

شاد عارفی

جو ہیں آج - یہ شاخسانے کہاں تھے
میسّر ہمیں آشیانے کہاں تھے

ہم اُس بُت پہ آنا ہے "دوانے" کہاں تھے
مگر اہلِ فتویٰ نہ جانے کہاں تھے

چمن میں ہزار آشیانے کہاں تھے
"یہ شاعر یہ بلبل" نہ جانے کہاں تھے

کہا تھا کہ انجام اچھا نہ ہوگا
ہماری مگر آپ مانے کہاں تھے

تعیّن کو جب تک سلیقہ نہ آیا
جبینیں کہاں آستانے کہاں تھے

تخاطب تغافل میں تھا فرق مشکل
کہاں تیر تھے اور نشانے کہاں تھے

وہ تھے بام پر اور در پر گماں تھا
حقیقت جہاں تھی فسانے کہاں تھے

اُنھیں ہم بتاتے، چراغِ تمنّا
جلاتے کہاں تھے بجھانے کہاں تھے

پریشانیوں میں اضافہ کیا ہے
اُنھیں اپنے گیسو بنانے کہاں تھے

جہاں تک زمانے نے پہنچا دیا ہے
یہاں تک ہمیں آپ مانے کہاں تھے

کوئی تھا بھی پرسانِ انجامِ حسرت
ہمیں داغِ حسرت چھپانے کہاں تھے

ہمیں صرف کردار پر ٹوکنا تھا
نقاب اُن کے رخ سے اُٹھانے کہاں تھے

اُلجھنا ہی، کانٹوں سے، مدِ نظر تھا
اُنھیں اپنے دامن بچانے کہاں تھے

"رسیلا گلا" شاد کس کام آتا
ہمیں شعر کہہ کر سنانے کہاں تھے

○

شادؔ عارفی

آدمی کی اُنگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے — ضبطِ نادکِ غم سے بات بن تو سکتی ہے
جب گھٹا امنڈتی ہے برق جب لپکتی ہے — آشیاں کے تنکوں پر بے کسی ٹپکتی ہے
آپ کی کدورت کا تذکرہ نہیں — لیکن — "رُوئے صاف باطن" پر چاندنی چٹکتی ہے
کیوں مزاجِ والا کو روشنی نہیں بھاتی — کیوں حضورِ والا کو آگہی کھٹکتی ہے
ہم قفس نصیبوں کا گلستاں سے رشتہ کیا؟ — جس طرح کوئی ڈالی ٹوٹ کر لٹکتی ہے
کیا شراب کی بدبُو بس گئی دماغوں میں — انجمن کا دعویٰ ہے، انجمن مہکتی ہے
کام عزم و ہمت سے انصرام پاتے ہیں — کاہلی کی مت سنئے، کاہلی تو بکتی ہے
کیا کسی نوازش کی پول کھول دی میں نے — آنکھ جھینپتی کیوں ہے بات کیوں بہکتی ہے
ان اُداس غنچوں کو اتفاق ہی سمجھیں — جبکہ موسمِ گل میں ہر کلی چٹکتی ہے
حاضرینِ حلقہ نے مان ہی لیا آخر — شیخ کی نگاہوں میں شاعری چھلکتی ہے
ساتھیو! تھکے ماندو! ہارتے ہو ہمت کیوں — دور سے کوئی منزل دل میں کب چمکتی ہے
جس کو نکہتِ گل سے واسطہ نہیں ہوتا — خوش لباس پھولوں پر وہ نظر بھٹکتی ہے
ان بُتانِ سنگیں کے دل میں نوچ کیا معنے — یا گمان ٹلتی ہے یا کمر لچکتی ہے
شادؔ ان اندھیروں میں کہکشاں کی منزل سے — رات کے گزرنے کی صبح راہ تکتی ہے

○

امتیاز علی عرشی

درد بڑھتا نہیں جب تم سے تو درماں ہی سہی
ہم ہیں ممنون بہرحال پشیماں ہی سہی

کچھ تو گھٹ جائے اندھیرا مرے کاشانے کا
نہ سہی برق چراغِ تہِ داماں ہی سہی

پیرہن یاں بھی سلامت نہ رہے گا یارو
دشتِ وحشت جو نہیں صحنِ گلستاں ہی سہی

کاکلِ دہر کو سو بار سنوارا ہم نے
جب یہ رہتی ہے پریشاں تو پریشاں ہی سہی

دل میں ہو درد تو ہنسنا نہیں کم رونے سے
خوئے تسلیم سے کھد ولبِ خنداں ہی سہی

چاہیئے ہم کو بہانہ کوئی جمعیت کا
غمِ جاناں نہیں دیتے غمِ دوراں ہی سہی

کب تلک ہاتھوں کو بیکار رکھو گے عرشیؔ
دسترس میں نہیں دامن تو گریباں ہی سہی

عبدالمجید حیرت

○

شاد ہیں ہم چشمِ نم ہوتے ہوئے
مسکرا دیتے ہیں غم ہوتے ہوئے

کر رہے ہیں زندگی کے دن بسر
صرف صد رنج و الم ہوتے ہوئے

اللہ اللہ اس قدر بیگانگی
یہ ستم، اہلِ کرم ہوتے ہوئے

کیا قیامت ہے کہ اتنی دور ہے
در کسی کا دو قدم ہوتے ہوئے

رحم کب ہوگا کہ مدت ہو گئی
ہم غریبوں پر ستم ہوتے ہوئے

ہم نے راہِ عشق میں اک ہاتھ کیا
سر بھی دیکھے ہیں قلم ہوتے ہوئے

اب عزیزوں کو نہیں یہ بھی پسند
دیکھ لیں دو دل بہم ہوتے ہوئے

دیر ہی لگتی ہے کیا اُس بزم میں
عہد و پیماں کالعدم ہوتے ہوئے

کون فرزانہ کرے گا اختیار
راہِ بت خانہ حرم ہوتے ہوئے

حال پھر بھی ہے وہی افلاس کا
ہاتھ میں دام و درم ہوتے ہوئے

ہم نے تو حیرت، یہ اپنا بارِ غم
شاذ ہی دیکھا ہے کم ہوتے ہوئے

○

آغازِ کار کا کوئی انجام تو ملا
دانہ اگر نہیں نہ سہی، دام تو ملا

اچھا ہوا کہ اور بڑھیں دل کی الجھنیں
کچھ وقت کاٹنے کے لئے کام تو ملا

پیدا تو کچھ ہوئی دلِ مایوس میں امید
گلشن کو پھر بہار کا پیغام تو ملا

ہے شکر کا مقام کہ اس دستِ ناز سے
مدت کے بعد آج کوئی جام تو ملا

وہ دستانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں
حیرت مسافرت میں یہ آرام تو ملا

○

گزرا یوں ہی وقت ہمیشہ — یہ اندیشہ، وہ اندیشہ
ہے ہم نشتر خوردہ رگ رگ — درد رسیدہ ریشہ ریشہ
دل ہے صرف انہی کا قائل — ہیں جو لوگ محبت پیشہ
شیر کوئی واللہ نہیں ہے — دیکھ لیا ہے بیشہ بیشہ

دل پر جب چلتا ہے حیرت
چلتا ہے غم ہی کا تیشہ

پیامِ فطرت

پروفیسر شور

با وصفِ حرم پہ عزمِ داور   سونے کے تراشے جائیں آذر
زرتشت کی آگ سرد ہو جائے   گوتم کی صدا فضا میں کھو جائے
عیسیٰ کا لہو صلیب پی لے   تثلیث کفن خود اپنا سی لے
زندان و صلیب ہوں جہانگیر   جبریلِ امیں ہوں پا بہ زنجیر
بیمار و حزیں ہوں ابنِ مریم   ہو خضر کو قافلوں کا ماتم
خورشیدِ عجم کرن کو ترسے   ٹیونس کی زمیں پہ خون برسے
جمہور کے زخم چھل چکے ہوں   انسان کے ہونٹ سل چکے ہوں
روشن ہو لہو سے شمعِ شاہی   ناچے لاشوں پہ کجکلاہی
آفاق ہو تیرگی سے معمور   اوڑھیں گے ستارے چادرِ نور
قرنوں کے جلے چراغ کجلائیں   صدیوں کے دئیے بجھیں تو بجھ جائیں
بجھنے کی نہیں سحر کی قندیل   بہتے ہی رہیں گے دجلہ و نیل
گلشن میں نسیم ہو کہ صرصر   کھولیں گی گھٹائیں اپنے شہپر
بادل ہے خنک ہوا ہے شاداب   رکتا نہیں رنگ و بو کا سیلاب

ہنستا ہے کلی کلی کا معمول
ہنسنے سے نہ باز آئیں گے پھول!

○

پروفیسر شور

آنکھوں آنکھوں میں پیار کا عالم	پرسشِ بار بار کا عالم
نگہِ اولیں کا وہ اُٹھنا	دیدۂ شرمسار کا عالم
ہر نظر ایک بے صدا آہنگ	ہر نفس چنگ و تار کا عالم
ہر نفس شعر، ہر نگاہ شراب	سر سے پا تک خمار کا عالم
وہ ہجومِ نظر سے گھبرانا	وہ مسلسل فشار کا عالم
مسکرا کر وہ سر جھکا لینا،	حسنِ ناکردہ کار کا عالم
اشک افشاں وہ سرمہ سا آنکھیں	رات جیسے پھوار کا عالم
رخ پہ یوں زلف جیسے پھولوں پہ	ایک بھیگی بہار کا عالم
نور ہی نور تا حدودِ نگاہ	ہائے اس رہگزار کا عالم
جلوہ جلوہ سرورِ نکہت و نور	عشوہ عشوہ خمار کا عالم
اتنے نزدیک ہو کے اتنے دور	روبرو انتظار کا عالم
کچھ تو بے اعتباریوں کا گماں	اور کچھ اعتبار کا عالم

شورؔ دل کا سکوت اے توبہ
جیسے اس کی پکار کا عالم

○

انجم رُومانی

جز خارِ ہوس دامنِ تدبیر میں کیا ہے
اے سعیِ مسلسل! مری تقدیر میں کیا ہے

خوں ہو بھی چکا غم کے کچوکوں سے دلوں کا
تاخیر، خرابات کی تعمیر میں کیا ہے

دل تنگ ہیں کیوں آج مری آہ و فغاں سے
جز موجِ صدا حلقۂ زنجیر میں کیا ہے

کیوں سلسلۂ نامہ و پیغام نہیں اب
آخر مری بے ربطیِ تحریر میں کیا ہے

گر ذوقِ تجسس نہیں، "اندازِ نظر" ہیچ
گر رنگِ تلوّن نہیں تصویر میں کیا ہے

بنتی نہیں بے رنگِ خرابات کوئی بات
اے خانہ خرابی! مری تعمیر میں کیا ہے

آخر کبھی ہم کو بھی تو معلوم ہو، انجمؔ
وہ بات جو ڈھلتی نہیں تقریر میں کیا ہے

○

سلام (مچھلی شہری)

مسلسل خامشی ہے، دل میں اب نغمہ نہیں کوئی
خلوصِ زندگی میں دل نشیں دھوکا نہیں کوئی

کوئی اُس کا سکونِ مضطرب سمجھے تو میں جانوں
جو خود یہ جانتا ہو دھر میں اپنا نہیں کوئی

سجایا دل میں پھُولوں کو بلایا ماہ پاروں کو
مگر اس آئینے میں مستقل جلوہ نہیں کوئی

قدم آگے بڑھاتا ہوں تو ویرانے یہ کہتے ہیں
چلے آؤ کہ تم سا آج تک آیا نہیں کوئی

وہ آتش جذب کر کے آج میں سینے میں زندہ ہوں
جو جلنے کو تو جلتی ہے مگر شعلہ نہیں کوئی

لکیریں دیکھتا ہوں ہاتھ کی اور سوچ لیتا ہوں
یہ قسمت ہے تو خوش قسمت بھی اب مجھ سا نہیں کوئی

مآلِ ذوقِ خود بینی سلامؔ اک حسن رکھتا ہے
حقیقت سامنے ہے، دیکھ لو، دعویٰ نہیں کوئی

○

نورؔ بجنوری

اک ترنم سا مرے پاؤں کی زنجیر میں ہے
پھر کوئی فصلِ بہاراں مری تقدیر میں ہے

جھلملاتے ہیں ستارے کہ دیے جلتے ہیں
کچھ اجالا سا تری زلفِ گرہ گیر میں ہے

کچھ ترا حسن بھی ہے سادہ و معصوم بہت
کچھ مرا پیار بھی شامل تری تصویر میں ہے

اور بڑھتی ہے اسی شخص کی چاہت ناصح
یہ کرامات عجب آپ کی تقریر میں ہے

اپنی کھوئی ہوئی چھینی ہوئی جنت کا سراغ
حلقۂ دار میں ہے جنبشِ شمشیر میں ہے

میں جو چاہوں تو پگھل جائیں جدائی کے پہاڑ
یہ بھی تاثیر مرے نالۂ شب گیر میں ہے

ماہ و خورشید زمیں پر نہیں اترے اب تک
میرا ہر خواب ابھی پردۂ تعبیر میں ہے

○

اقبال صفی پوری

ٹوٹی ہے نظر کی آس کہاں، کھویا ہے کہاں دل، یاد نہیں
حاصل کی خبر تو ہے مجھ کو، لیکن غمِ حاصل یاد نہیں

اللہ رے مراحل الفت کے، اب ایک بھی مشکل یاد نہیں
اس راہ میں کتنی بار لٹے، اے رہبرِ منزل یاد نہیں

کب ساغر و مینا ٹوٹ گئے، کب شمع بجھی، کب صبح ہوئی
رنگینیٔ محفل یاد تو ہے، نیرنگیٔ محفل یاد نہیں

بجلی سی چمکتی دیکھی ہے، شعلہ سا فروزاں پایا ہے
یہ میری نظر کا دھوکا تھا یا تم تھے مقابل یاد نہیں

اک موج چلی تھی ساحل سے، اک موج بڑھی تھی طوفاں سے
ڈوبی ہے جہاں کشتی اپنی، طوفاں تھا کہ ساحل، یاد نہیں

اتنی تو خبر ہے اے ساقی، جھنکار سی کچھ کانوں نے سُنی
جو تیری نظر سے ٹوٹ گیا، وہ جام تھا یا دل، یاد نہیں

اقبال تصور نے اُن کے کھویا ہے مجھے ہر عالم سے
کس سمت ہوں میں، کس سمت ہے دل، کس سمت ہے منزل یاد نہیں

○

نواب شمس الحسن

گزار دی ہے محبت میں زندگی میں نے — تری خوشی پہ لٹا دی ہے ہر خوشی میں نے

تمام عمر یہ احسان میں نہ بھولوں گا — بہت سے کام لئے تجھ سے بیکسی میں نے

یوں ہی تجھے مرا شاید خیال آجائے — تجھے بھلا ہی دیا ہے کبھی کبھی میں نے

بس اک حسین تصور ہے اور کچھ بھی نہیں — بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی میں نے

ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں — وہیں پہ پائی جہاں پر تھی زندگی میں نے

قبول ہو کہ نہ ہو اس سے کیا غرض مجھ کو — خلوص دل سے ادا کی ہے بندگی میں نے

نہ کیوں یہ ہستیِ دل مرکزِ توجہ ہو — تری نظر سے چرائی ہے دلکشی میں نے

اب اس کے بعد تو رخ سے نقاب اُٹھ جائے — کہ دیکھ لی تری زلفوں کی برہمی میں نے

ہر ایک گوشۂ ہستی کو غور سے دیکھا — کہیں نہ پائی مگر صلح و آشتی میں نے

نہ کیوں بٹھائیں مجھے اہلِ دل سر آنکھوں پہ — کہ دی ہے عشق کو ہر شے پہ برتری میں نے

اسی پہ برق بھی گرنا تھی شمس کیا کہئے
جو آشیاں تھا بنایا خوشی میں نے

○

مصطفیٰ زیدی

ہر اک قدم پہ تمنّا ئے التفات تو دیکھ
زوالِ عشق میں سوداگروں کا ہات تو دیکھ

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اُٹھا کے چلے
اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

غمِ حیات میں حاضر ہوں لیکن ایک ذرا
نگارِ شہر سے میرے تعلّقات تو دیکھ

خود اپنی آنچ میں جلتا ہے چاندنی کا بدن
کسی کے نرم خنک گیسوؤں کی رات تو دیکھ

عطا کیا دلِ مضطر تو سی دیئے مرے ہونٹ
خدائے کون و مکاں کے توہمات تو دیکھ

گناہ میں بھی بڑے معرفت کے موقعے ہیں
کبھی کبھی اسے بے خدشۂ نجات تو دیکھ

حمایت علی شاعر

○

نالۂ غم، شعلہ اثر چاہیئے
چاکِ دل اب تا بہ جگر چاہیئے

کتنے مہ و نجم ہوئے نذرِ شب
اے غمِ دل اب تو سحر چاہیئے

یوں تو نہ ہوگا کبھی دیدارِ دوست
اب تو کوئی راہِ دگر چاہیئے

منزلیں ہیں زیرِ کفِ پا مگر
ایک ذرا عزمِ سفر چاہیئے

توڑ چکا سدِّ تعین جنوں
سایۂ دیوار نہ در چاہیئے

آئینہ خانے میں ہو درکار کیا
چاہیئے اک سنگ اگر چاہیئے

شاعرؔ اور اس بحر میں اک شعرِ تر
اس کے لئے خونِ جگر چاہیئے

○

دورِ مے و رقصِ شرر چاہیئے
بزم میں اب رنگِ دگر چاہیئے

تشنگیٔ لب کا تقاضہ ہے اب
بادہ ہو یا زہر مگر چاہیئے

دور ہے دل منزلِ غم سے ہنوز
اک غلط اندازِ نظر چاہیئے

راہ نہیں کوئی بجز راہِ عشق
عشق کا ادراک مگر چاہیئے

وہ کہ انھیں دل سے غرض ہی نہیں
دل کی یہ ضد ان کو مگر چاہیئے

سہل نہیں پیرویِ رنگِ میرؔ
سوزِ دل و دیدۂ تر چاہیئے

شاعرؔ اس اندازِ سخن کے لئے
میرؔ سا عرفانِ ہنر چاہیئے

میراث

فارغ بخاری

یہ مانا حسن و جمال فانی
ثبات ناآشنا جوانی
یہ رنگ و بو ہے فقط کہانی

مگر غلط ہے کہ زندگانی فنا گزیدوں کی داستاں ہے
جو پھول مرجھا گیا ہے اس کے نصیب میں دائمی خزاں ہے
تمام عالم دھواں دھواں ہے

سمجھنے والوں کی یہ خطا ہے
بقا خدا ہے خدا بقا ہے
عظیم فن کار بھی خدا ہے

وہ زندہ ہے جب تلک کہ موجود اس کی تخلیق کا ثمر ہے
وہ زندہ ہے جب تلک زمانے میں ایک بھی صاحب نظر ہے
فنا تو میراث بے ہنر ہے

یہ لوگ

احمد ریاض

لوگ یہ ان گنت لوگ برتر سہی   آدمیت کی عظمت سے محروم ہیں
لوگ یہ جاوداں لوگ زندہ سہی   زندگی کی حرارت سے محروم ہیں

دامنِ تعمیر پہ داغ ہیں   سالہا سال سے بےکراں بستیاں
گھومتے موڑ اور پھیلتے راستے   سائے کی طرح خاموش آبادیاں

تنگ صحنوں میں آہنگ نغمہ نہیں   چوڑیوں کی کھنک چھن بھی بے ساز ہے
سرد گلیوں میں ہے موت کا سا سکوں   تیرگی چپ منڈیروں کی ہمراز ہے

کوئے جاناں کہ ہو وادیٔ عاشقاں   ہر طرف کچھ نہیں جز غمِ آرزو
حسن میں دلربائی کا یارا نہیں   عشق کوچہ بہ کوچہ ہے بے آبرو

محفلِ زلف و رخسار بے رنگ ہے   گوشۂ گلرخاں میں صباحت نہیں
بزمِ اربابِ دل شیشے سے ہے تہی   عاشقی کا تصور سلامت نہیں

لوگ یہ ان گنت لوگ زندہ سہی   ان کے گھر ان کے در ان کی آبادیاں
پیٹ کی بھوک ہے پیار کی پیاس تک   یاں کبھی تشنہ لب ہیں کبھی نیم جاں

دہر کی رونقیں وقت کی راحتیں   چند بے اختیاروں کی میراث ہیں
ان گنت کامگاروں کی آسائشیں   چند ناکردہ کاروں کی میراث ہیں

ان کے محبوب بھی ان کے بس میں نہیں   ان کے خوابوں پہ ان کی حکومت نہیں
ان کے جذبات حدت سے محروم ہیں   ان کے سینوں میں خوشیوں کی دولت

دل لگائیں تو پرویز دل نوچ لیں   آنکھ سے آنکھ کی بات دشوار ہے
دلبری قہر ہے موت ہے عاشقی   پیار بھی سیم و زر کا سزاوار ہے

خون دے کر بھی محنت رہے بے ثمر   اہلِ فن کے لئے فن بھی تلوار ہے
ہر ہنر ہے متاعِ تجارت یہاں   ہر حسیں نقش تخلیق پر بار ہے

زندگی تا ابد جاوداں زندگی   لوگ یہ لوگ اس زندگی کے ا
سائے کی طرح خاموش آبادیاں   تنگ گلیاں سلگتے گھروندے

جاگ جائیں تو صبحوں کے خالق بنیں
زندگی کو نکھاریں اجالا کریں

میں اور ہم

پرویز شاہدی

اک پڑوسی کے گھر میں آگ لگی
اور دھواں بھر گیا مرے گھر میں
ایک ہمسائے نے جو کی فریاد
گونج اٹھا در قلب مضطر میں

میرے دل کے پڑوس میں جیسے
اب کروڑوں دلوں کا مسکن ہے
میں اکیلا ہوں یا کروڑوں ہوں
یہ جہاں میرے گھر کا آنگن ہے

مسکراتا ہے کائنات کا غم
میری آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
دیکھتی ہیں کروڑوں آنکھوں میں
اس شب تار کی سحر آنکھیں

میرے دل کی وسیع دنیا میں
درد اپنا بھی ہے پرایا بھی
"میں" کو جب "ہم" بنا لیا میں نے
خود کو کھویا بھی، خود کو پایا بھی

رُباعیات

شکیب جلالی

ملاپ

گونجی ہے فضا میں کسی ذی روح کی چاپ
یا کاہکشاں کی دفِ مہتاب پہ تھاپ
وہ سائے کے پیچھے کوئی سایہ دوڑا
ہونے کو ہے بچھڑی ہوئی روحوں کا ملاپ

ناگفتنی

رک رک کے سفینہ بہہ رہا ہو جیسے
قیدی کوئی ظلم سہہ رہا ہو جیسے
یوں ان کے حضور کپکپائے مرے ہونٹ
گونگا کوئی بات کہہ رہا ہو جیسے

طلوع

بھر جائے گی پھولوں سے شفق کی جھولی
کھیلیں گے اندھیروں کے لہو سے ہولی
خورشید کی کرنوں کے یہ غول آپہنچے
وہ سہم گئی ہے تاروں کی ٹولی

کراہیں

خوابیدہ کراہوں کی ندا آتی ہے
جس طرح دبے پاؤں صبا آتی ہے
سوتے ہوئے قیدی نے کروٹ بدلی
زنجیر جھنکنے کی صدا آتی ہے

لاشعور

وہ رسمِ عنایات نہیں ہے پھر بھی
اب پرسشِ حالات نہیں ہے پھر بھی
خواہش ہے یہی ان سے بہت کچھ کہیے
کہنے کو کوئی بات نہیں ہے پھر بھی

بھٹکا ہُوا مسافر

بلراج کومل

اک بھٹکا ہوا، بیکار مسافر میرے شہر میں پھرتا ہے
آوارہ ہے
مفلس ہے بھیڑ میں تنہا ہے
ان راہوں پر
پہیّوں کی صدا
سیّال سلگتے آہن کی بے رحم ہوا
چمنی کا دھواں
دن ڈھلنے پر
ظلمت کی فغاں
سو رنگوں میں لہراتی ہوئی مخلوقِ جواں
کچھ تارے عریاں اور پنہاں

ان راہوں پر
وہ بھٹکا ہوا
آوارہ مفلس اور تنہا
کچھ کھوئے ہوئے گیتوں کو پاس بلاتا ہے
خوابوں کی راکھ اڑاتا ہے
کچھ تازہ خواب سجاتا ہے
اس اجنبیوں کی دنیا میں
اس شہر کے ریگستان میں اس کا گاؤں نہ جانے کہاں ملے
یہ سوکھا مارا پھول نہ جانے کہاں کھلے

عظیم قریشی

ایک تجلی سی لہرائی — دیکھ تخیل کی پہنائی
صحرا میں ہے کتنی وسعت — وحشت پھر سے آن سمائی
سازِ غم کی دھیمی مستی — سونے سونے دل کو بھائی
جیون روپ کبھی کچھ دے کر — میں نے تیری تان اڑائی
تو نے مجھ کو غم سے پھونکا — دل کی بستی میں نے ڈھائی
زلف کو تو نے عریاں کر کے — شب کی ظلمت اور گھٹائی
پیت کٹاری چنچل اچپل — آنکھ سے ہو کر دل میں آئی
منظر یہ بھی دل نے دیکھا — ساز بجا آواز نہ آئی

قلبِ عظیم کبھی نہ مہکا
گو ہر گل پہ نکہت چھائی

پریم واربرٹنی

چلے تھے بچ کے تیری انجمن سے
مگر ٹکرا گئے دار و رسن سے
بہاروں کو ابھی کرنے دو ماتم
مجھے ڈھانپو نہ پھولوں کے کفن سے
خرد کو بھی محبت ہو رہی ہے
مری وحشت مرے دیوانہ پن سے
نقابِ رخ اٹھا بھی دو وگرنہ
بہاریں روٹھ جائیں گی چمن سے
دریدہ کیوں ہیں دیوانوں کے دامن
یہ پوچھیں جا کے کس گل پیرہن سے
گلے سے لگ بھی جا شامِ جدائی
پیام آیا ہے آج اُن کا وطن سے
یہ معراجِ محبت ہے ارے دل
گزر بھی جا حدِ دار و رسن سے
کبھی تو پریم تو بھی پیار کر لے
پلٹ کر گردشِ رنج و محن سے

○

افضل پرویز

اسی راہ سے تیرے گھائل گئے
کہ صحرا بصحرا چمن کھل گئے

اداؤں کی بھیک اب تو رہنے ہی دو
صدا دے کے دوارے پہ سائل گئے

جو ڈرتے رہے وہ بھنور میں گرے
جو لڑتے رہے تا بہ ساحل گئے

چلو ہم بھی جھولیں گے اب دار پر
وہاں کتنے عیسیٰ خصائل گئے

فقیروں نے محلوں پہ دستک جو دی
در و بام لرزے کلس ہل گئے

وہاں کوئی لیلائے عشرت نہ تھی
بڑے چاؤ سے سوئے محمل گئے

پھر اس تغیّر پہ خوش ہو لئے
کہ جلّاد آئے ہیں قاتل گئے

خموشی کا اب کیوں تکلّف کروں
وہ جانگاہ آدابِ محفل گئے

○

مظہر امام

گردشِ چشم کی تفسیر کروں یا نہ کروں
قصرِ اُمّید کی تعمیر کروں یا نہ کروں

کون جانے کہ سزا حسبِ طلب ہو کہ نہ ہو
جراَتِ عرض کی تقصیر کروں یا نہ کروں

میں تو رسوائے زمانہ ہوں، یہ تسلیم، مگر
آپ کے نام کی تشہیر کروں یا نہ کروں

شیخ جی مجھ کو بھی شدّاد نہ ٹھہرائیں کہیں
جنّتِ شوق کی تعمیر کروں یا نہ کروں

کہیں برہم نہ ہوں وہ جن کو ہے ابہام عزیز
آیتِ عشق کی تفسیر کروں یا نہ کروں

مفتیٔ دیں نہ کہیں کفر کا فتویٰ دے دیں
اپنے جینے کی بھی تدبیر کروں یا نہ کروں

ڈر ہے مجروح نہ ہو جائیں روایاتِ غزل
حسن کے دل کو میں تسخیر کروں یا نہ کروں

رضا ہمدانی

کسی صورت تو اب سکوں پائیں
ڈوب ہی جائیں یا ابھر آئیں

ہم نے ہر سُو جلا دئیے ہیں چراغ
قافلے بے خطر گزر جائیں

تجھ سے مل کر بھی دل کو چین نہیں
دلِ ناداں کو کیسے بہلائیں

گلستاں میں خزاں برستی ہے
مسکراؤ کہ پھول کھل جائیں

غم ہی لکھا ہے جب مقدّر میں
کیوں نہ تیرے ہی غم کو اپنائیں

اس جہاں میں تو پا سکے نہ رضا
اب اسے ڈھونڈھنے کہاں جائیں

جمیل ملک

جستجو حسن و آبرو کی ہے — یہ صدا ہم نے کو بکو کی ہے
تو زباں پر تو دل میں اور کوئی — یہ خطا تیرے روبرو کی ہے
اپنی ہی جستجو کے پردے میں — ہم نے کس کس کی آرزو کی ہے
دن کو تھی فکرِ روزگار بہت — رات بھر تجھ سے گفتگو کی ہے
اپنی رسوائی کا تو خوف نہیں — بات یہ تیری آبرو کی ہے
کیوں افق پر ہے خون کی لالی — کس نے دنیا لہو لہو کی ہے
پیرہن جل کے راکھ ہو بھی چکے — کس کو حاجت یہاں رفو کی ہے
کتنا آباد ہے یہ ویرانہ! — کچھ خبر شہرِ آرزو کی ہے
وسعتِ دو جہاں میں بکھری ہوئی — داستاں کس کے رنگ و بو کی ہے

موت اب کیوں نہ خودکشی کر لے
ہم نے جینے کی آرزو کی ہے

○

احمد ظفر

رات ہے اور اندھیاری رات
کیسے کٹے گی ہماری رات

جیسے ہر پل ساکت ہے
صدیوں پر ہے بھاری رات

خندۂ گل ہے نورِ سحر
گریۂ شبنم ساری رات

چاند ستارے کیا کم تھے
اشکوں نے بھی نکھاری رات

پھول کی خوشبو ان کے دن
چاند کا داغ ہماری رات

سیلِ نور میں روئے گا
جس دل پر ہو طاری رات

○

ظفر اقبال

کتنے رنگوں سے بے تمر گزرے
لوگ جو ہم سے بیشتر گزرے

لے اُڑے ساتھ ہی دلوں کا سکوں
جو بگولے سے در بہ در گزرے

صحنِ شب سے اُمید کے پیکر
صورتِ موجۂ سحر گزرے

آج تو سوچ کے سمندر سے
اک نئے بھید کے بھنور گزرے

ایک دو پل کی دیر ہی کیا ہے
کوئی طوفاں تو رات بھر گزرے!

جانے والے بھی کوئی رکتے ہیں
ورنہ اپنی سی ہم تو کر گزرے

دھوپ اور پیاس نے تمام کیا
ابر و سیلاب زیر پر گزرے

○

رفعت سلطان

عشق کا ظرف آزما تو سہی
تو نظر سے نظر ملا تو سہی

اب وفا کا بھی رنگ دیکھیں گے
ہم نے برسوں تری جفا تو سہی

شمع کے دل پہ جانے کیا گزری
ایک پروانہ جل بجھا تو سہی

زیست اشکوں میں ڈھل نہ جائے کہیں
دوست اک بار مسکرا تو سہی

وقت نے ہی وفا نہ کی، ورنہ
اُن کو بھی مجھ سے پیار تھا تو سہی

زندگی کو سنبھالنے والے
تو کبھی پی کے لڑکھڑا تو سہی

ہم ہی سمجھے نہ مدعا رفعتؔ
ان کی نظروں نے کچھ کہا تو سہی

○

صابر کنجاھی

آج پھر اُن کی گلی میں آ گئے
تیرگی سے روشنی میں آ گئے

کیا کہیں اس اک نظر کی داستاں
سینکڑوں غم زندگی میں آ گئے

ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں دوستو
ایک کافر کی ہنسی میں آ گئے

اُن کے جلوؤں کو ترستی ہے نظر
کس دیارِ اجنبی میں آ گئے

خود ہی صابرؔ ٹوٹ کر شاخوں سے پھول
میری آغوشِ تہی میں آ گئے

نثر نگاروں کی شاعری

مولانا عبدالماجد دریابادی

نثر نگار کو آپ نے کچھ ایسا ویسا سمجھا ہے؟ وہ جب شاعری پر آتا ہے تو اچھے اچھے شاعروں کا قافیہ تنگ کر دیتا ہے۔ لیکن یہ داستان الف سے ی تک سننے، اور سنانے کا حوصلہ کس کو؟ نثر نگار شاعر کیا کوئی دس بیس، سو پچاس ہوا ہے جو گھنٹوں میں نہیں، منٹوں کے اندر اس کا کلامِ بلاغت نظام کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے خدمتِ عالی میں پیش کر دیا جائے، اور خانہ پُری کے لئے کچھ ہلکا اچٹتا سا تبصرہ بھی کر دیا جائے؟ جی! ہتھیلی پر سرسوں کون آج تک جما سکا ہے؟ یہ اَن ہونی تو ہونے سے رہی۔ باغ و بہار والے میر امّن دہلوی اور فسانۂ عجائب والے سرور لکھنوی سے لے کر آج کی گھڑی تک صدہا نثار نویس اپنے جوہرِ شاعری دکھا چکے ہیں۔ محض ان کے ناموں کی فہرست کوئی سنانے پر آئے تو بور ہو جائیے۔ اِدھر بولنے والے کے حلق اُدھر سننے والوں کے کان دونوں پر بن کر رہے۔

اچھا، تو اب آپ جب سننے بیٹھے ہی ہیں تو کہیں کہیں سے کچھ تو سُن سنا ہی لیجئے۔ دورِ جدید کی نثر نگاری کے باوا آدم شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد سمجھے گئے ہیں۔ نام کے ساتھ 'آزاد' کا دم چھلا کیسا؟ اسے چھوڑ کر خالی نام لیجئے تو لوگ سمجھیں کہ یہ کوئی اور مولوی محمد حسین ہوں گے ——— تو یہ آزاد نرے تخلص کے گنہگار نہیں۔ اردو میں نیچرل نظموں کے بانی بھی ہوئے ہیں اور آج سے ۶۰ سال اُدھر ان کی نظمیں کورس میں داخل تھیں ——— آزاد کے ساتھ ہی ذہن میں نام ان کے ایک مشہور و زبردست معاصر مولوی نذیر احمد صاحب مترجم القرآن کا آجاتا ہے۔ یہ بے تخلص کے شاعر بھی عجب ستم ظریف تھے۔ غزل والی شاعری پر لعنت بھی بھیجتے جاتے لیکن اپنا معمول کوئی ۲۰ سال تک یہ رکھا کہ سالانہ جلسہ علیگڈھ کانفرنس کا ہو تو، مدرسہ طبیہ دہلی کا ہو تو، انجمن حمایت اسلام لاہور کا ہو تو حاضرین کے اصرار پر اپنی نظم بھرے جلسہ میں ضرور پڑھ کر سناتے تھے اور سننے والے ان کے کلام پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ نظموں میں لفظ بڑے بڑے پُر شکوہ، ثقیل، مغلق۔ ترکیبیں مولویانہ اور عربیت سے گرانبار۔ مضمون پند و موعظت کے پشتارے، اس پر بھی کلام میں دلآویزی غزل والی اور خشکی کی جگہ شگفتگی اُبلتی ہوئی۔ ایک نظم کی بسم اللہ آپ بھی سنیں ؎

بچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلافِ دین و مذہب کو

ایک مثنوی مناجاتی ہے تیور ملاحظہ ہوں۔ بحر گلزارِ نسیم کی ہے ؎

تعریف خدا کو ہے مسلّم — پیدا کیا جس نے کُن سے عالم
دی نطق کی آدمی کو قدرت — بخشا اس کو شرف کا خلعت

دریا، زمین، کوہ و صحرا　　باغ و گل و سبزہ مطرّا
سب کا ہے وہی بنانے والا　　ما اعظم شانہٗ تعالیٰ
انساں سے ہو حمد اسکی کیا خاک　　احمد نے کیا ہے ماعرفناک

اس کے بعد ایک نعت کی زمزمہ سنجی ہے

تیری خدمت میں شافع امت　　عرض حاجت کی کچھ نہیں حاجت
حور و غلماں سے مجھے نہیں درکار　　آرزو مند ان کے ہوں ابرار
میں کہاں اور کہاں ہوائے بہشت　　ناز کے زیبد مرا بطلعت زشت
میں نے بھر پائے سارے جور و قصور　　اتنا کہہ دیجئے معاف قصور
مجھ کو کامل وثوق ہے تم پر　　تم سے حق نے کہا ہے لاتنہر

دسمبر ۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں کانفرنس کا اجلاس تھا اس میں نذیر بے نظیر کا قلم قوم کے رئیس زادہ امیر زادہ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے

وہ معروف ہے عیش و تن پروری میں　　پڑا چین کرتا ہے بارہ دری میں
اُسے قوم کے حال کی کیا خبر ہو　　کہ دو دو بجے دن کے اسکی سحر ہو
حسینوں کی چاروں طرف ٹولیاں ہیں　　برابر کی عمریں ہیں ہمجولیاں ہیں
ہنسی ہے کہیں اور کہیں قہقہے ہیں　　عنادل ہیں اور باغ میں چہچہے ہیں

اور شعر یہ ہوا ہے

تھے آہوئے رم خوردہ ہر رانڈ گویا　　یہ چھوٹا ہوا اُن میں اک سانڈ گویا

راوی کا بیان ہے کہ مولانا جب دوسرے مصرعہ پر پہنچے تو "چھوٹتے ہوئے سانڈ" کو اسٹیج پر ایکیٹ کرنا چاہا۔ جلسہ میں کھلبلی مچ گئی اور صدر جلسہ کو مولانا کی شوخ ذوقی پر بریک لگانا پڑا۔ یہ ایک متانت مجسم بزرگ آنریبل جسٹس سید امیر علی تھے۔

مشہور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شررؔ کا نام نامی کس کے کان میں نہ پڑا ہوگا۔ تخلص شررؔ ایسا نام کے ساتھ چمٹا کہ اگر یہ چنگاری بجھا دیجئے تو مولانا جیسے گمنام ہو جاتے ہیں۔ شررؔ نے غزل بھی کہی ہے چنانچہ ایک مقطع حاضر ہے

مے پی کے سر دعظ وہ واعظ سے لڑے تھے
سنتے ہیں نکالے گئے مسجد سے شررؔ آج

اپنے دوست رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کے طبع اول پر قطعہ تاریخ بھی کہا تھا، مصرعہ ہے ع

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ، واہ

اپنی بھرپور جوانی کے زمانے میں دو چھوٹے چھوٹے سے مسدس بھی کہہ ڈالے تھے۔ ایک شبِ غم دوسرا شبِ وصل — شبِ وصل تک تو رسائی ہو نہ پائی، شبِ غم البتہ ہاتھ لگ گئی۔ ننھی منی سی نظم، قامت میں کہتر، قیمت میں بہتر۔ حجم میں کم مزے میں زیادہ۔ شروع اور درمیان اور آخر سے ایک ایک بند ملاحظہ ہوں

پہلا بند:
صدمۂ فرقت ہوش رُبا ہے — غم کا سماں آنکھوں میں بندھا ہے
رات اندھیری کالی بلا ہے — ہُو کا عالم رنج فزا ہے
درد کے مارے رو رو دینا — آفتِ جاں ہے سانس کا لینا

دوسرا بند:
لذتِ وصل اٹھانے والو — دل پر قابو پانے والو
کوچۂ یار کے جانے والو — گھر میں کسی کو بلانے والو
دل میں تمہارے اور ٹھنی ہے — کیا جانو جو ہم پہ بنی ہے

تیسرا بند:
لاکھ طرح سے دل بہلایا — چین کسی عنوان نہ آیا
سب کو اٹھایا سب کو جگایا — کوئی ہمدم ہائے نہ پایا
ایک شمع تھی جو حالِ شہ پر — آٹھ آٹھ آنسو روتی شب بھر

مولانا شبلی نے اقلیم نثر کی فرماں روائی مدتوں کی ہے۔ ان کی ایک مثنوی شروع زمانہ کی ہے، سرسید اور ان کی تحریک علیگڈھ کی شان میں، نام صبح امید، اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل، درد و اثر دونوں کا مجموعہ۔ شروع میں اولین دورِ امت کی رزم و بزم دونوں کی عکاسی ہے

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
ہیئت میں بلند پایہ اس کا — تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں ہوئی یہ گرم جولاں — تھا سے تھے رکاب مصر و یوناں

اس کمال کے بعد زوال، اور پھر اس زوال کا کمال، اور اس کے بعد یکایک سرسید کا ظہور ہے

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکیں — آیا نظر اک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرہ پہ فروغ صبحگاہی
وہ ریشِ دراز کی سفیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم

مثنوی کا رنگ ملاحظہ میں آچکا، اب ایک آدھ شعر غزل کا ہو جائے۔ پہلے ایک چھوٹی سی بحر میں ہے

تڑپنے کو ہمارے عرصۂ حشر — بھلا ہوتا ہے کیا اتنی زمیں سے

پھر ایک دوسری زمین میں ہے

پاسِ ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر — میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا

اور ایک تیسری غزل کا شعر ؂

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے　　تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

مولانا شبلی کے نام سے قدرتاً ذہن ان کے نامور شاگرد و جانشین، مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی کی طرف منتقل ہوتا ہے ایک زمانہ میں غزلیں خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کا تخلص رمزی آج تک ایک رمز بنا ہوا ہے۔ نوحے بھی متعدد لکھے ہیں مثلاً نوحۂ استاد یعنی مولانا شبلی کا مرثیہ، نوحۂ یار یعنی اپنی رفیقۂ حیات کا مرثیہ۔ غزل کے رنگ کا اندازہ ان نمونوں سے فرمالیجئے ؂

جس کو سمجھے ہیں تن زندہ کوئی لاش نہ ہو　　قید ہستی بھی کسی جرم کی پاداش نہ ہو

آئینہ خانہ میں دیوانہ بنا رکھا ہے　　اور یہ حکم کوئی شیشہ کہیں پاش نہ ہو

میری دزدیدہ نگاہی تری ترچھی چتون　　غیر ممکن ہے کہ یہ راز کہیں فاش نہ ہو

ایک دوسری غزل شیفتہ دجوہر کی زمین میں ؂

تشہیر کا باعث نہ ہو داماں قبا دیکھ　　لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہدا دیکھ

یہ عالم امکاں ہے تماشا گہ قدرت　　جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دست قضا دیکھ

آزاد مکاں سے ہے اسے قید مکاں کیا　　گر آنکھ ہو بت خانہ میں بھی نور خدا دیکھ

تصوف کا رنگ ان عاشقانہ غزلوں میں بھی ہے لیکن اخیر عمر میں تو یہی رنگ تمام تر چھا گیا تھا اور اس دور میں غزل کے جو سینکڑوں شعر کہہ ڈالے وہ تصوف و معرفت کے مضامین سے لبریز ہیں اور ایک صوفی صافی ہی کے قلب سے نکل سکتے تھے۔ انہی کے ایک معاصر مشہور اخبار نویس اور صحافی سید جالب دہلوی تھے۔ نام نے تخلص کے پیچھے گم کر دیا۔ داغ کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کی فرصت بہت کم ملتی۔ ایک غزل استاد کی زمین میں کہی ہوئی خوب چلی۔ عجب نہیں کہ مطلع آپ تک پہنچ چکا ہو ؂

زمانہ ترا مبتلا ہو رہا ہے　　تجھے بھی خبر ہے کہ کیا ہو رہا ہے

اسی کا مقطع ہے ؂

چلو چل کے جالب کو بھی آزمائیں　　سنا ہے کہ وہ پارسا ہو رہا ہے

اخبار نویسوں میں جالب سے بھی نمایاں تر شخصیت ظفر علی خان کی رہی ہے اور جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف، مترجم، قومی لیڈر سب ہی کچھ تھے۔ شاعری میں مولانا شبلی اور سید جالب کی طرح داغ سے فیض پائے ہوئے اور ان کی صحبتیں اٹھائے ہوئے۔ نعت گوئی میں ان کا ایک خاص مقام ہے اور سیاسی نظمیں بھی بڑی کثرت سے کہی ہیں۔ برجستہ گوئی اور فی البدیہہ کہنے میں حضرت اکبر کی ٹکر کے تھے۔ ایک نیم سیاسی، نیم ظریفانہ نظم، اپنے ایک مشہور معاصر پر، غزل کی ڈھنگ اور غزل کی آہنگ میں کہی ہے۔ ان کی خصوصیات کی جھلک اسی ایک آئینہ میں نظر آجائیگی۔ ملاحظہ ہو ؂

صوفی بھی ہیں رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی　　اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

سرگرمیاں سب ان کی ہیں مذہب کے نام پر　　جن میں کہیں کہیں ہے سیاست کا رنگ بھی

وہ کامیاب اگر ہیں تو اس کا یہ بھید ہے　　دنیا کے ساتھ اڑاتے ہیں دیں کا پتنگ بھی

دلبستگی ہے گرانہیں ساز مجاز سے　　بجتا ہے ان کے گھر میں طریقت کا چنگ بھی

کرتے ہیں میٹھی باتوں سے پتھر دلوں کو موم　　　　کافر کے گھر لگاتے ہیں جا کر سرنگ بھی
علیہ رقم کیا تو پکاری سلوچنا　　　　ترکش میں خواجہ کے ہیں ادب کے خدنگ بھی

مولانا محمد علی کا نام کس نے نہ سنا ہوگا! ایک وقت میں سارے ملک کے لیڈروں کی صف اوّل میں تھے اور مسلمانوں کے لئے تو امیر المومنین کے درجہ پر تھے۔ شعر کے دفتر اور غزل کے دیوان میں یہ جوہر کے نام سے جانے پہچانے ہوئے ہیں۔ باہر رہتے تو سیاسیات کی نثر نگاری بھلا فکرِ سخن کا موقع کہاں دیتی۔ جب جیل جاتے تو ان کی شاعری کے جوہر کھلتے۔ کوئی ۳۰ غزلیں تو اکیلی ردیف "ی" میں ہیں۔ عاشقانہ کسک اور شاعرانہ شوخی کے ساتھ سیاسی چاشنی بھی کلام میں رچی ہوئی، نعتیہ رنگ اور توحید و معرفت کا مذاق سب پر غالب۔ چنے ہوئے اور سختی سے انتخاب کئے ہوئے شعر بھی اگر سنانے پر آؤں تو ایک کیا معنی کئی کئی محفلیں بھی اپنے رقبۂ وقت کی ناکافی ثابت ہوں تو مصلحت اسی میں ہے کہ جوہر کی بالکل آخری اور ناتمام غزل کے ایک آدھ شعر پر یہ صحبت برخاست اور یہ تذکرہ تمام ہو جانے دیجئے ؎

جو مجھے درد آشنا کر دے　　　　اے خدا نالہ وہ عطا کر دے
اب بھی اتنا اثر ہے نالہ میں　　　　حشر میں حشر اک بپا کر دے
اب تو لے دے کے یہ تمنّا ہے　　　　میرے حق میں کوئی دعا کر دے

کس غضب کا درد و تاثر اس آخری شعر میں کوٹ کر بھر رہا ہے!

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

اُردو شاعری پر مغربی اثرات

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

یورپ کی تہذیب اور خیالات کا اثر ہندوستانی ادب پر اسی وقت سے پڑنا شروع ہو چکا تھا جب وہاں کی قومیں پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے لگی تھیں اور یہاں کی سیاست میں رفتہ رفتہ دخیل انداز ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور ادب بھی ان اجنبی قوموں کے خیالات اور الفاظ سے سترھویں صدی عیسوی کے اوائل سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ ان کی زبانوں کے متعدد الفاظ مثلاً میز، لالٹین، کپتان، پلٹن، کمندان وغیرہ اسی زمانہ میں اردو زبان میں رائج ہو گئے تھے۔ لیکن اس صدی کے آخر میں جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اردو نثر کی کتابوں کے ترجمے کا کام انگریزوں کی نگرانی میں باضابطہ طور پر شروع ہوا تو اردو کے ادیب اور شاعر انگریز عالموں اور ادیبوں کے خیالات اور رجحانات سے ذاتی طور پر پہلی دفعہ واقف ہوئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دورِ حکومت میں اردو کے شاعروں نے انگریزوں سے براہِ راست متاثر ہونا شروع کیا۔ یوں تو اس سے قبل کے یعنی آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کے مشہور اساتذۂ سخن انشا اور مصحفی نے انگریزی الفاظ کا اردو اشعار میں استعمال شروع کر دیا تھا اور ان کے کلام میں پوڈر، گلاس، بوتل، کوچ، ارگن، اپیل، کورٹ، رپورٹ، گورنر اور کلکٹر جیسے الفاظ پہلی دفعہ نظر سے گذرتے ہیں۔

مصحفی نے ایک قصیدے کے اکثر قافیے انگریزی ہی میں لکھے ہیں۔ ان کے اس قصیدے کے دو شعر یہ ہیں ؎

صاحبِ حکم و جلالت ہے تو ہر شام و سحر — آکے تریخ ترے سامنے لوٹے ہے رپٹ
سارے عالم میں ترا حکم ہے دائر سائر — کیوں نہ حاضر رہیں در پر ہی اپیل اور کورٹ

انشا نے جارج سوم کی تہنیتِ جشن میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں انگریزی معاشرت کی جھلکیں اور متعدد انگریزی الفاظ نمایاں ہیں۔

اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں ؎

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر — کرسیٔ ناز پہ جلوے کے دکھاوے گا پھبن
پینے ہل ہل کے بجاویں گے فرنگی طنبور — لالہ لا دے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا — حاضری کھاتے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن!

بہ ظاہر ہے کہ ان معمولات اور الفاظ کو ان کے مضرات سمجھے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان شعرا نے ان کے پیچھے جو تمدن اور کلچر تھا

اس کو اس عرصہ میں اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اسی لئے وہ بے تکلف ان لفظوں کو اپنے اشعار میں نگینوں کی طرح جڑ رہے تھے۔

یہ رجحان جو انشا اور مصحفی کے کلام میں نظر آتا ہے پورے ہندوستان کے اردو شاعروں کو متأثر کر رہا تھا۔ چنانچہ مدراس اور حیدر آباد کے قدیم شاعروں کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ان مقامات کے شاعروں نے اس کثرت اور شدت سے انگریزی اور دیگر فرنگی الفاظ استعمال نہیں کئے۔ یہی حال دلّی کے شاعروں کا بھی تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد تک اہلِ دہلی انگریزی سیاست اور تمدن سے کافی روشناس ہو چکے تھے اور یہ اثر ان کی علمی و ادبی تحریروں اور شعر و سخن میں بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے کلام بھی اس سے محروم نہ رہے۔ بادشاہ کے چہیتے شاہزادے مرزا جواں بخت کی شادی کے سہرے کا وہ شعر تو سبھی جانتے ہیں جس میں انگریزی لفظ "نمبر" کو اردو بنا کر "لمبر" بطور قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب انگریزی تہذیب اور تدبّر سے اتنے متأثر تھے کہ جب سر سیّد احمد خاں نے آئین اکبری کا اردو میں ترجمہ کیا اور مرزا غالب سے تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے بلا جھجک لکھ دیا کہ یہ کام سر سیّد احمد خاں جیسے مدبّر اور حقیقت شناس کے شایانِ شان نہ تھا۔ جبکہ وہ جانتے ہیں کہ انگریزوں کے اعلےٰ آئین و قوانین کے مقابلے میں آئینِ اکبری ایک تقویم پارینہ بن چکی ہے وغیرہ۔ یہ تقریظ سر سیّد کو پسند نہ آئی اور انہوں نے اس کو کتاب کے ساتھ شائع نہ ہونے دیا۔

اُردو شاعری پر براہِ راست انگریزی کا اثر اس وقت سے پڑنے لگا جب لاہور میں انجمن پنجاب کے نام سے ایک علمی انجمن قائم ہوئی اور کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات ممالک شمالی و مغربی نے محمد حسین آزاد کو تیار کیا کہ انگریزی نظموں کی طرز پر اُردو میں بھی نظمیں لکھی جائیں اور اس بارے میں اُردو کے دوسرے شاعروں کو بھی توجہ دلائی جائے۔ چنانچہ آزاد کے ایک شاگرد غلام حیدر نثار نے اس واقعہ کی تاریخ اور سنہ اس طرح اپنے ایک مضمون میں محفوظ کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "۸ مئی ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں عمدہ
> یادگار سمجھا جائے گا۔"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں کہ :

> "آزاد نے اس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک
> مثنوی میں دکھائی۔ جلسہ ہوا اور نثر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔"

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے تحریک کے آغاز کا سنہ اس سے سات سال قبل ۱۸۶۷ء لکھا ہے۔ بہرحال ۱۸۶۷ء ہو یا ۱۸۷۴ء اتنا مفروضہ ہے کہ مضامین اور خیالات کے لحاظ سے اردو شاعری نے اسی زمانے میں انگریزی کی تقلید شروع کی تھی اور انگریزی نظموں کا پہلا ترجمہ بھی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اسی زمانے میں کیا تھا اور آزاد نے اُردو میں انگریزی طرز کی ریڈریں بھی اسی وقت لکھی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ریڈروں نے اُردو کی تعلیم اور اس کو مقبولِ عوام بنانے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔

انجمن پنجاب لاہور کی سرپرستی میں جو مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے ان کا اصول محمد حسین آزاد نے یہ قائم کیا تھا کہ طرح مقرر کرنے کی جگہ نظم کے لئے موضوع کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ ہر مشاعرے کے لئے موضوعوں کا اعلان ہونے لگا اور یہ مشاعرے اُردو شعر و سخن کا رنگ بدلنے کا باعث ثابت ہوئے اور اس میں دلچسپی لینے اور اس نصب العین سے ہمدردی رکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی جن میں مولانا حالی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جو ملازمت کے سلسلے میں اس وقت لاہور ہی میں قیام پذیر تھے۔ آزاد نے نہ صرف انگریزی طرز کی نظمیں لکھیں بلکہ اصلاحِ سخن کے لئے متعدد تقریریں بھی

تیار کیں اور سنائیں۔ ان کی یہ تقریریں ان کے مجموعۂ کلام موسوم بہ نظم آزاد کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

آزاد کے بعد مولوی حالی نے انگریزی شاعری کے اثر کو اردو میں عام کرنے کی طرف مسلسل توجہ کی اور قدیم طرزِ تغزل اور قدیم اصناف سخن کو چھوڑ کر فرضی حسن و عشق اور تصنع، مبالغہ اور لفظی آرائشوں سے منہ موڑ کر سادگی اور سچائی پر شاعری کی بنیاد رکھنے پر زور دیا۔ ان کی مساعی نے اردو کو فارسی شاعری کی کورانہ تقلید سے آزاد کرا دیا اور شاعروں نے سادگی اور صداقت کو اپنا شعار بنانا شروع کیا۔ حالی نے شعر سے مخاطب ہو کر جو عہد آفریں نظم لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

آزاد اور حالی کے اثر سے شبلی اور شرر نے بھی جدید مغربی طرز کی نظمیں لکھنی شروع کیں اور اسمٰعیل میرٹھی تو اس راہ پر گامزن تھے ہی بعد میں اکبر الہ آبادی بھی اس قافلہ کے ساتھ ہو گئے۔ اکبر کا عجب حال تھا۔ یوں تو وہ انگریزی تہذیب اور تمدن پر طعن اور طنز سے کبھی باز نہ آتے تھے لیکن یہ انداز فکر اور اسلوب بیان انہوں نے انگریزی شاعری ہی سے سیکھا تھا اور اپنے کلام میں اکثر انگریزی الفاظ اور قافیے استعمال کر کے شاعری اور زبان کا لطف دوبالا کرتے تھے۔ ان چند شعروں سے ان کے اسلوب و رجحان کا اندازہ ہو گا ؎

محلّے میں نہ کی جب شیخ کی عزت عزیزوں نے — تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا
اسیرِ دام زلف پالیسی مدت سے بندہ ہے — فصاحت نذرِ لکچر ہے ریاست نذرِ چندہ ہے

قدیم دور اور طرزِ سخن کے ایک شاعر نظم طباطبائی نے قدیم طرزِ سخن سے ہٹنے کا ثبوت اپنے تخلص نظم ہی سے دیا تھا اور انہوں نے اپنی درس گاہ نظام کالج کے پرنسپل اسٹورج کی فرمائش پر مشہور انگریز شاعر گرے کی ایلیجی کا اردو میں بڑا کامیاب ترجمہ کیا تھا۔ اس کے دو انگریزی بند اور منظوم اردو ترجمہ یہ ہے ؎

The curfew tolls the knell of Parting day,
The lowing herd wind slowly over the lea,
The Plowman homeward plods his weary way,
And leaves the world to darkness and to me.

وداعِ روزِ روشن ہے گجرِ شامِ غریباں کا — چراگاہوں میں پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا — یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

Full many a gem of purest ray serene,
The dark Unfathomed caves of Ocean bear
Full many a flower is born to blush unseen
And waste its sweetness on the desert air

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے — کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی

ہزاروں پھول پشت ور ہیں ایسے بھی کھلے ہوں گے   کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک داذر کی

نظم طباطبائی کے اس ترجمہ نے تمام اردو دنیا میں شاعروں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ انگریزی شاعری کا اردو میں کامیاب ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا ترجمہ جو بجائے خود ایک تخلیق سمجھا جا سکے اور اس کے بعد ہر جگہ انگریزی کے ترجمے شروع ہو گئے۔

مغربی اثرات کو اردو شاعری میں پیوست کرنے میں اردو کے ان شعراء نے بھی غیر ارادی طور پر حصہ لیا جو یورپین النسل تھے ان میں انگریز بھی تھے اور ارمنی بھی۔ فرانسیسی بھی تھے اور ولندیزی بھی۔ ان سے متعلق ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ایک ضخیم کتاب یوروپین اور اینگلو انڈین شعرائے اردو مرتب کر کے شائع کی ہے۔ چونکہ ان کی طرز معاشرت اور تخیل مغربی تھا اور مطالعہ بھی زیادہ تر مغربی ادب کا کرتے تھے اس لئے ان کے اردو کلام میں مغربی اثر کا آنا ضروری تھا اگرچہ بظاہر ان کے اور دوسرے شعراء کے اردو کے کلام میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔

ہندوستانی شعرا میں برج نرائن چکبست، وحید الدین سلیم، عبد الرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ خان ایسے ادیب اور مفکر تھے جنہوں نے اردو شاعری کو یورپی شاعری کے ہم پلہ قرار دینے کی خاطر ایسی نظمیں لکھیں جو اس زبان کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کا باعث ثابت ہوئیں۔ اس سلسلہ میں اقبال کا نام بھی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں قیام یورپ کے بعد ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا اور اگرچہ بعد کو وہ مغربی تہذیب سے مایوس اور مغربی اثرات کے خلاف ہو گئے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کے اثرات ہی کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے شاعر اور مفکر بنے اور اپنی ردّ عمل کی کوششوں کے باعث شاعرِ مشرق کے لقب کے مستحق قرار پاتے۔ انہوں نے مولانائے روم سے جتنا اثر قبول کیا اتنا ہی اثر مغرب کے مفکروں شوپنہار، نطشے، گوئٹے، کارل مارکس، برگساں اور کانٹ سے بھی لیا اور ان کا پورا کلام انہی کے اثرات اور ان کے ردّ عمل سے معمور ہے۔

کارل مارکس اور لینن کے نظریات نے اقبال کے بعد کی اردو شاعری پر اور زیادہ اثر ڈالا۔ جوش، فراق، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، فیض، مخدوم اور مجاز نے انقلابی اور ترقی پسند شاعری کا نیو انہی نظریات اور رجحانات پر رکھا اور عہدِ حاضر کے اکثر اردو شعرا انہی سے متاثر ہیں چنانچہ ایک عرصہ سے اردو شاعری زندگی کی نئی قدروں اور ضرورتوں کی ترجمانی کرتی آ رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اردو غزل قدیم اندازِ سخن کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی۔ نظم طباطبائی اور جوش کے ساتھ متعدد شاعروں نے غزل گوئی پر نظم گوئی کو ترجیح دی تھی اور جوش تو اب بھی اسی خیال پر جمے ہوئے ہیں لیکن اب ترقی پسند شعرا بھی غزل کو اپنے خیالات اور افکار کا آلۂ کار بنا رہے ہیں اس طرح غزل کی تاریخ میں جہاں آزاد اور حالی نے انگریزی سے متاثر ہو کر ایک نیا دور شروع کیا تھا اب ترقی پسند شاعروں کے ہاتھوں غزل شاید اس سے بھی زیادہ عالیشان منزل کی طرف آگے بڑھ سکے۔

مرزا رسوا کی تنقید نگاری

ڈاکٹر محمد حسن

اردو میں ادب کی ماہیت اور اس کی فلسفیانہ توجیہہ کی طرف بہت کم نقادوں نے توجہ کی ہے۔ عام طور پر ادب کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اس مطالعے میں بھی اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اس کے رشتے ادبی روایت سے ملائے جائیں۔ اس عام میلان کے پیش نظر ایک ایسے ادیب کے تنقیدی مراسلے چونکا دینے کی حد تک جدید ہیں جس کی ساری شہرت ناول نگاری کی بنا پر قائم ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کو ادبی دنیا "امراؤ جان ادا" کے مصنف کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ درحقیقت بڑی جامع صفات کے انسان تھے فلسفہ، ہیئت، علم نجوم، ریاضی، سائنس، الٰہیات اور اخلاق سبھی پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

اس مختصر مقالے میں ان کے چند تنقیدی مراسلات کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ اس قسم کے تین مراسلات اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ یہ مراسلہ کے عنوان سے رسالہ "معیار" لکھنؤ کے مختلف پرچوں میں شائع ہوتے تھے اور انہیں بہت عرصے بعد مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع کیا تھا۔

مرزا رسوا نے شعر و شاعری کے مسائل کو دوسرے تمام علوم سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ پہلے مراسلے کے پہلے پیراگراف میں اپنے مقصد کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ منشا ہوگا کہ علم شعر کی ان خوبیوں کو جنہیں اردو زبان کی شاعری ڈھونڈھ رہی ہے حتی الوسع بیان کر دوں مگر سخت مشکل یہ ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لئے جنہیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں، بعض مسائل علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل اردو میں نہیں ہے۔ شیخ بوعلی سینا کا ایک رسالہ زبان فارسی میں میرے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدیدہ کے موافق بعض حواشی تعلیقات اس پر زیادہ کر دئے تھے وہ گم ہو گیا۔"

شعر کے بارے میں ایک واضح اور صاف بیان دوسرے مراسلے کی ابتدا میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا کی فکر پر اخلاق اور الٰہیات کا اثر غالب تھا اور اسی کے پیش نظر انہوں نے مضامین کو "اتفاقی اور الہامی" قرار دیا ہے اور اخلاق سے ان کا بلاواسطہ ربط ملحوظ رکھا ہے۔

"مذہبیات اور جنسیات سے قطع نظر کر کے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لئے مفید ہیں اور بعض مضر مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں وہ قسم حسن میں داخل ہیں اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں۔

> لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معرّیٰ ہیں نہ ان میں کوئی حسن ہے نہ قبح ...... ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔"

شاعری کا ملکہ اکثر خداداد قرار دیا گیا ہے۔ حالیؔ تک نے اسے اکتسابی سے زیادہ وہبی بتایا ہے۔ مرزا رسواؔ نے اس بارے میں بھی ایک دلچسپ بات کہی ہے۔ مضامین کو "اتفاقی اور الہامی" مانتے ہوئے اور موزونیت کو خداداد صلاحیت تسلیم کرنے پر بھی وہ اس بات کے قائل ہیں کہ موزونیت کی اوسط استعداد عام طور پر سارے انسانوں میں پائی جاتی ہے:

> "فطرت نے ہر انسان کو اواسط استعدادات عطا کیے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات و عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ حدِ خاص سے زیادہ خوبصورت اور حدِ خاص سے زیادہ بدصورت بمشکل مل سکتے ہیں ..... اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے لہٰذا اوسط درجہ کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں۔"

اردو تنقید میں مذاقِ سلیم کی ایک منطقی بنیاد قائم کرنے کی یہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ مرزا رسواؔ نے اس کی توجیہہ میں ملکی اور عصری اثرات کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور جہاں فطرت کے خداداد عطیے موزونیت کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ:

> "..... ملک، مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے۔"

مذاقِ سلیم کی ماہیت، اس کے نشوونما اور تاریخی ارتقا پر مرزا رسواؔ نے تفصیلی بحث نہیں کی ہے لیکن اوسط درجے کی موزونیت کو قومی مزاج کی خصوصیت قرار دے کر گویا انھوں نے شاعر کو غیر معمولی طور پر اور خداداد موزوں طبع قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور قوم کے مزاج کا آئینہ دار بتایا ہے۔ اس طرح شاعر اور غیر شاعر میں مرزا رسواؔ کے نزدیک بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں موزوں طبع ہوتے ہیں۔ ہاں ایک کی موزوں طبعی اوسط درجہ کی ہوتی ہے اور دوسرے کی زیادہ ترقی یافتہ۔

موزوں طبعی کی اس ترقی یافتہ شکل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ مرزا رسواؔ نے اسے "ابتدا کی درستی" قرار دیا ہے اور اس نہج سے ان کا نظریہ قدیم استادی و شاگردی کے ادارے تک پہنچ سکتا ہے۔ موسیقی کی مثال پیش کر کے کہتے ہیں:

> "اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتدا خراب ہو کر درستی کے قابل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل استاد سے موسیقی حاصل نہیں کرتے اور ابتدا ہی میں سر بہ ہو رہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو بد آواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہر مبتدی کو اپنی ابتدا کی درستی کا خیال نہایت ضروری ہے۔ اگر طبیعت ابتدا ہی میں خراب ہو گئی تو استاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔"

مرزا نے خلافِ توقع اس کی مثال لکھنؤ کے عام طرزِ شاعری سے دی ہے اور اس بے روح صنعت گری سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے جو لکھنؤ میں شاعری کی بنیاد سمجھی جانے لگی تھی:

> "مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعرا اور ان کے تلامذہ کو مناسبات الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک

صفتِ شعری ہے اور محسناتِ کلام میں داخل ہے مگر اب سلیقۂ شعر اس کو عیب شعر میں شمار کرنے لگا ہے
اور اس بدعادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہوگیا ہے کہ اب اس کا ترک من قبیلِ محالات سمجھا جاتا ہے
اس طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے استاد نے کسی موقع پر نظم کردی تھیں ان کی اب اس کثرت سے جھاڑ
کی گئی ہے کہ سننے والوں کو ان سے نفرت ہوگئی ہے۔"

اس بحث کو مرزا نے ایک دوسرے موضوع سے وابستہ کردیا ہے انہوں نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ تشبیہہ اور استعارہ کے استعمال میں روایت اور تجربہ کا حصہ کیا ہونا چاہئے۔ آیا شاعر کو از مردہ کار تشبیہیں استعمال کرنی چاہئیں یا تجربہ اور براہِ راست مشاہدے سے نئی تشبیہوں کی تشکیل کرنی چاہئے۔ یہیں مرزا رسوا نے ایک دوسرا سوال یہ قائم کیا ہے کہ انسانی ذہن کو تشبیہہ و استعارے سے کیوں لذت حاصل ہوتی ہے:

"ان امور میں صرف قوت باعثِ لذت ہے یعنی قائل کا قول سامع کے لئے صرفِ قوت کا باعث ہوتا ہے
قوت سے یہاں قوت ذہنی مراد ہے۔ توجیہہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت کے ہیں (۱)
استعمال قوٰی بحالتِ صحت (۲) ارتفاع الم اور یہی استعمال قوٰی ایک حدِ خاص سے تجاوز کرنے کے بعد
موجب الم ہو جایا کرتا ہے ......"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"تشبیہاتِ غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوتِ فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجب لذت
ہوتا ہے۔ تشبیہہ کی ندرت ایک استعجابِ خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک تعلیت دماغی کا
نام ہے کیونکہ اس صورت میں دماغ کے ان مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے
تشبیہات قریب و مبتذل میں نہ استعمالِ قوت کا موقع ملتا ہے نہ وہ باعثِ استعجاب ہیں اس لئے ان میں
کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔"

مرزا نے اس منزل میں بھی اعتدال پر زور دیا ہے ان کے نزدیک تشبیہہ صرف اسی وقت مسرت بخش ہوسکتی ہے جب قوتِ فکر کو حدِ اعتدال سے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اگر اس کی نازک خیالی ابہام، دقتِ مضمون اور معنی بندی کے مراحل تک پہنچ جائے گی تو اس کی لذت ختم ہو جائے گی اور بجائے انبساط کے انقباض کا باعث ہوتی ہے

"بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے جن کے ہر شعر کو سمجھنے کے لئے قوتِ فکر کو
حدِ اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی ...... دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں۔ ان کی لذت
کے لئے نازک خیالیوں کی ضرورت ہے۔ نازک خیالی اور دقتِ مضمون دو امرِ جُدا گانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے
سے دوسرے کو اختیار کرلینا بڑی غلطی ہے۔"

نئی تشبیہوں کی تلاش کے لئے مرزا رسوا نے ادبیات اور مطالعۂ کائنات سے پیدا ہونے والے دوسرے تمام علوم کا ربط قائم کیا ہے اور یہ ربط محض نادر تشبیہوں کی تلاش کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ اسی ربط کی بنا پر شعر کو دوسرے تمام علوم کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے اور شعور کے اعلیٰ ترین مدارج میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ مرزا رسوا نے تقلیدی اور کتابی شاعری پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور فطرت سے جس وابستگی

کا مشورہ دیا ہے وہ ایک معنی میں حالی کی نیچرل شاعری کے تصور سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔ اردو شاعری کے عام تقلیدی لہجے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"..... جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گلدستوں میں شائع ہوتے ہیں کیا وہ "شاعری جزو یست از پیغمبری" کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ واللہ ایسا نہیں ہے اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے میری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلۂ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرت تحصیل علم کے لئے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں۔

جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے ان کو اگلے کہہ گئے اب ہماری استادی صرف اس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو ان کو اور خراب کرتے ہیں۔ ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کا مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے۔"

اس تقلیدی روش اور استعارہ در استعارہ خیال بندی پر حالی نے بھی "مقدمۂ شعر و شاعری" میں سخت تنقید کی ہے مگر اس کا حل ان کے نزدیک اخلاقی شاعری اور نیچرل مضامین کی فراہمی تھا۔ مرزا رسوا نے اس مسئلے کو پورے علمی پس منظر میں پیش کیا ہے اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کے نزدیک اخلاق کا تصور محدود نہیں تھا اور شاعری کو وہ محض جذباتی ابال نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شعور کا ایک برگزیدہ شعبہ گردانتے تھے۔ دوسرے مراسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"علم طبیعات،[1] الٰہیات[2] اور شعر[3] ——— بظاہر ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے اوّل مرتبہ پر رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعر نازک خیال انجام دے سکتا ہے۔ فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اس کو عام فہم اور موثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعری کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حقائق اور معارف کو جس پیرایے سے شاعر ادا کر سکتا ہے فلسفی کی مجال نہیں کہ اسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے پیاری پیاری صورتیں مجسم ہوتی ہیں اور صوت و حرف کے ذریعے سے سامع تک پہنچتی ہیں۔"

شاعر اور حکیم کو مرزا رسوا نے ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے بلکہ شاعر کا رتبہ حکیم اور فلسفی سے بہت کچھ زیادہ بنایا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"شاعری کی وسعت مثل وسعت عالم کے لا انتہا ہی ہے اس کی جولانگاہ فلسفہ کی حد رسائی سے کہیں آگے ہے جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے ان کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ رموز حکمت کو اس طرز دلآویز سے کہہ جاتے ہیں کہ فلسفی کو ان کے بیان کرنے کے لئے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔"

اس اعتبار سے مرزا رسوا کا نظریۂ ادب اخلاقی یا فطرت پرستانہ سے کہیں زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے جو اس زمانے کے عام چلن کے پیش نظر کافی تعجب خیز بات ہے۔ پہلے ہی مراسلے میں مرزا رسوا نے علم النفس کی عام اصطلاحوں سے بحث کی ہے اور نہ صرف ان کے

معنی اور مفہوم کو احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو تنقید شعر اور نظریۂ ادب کے سلسلے میں استعمال کیا ہے:

"..... ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں، محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوتا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوئی، احساس مراد ہے اس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی پر کسی موثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے۔"

"..... احساس کے لئے شے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آجاتی ہیں اگرچہ وہ بالفعل غائب ہوں..... یا ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اسی حاسے کی ویسی ہی محسوس کو یاد دلا دیا..... (یا) ایک حاسے کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوسات کو یاد دلا دیا۔"

اس کے بعد لزوم ذہنی کے قوانین سے بحث کرتے ہیں اور قانون مماثلت اور قانون مقارنت کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اکثر چیزیں جو باہم ایک دوسرے کے مماثل ہونے کی وجہ سے یاد آتی ہیں یا ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ مشاہدہ میں آنے کی وجہ سے یاد آجاتی ہیں، خواہ وہ مماثل ہوں یا نہ ہوں۔

پھر ہر احساس کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

"(۱) شعور محض (۲) اس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا (جسے آگے چل کر مرزا رسوا نے وجدان کہا ہے) (۳) وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو (اسے مرزا نے ارادہ سے تعبیر کیا ہے) مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا شکل ایسی اور خوشبو ایسی ہے یہ شعور محض ہے۔ دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت حاصل ہوئی یا مثلاً اس کا کانٹا چبھ جانے سے ہمیں الم ہوا یا وہ لذت اس حد تک پہنچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا چنانچہ ہم نے اسے توڑنے کا قصد کر کے اسے توڑ لیا اور کانٹے کے چبھ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لئے اس سے بچتے رہے۔"

پھر شعور کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے پہلے درجے کا نام ادراک قرار دیا ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی ہے "یعنی کسی چیز کے مجموع صفات کے احساسات سے اس چیز کو شناخت کرنا" دوسرا درجہ تعمیم کا ہے یعنی "چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا۔ صنف نوع اور جنس کا قرار دینا مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھ لیا یا ایسی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ ان کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اس لئے ان کو پھول کہتے ہیں۔"

تیسرے درجے کو استدلال بتایا ہے جو "جزئیات سے کلی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم لگانے" کا نام ہے۔ اس استدلال کے بھی مختلف نادیے ہو سکتے ہیں مثلاً "زید فانی ہے، عمر فانی ہے، بکر فانی ہے، خالد فانی ہے لہٰذا انسان فانی ہے یا مثلاً کل انسان فانی ہیں زید انسان ہے لہٰذا زید فانی ہے۔ پہلی صورت کو استقرا اور دوسری کو قیاس" قرار دیا گیا ہے جو تخیل "جو ایک قسم کے مجموع صفات کو ذہناً ایک فرد میں تجویز

کرلینے" کا نام ہے اس تمثیل کو بھی مرزا رسوا نے دو صورتوں میں تقسیم کر دیا ہے "ایک یہ کہ جو صورتیں کبھی عندالذہن حاضر تھیں ان کو پھر ذہن کے سامنے لانا" دوسری "نئی صورتیں جو عالمِ خارجی میں موجود ہی نہ ہوں ان کو ایجاد کرنا۔"

یہ تمثیل دراصل فن کی بنیاد ٹھہرتی ہے مرزا رسوا نے ایک اصطلاح کے تفصیلی تذکرے کے بعد یہ صراحت کی ہے:

"بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ تمثیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تخیل کہتے ہیں اور محاکات[1] اور اختراع[2] اس کی دو قسمیں ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تخیل ایک شرط ذہن کی ہے جس کا زور ابتدائے نشو و نما سے ہوتا ہے اور جس پہ دو قانون تذکر اور تقابل کے قائم کئے گئے جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے اور تمثیل کا نمو ترقیٔ ذہنی کا آخری درجہ ہے جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں۔"

ہمارے تنقیدی ادب میں تخیل کے لفظ کو کافی بے پروائی سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ انگلستان میں (Fancy اور Imagination کی توجیہہ و تعریف میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ اڈیسن، برک، کولرج کے مختلف تصورات نے ان دونوں الفاظ کو واضح طور پر الگ الگ کر کے پیش کیا ہے اور تخیل کو ایک ایسی تخلیقی قوت قرار دیا ہے جو صرف عالمِ خارجی میں موجود اشیا یا پہلے حاصل کئے ہوئے مشاہدات کی مرہونِ منت نہیں بلکہ خود اپنی کائنات کی تخلیق کر سکتی ہے۔ ہمارے ادب میں غالباً مرزا رسوا پہلے تنقید نگار ہیں جنہوں نے تخیل اور تمثیل کے اس فرق کو نمایاں کیا ہے اور اس طرح اس کی فلسفیانہ توجیہہ کی ہے۔ آگے چل کر محاکات اور تمثیل کے فرق کو بیان کرتے ہیں:

"اگر تمثیل کے اور اس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ استعمال کر کے ہم شاعرانہ تمثیل، شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جبکہ وہ چیزیں جو کبھی عندالذہن حاضر تھیں ان کی صورتیں جو خزانۂ حفظ میں موجود ہیں پھر ذہن کے سامنے آجائیں اس کو استرجاع کہتے ہیں [جس کو ورڈز ورتھ نے Emotion recollected in Tranquillity) کہا ہے۔ م۔ ح] اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باعتبار ان کے مدت تک ذہن کے سامنے حاضر رہنے کے استحضار کہتے ہیں اور یہ بھی یا ارادی یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لئے انتخاب کا سلیقہ چاہئے تاکہ الفاظ کے ذریعے سے ان کا بیان کیا جائے تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔"

یہاں قبض اور بسط کی تشریح طلب اصطلاحات کو بھی مرزا نے واضح کیا ہے قبض ان کے نزدیک وہ حالتِ وجدانی ہے جو الم کے مشابہ ہے اور مضر اثرات سے دور رہنے یا ان کو دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے جس طرح آنکھ میں کوئی ذرہ پڑنے کا خطرہ ہو تو یکایک پلک جھپک جاتی ہے اسی طرح قبض کی حالت میں انسان اپنے کو ناخوشگوار صورتِ حال سے محفوظ کر لیتا ہے اور نفسیاتی طور پر پیش بندی کر لیتا ہے۔ بسط ان کے نزدیک لذت یابی کی حالت ہے اور لذات سے متمتع ہونے کے شوق کا باعث ہوتی ہے۔ محاکات، تمثیل اور تخیل کے اس نازک فرق کو سمجھنے اور بیان کرنے سے مرزا رسوا کے تنقیدی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"محاکات محض واقعہ نویسی یا مورخ کے لئے زیادہ مفید ہے نہ کہ شاعر کے لئے اختراع صرف شاعر کا حصہ ہے۔"

تمثیل کو مرزا نے شعور، وجدان اور ارادہ کے اعتبار سے تین حیثیتوں سے پیش کیا ہے۔ (۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فردِ واحد میں پیش کرتی ہے تو اس سے ایک مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔ اس طرح مرزا رسوا نے حسن، افادیت اور حقیقت تینوں اجزا کو ایک وحدت میں پرونے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ تقریباً افلاطونی تصور تک پہنچتے ہیں جس نے مغرب اور مشرق میں تنقیدِ جمال کے سارے نظریات کو متاثر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"وہ ذاتِ مقدس جس میں یہ صفاتِ کمالیہ پائے جاتے ہیں۔ حق الحق[1]، جمیل لذاتہ[2]، خیر مطلق[3] اور غایت الغایات[4] ہے مثالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفۃ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم ذوقیات کا ہے۔ خیر موضوع علم اخلاق کا اور تصور باری تعالیٰ عز اسمہٗ موضوع الہیات کا ہے حقیقت نفس الامری سے وہ امر مراد ہے جس کی موجودگی کو عقل خارج میں تجویز کرتی ہے نہ صرف ذہن میں بخلاف امر ذہنی کے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے۔"

یہیں مرزا رسوا کے تصورِ جمال کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے۔ کانٹ نے جمالیات کی بنیاد purposiveness without purpose یعنی بغیر (ضروری) افادیت کے کسی شے میں مقصد کے پائے جانے کو قرار دیا تھا اس پہلو کو مرزا نے بھی ملحوظ رکھا ہے:

"جمیل سے مرغوب لذاتہ مقصود ہے نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جس کے حصول کا وہ واسطہ ٹھہرے بلکہ اس کا حصول عین مراد ہے۔"

یعنی بنیادی طور پر حسن اپنا مقصد آپ ہے وہ کسی دوسرے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے دوسرے مقاصد بھی حاصل ہوتے ہوں لیکن وہ ضمنی اور ثانوی ہوں گے اصلی اور بنیادی نہ ہوں گے بقول مرزا رسوا:

"ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے اس حد میں داخل نہیں مرغوب لذاتہ کی ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لئے کہ اس سے ان کی کوئی غرض شخصی نوعی نہیں ہوا کرتی یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا ہے جس سے بت تراشی، مصوری، طراحی، موسیقی، شعر ایسے ایسے فنونِ لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بوڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کر لی ہیں جو نہ حقیقت میں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے۔"

کھیل اور فن میں فلسفیانہ مماثلت کا تصور یورپ میں شلر کی تصانیف کے بعد عام ہوا ہے۔ ہمارے تنقیدی ادب میں اس تصور کو انصاف اور پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش بھی نہیں کیا گیا۔ گو حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے پہلے یا دوسرے صفحے پر اس شخص کو بھی سماجی طور پر مفید بتایا ہے جو ایک ویران پہاڑی پر بیٹھا اپنی دھن میں مست ہو کر بانسری بجا رہا ہے لیکن بعد میں خود وہ بھی افادیت اور اخلاق کی پابندی میں بری طرح گھر کر رہ گئے۔ مرزا رسوا کا تصور ان سے ذرا مختلف ہے گو وہ بھی اخلاق اور فطرت پرستی کے قائل ہیں ان کا دائرہ زیادہ وسیع اور فلسفیانہ طور پر زیادہ مابعد الطبیعاتی ہے۔ جمالیات کے سلسلے میں مرزا نے صاف طور پر لکھا ہے:

"فنونِ لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو نافعہ کہنا چاہیئے مثلاً فن مکانات (کلیں بنانے کا فن) کے ذریعے سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور نوعی کے لئے مفید ہیں"

لیکن یہ تضاد مرزا کے نزدیک مکمل اور قطعی نہیں ہے جمالیات اور افادیت میں کوئی ایسا بیر نہیں ہے کہ دونوں ایک شے میں جمع نہ ہو سکیں۔ ہاں یہ مسئلہ ضرور قابلِ غور ہے کہ ادبیات میں کس کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گی اور کس کو ثانوی۔ حسن اور افادیت یکجا ہو سکتے ہیں اور ان کو یکجا کرنا ہی فن کی سب سے بڑی منزل ہے :

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمال اور نفع دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہو جاتی ہیں مثلاً ایک خوبصورت جیبی گھڑی ایسی چیزیں عند الذوق نیز عند العقل مستحسن ہیں"

"ہر صاحب فن کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ اس کی ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے ہر ایک صاحب فن کو اپنے خاص فن کی مراعات لازم ہے اگر اس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہو المراد۔ مثلاً شاعر کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا شعر اصول سے درست ہو اس میں کوئی ذاتی خوبی ہو پھر اگر اس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے تو سبحان اللہ ورنہ نصیحت گری کو ناصح مشفق کے حوالے کرے اور خود بزم شعرا میں اپنی عزت بچانے کے لئے شعر عمدہ کہے۔"

اس کے بعد مرزا نے فنونِ لطیفہ کی تقسیم ان کے ذرائع اظہار کے اعتبار سے کی ہے۔ بت تراشی، طراحی اور مصوری کو پہلی قسم میں شمار کیا ہے کہ ان کا تعلق دیکھنے سے ہے اور ان میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں موسیقی کو گنا ہے جس کا تعلق حسِ سمع سے ہے اور لے آواز اور سُر سے کام لیا جاتا ہے تیسری قسم فنونِ ادبیہ کی قرار دی ہے جس کا تعلق نہ دیکھنے سے ہے نہ سننے سے بلکہ تخیل سے ہے اور جس کے اظہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ مرزا نے فنونِ ادبیہ کے لئے شعر کی اصطلاح استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اسے کلامِ منظوم کے لئے بولتے ہیں لہٰذا خوفِ التباس سے شعر کی بجائے فنونِ ادبیہ کی ہمہ گیر اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک شعر کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے شعور اور وجدان کو متاثر کرے اور قبض و بسط کا موجب ہو۔

بنیادی طور پر مرزا کا تصورِ فن اخلاقی سے زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ وہ قبض و بسط کو ایسی ذہنی کیفیات کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن سے غلط اور اخلاقی طور پر برے کاموں سے احتراز کا مادہ پیدا ہو اور زندگی کی صحیح نعمتوں سے لذت یابی کی صلاحیت حاصل ہو۔ اس لحاظ سے ادب ان کے نزدیک ترجیحات (Preferences) کا ایک موزوں اور مناسب سلسلہ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ انسان میں قدروں کی ایک ایسی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش ہے جو اچھی چیزوں کی طرف راغب کرے اور بری باتوں سے روکے اور یہ کوشش بنیادی طور پر خارجی سے زیادہ نفسیاتی اور داخلی ہی ہو سکتی ہے۔

شعر کی یہ بنیادی تعریف کرنے کے بعد وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فنونِ ادبیہ میں ضمناً اور "اغراض عمدہ" بھی شامل ہیں مثلاً "حکایت، توجیہہ، استدلال، موعظت۔ اس صورت میں چاہیئے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی لیاقت اور سلیقہ کو صرف کرے جس سے اس کی تصنیف ان دونوں غرضوں کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہو"۔ اس کی مثال انہوں نے تاریخ اور سائنس سے دی ہے اور بتایا ہے کہ فنونِ ادبیہ میں جو قوتِ اظہار سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے علوم میں بھی کام دیتی ہے۔

"اگر کوئی مورخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخیل میں ہوبہو تصویریں کھنچ جاتیں یا کوئی حکیم کسی قانونِ فطرت کی توجیہہ اس صورت سے کرے کہ ہر جزئی میں ہمیں اس کے آثار نظر آجاتیں تو کہا جائے گا کہ وہ بیان اور توجیہہ دونوں غرضوں (یعنی غرضِ علمی اور غرضِ شعری) کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہے وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کئے جاتے ہیں مثلاً ریاضی اور منطق ان کے بیان میں بھی اگر سلیقۂ شعری سے کام لیں تو سامع اور ناظر اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ غرضِ علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے ایک قسم کی مدد بھی ملتی ہے۔"

یہاں سلیقۂ شعری کو اظہار بیان کا جوہر قرار دیا گیا ہے اور اس سلیقۂ شعری میں تخیل کے مناسب استعمال اور الفاظ کے ذریعے کسی واقعہ کی تصویر کھینچ دینے کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے لیکن مرزا نے ادبیات میں محاکات کے استعمال کو دوسرے فنونِ لطیفہ کی محاکات سے ممتاز کیا ہے۔ وہ شاعری اور مصوری کے فرق کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کے ذرائع اظہار کے فرق کو بھی:

"فنونِ ادبیہ جملہ احساسات بلکہ جمیع وجدانیات و عقلیات کے استعمال پر بشرطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ خوش آئند سُر کانوں تک پہنچا سکتا ہے لیکن وہ الفاظ کے ذریعے سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک رُخ سے بلکہ مختلف رُخوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ نرپائدار ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی کا مزا پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکالِ تاریخی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیا جائے گا جو اس کی غرض خاص ہے۔"

ارسطو نے تاریخ اور ادبیات کے فرق کی کافی الفاظ میں صراحت کی ہے۔ مرزا نے اس فرق کو ایک اور پہلو یعنی محاکات کے استعمال کو پیش کیا ہے اور جس طرح دونوں محاکات کو مختلف طریقے پر اور مختلف انداز سے استعمال کرتے ہیں اس کو پیشِ نظر رکھا ہے ایک کا مقصد حقیقت کے تابع ہے دوسرے کا مقصد اختراع ہے ایک ترجمان ہے اور دوسرا خالق۔

"اگرچہ شاعر بھی واقعات کی ہوبہو تصویریں کھینچنے میں محاکات سے بہت کام لیتا ہے لیکن اس کے حسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے بخلاف مورخ کے جس کا تعلق محاکات سے ہے جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لئے کہ شاعر کی نظر اکثر مرغوب لذائذ اور جمیل کی طرف رہتی ہے لہٰذا اس کو انتخاب کرنا ہوتا ہے مثلاً جب اسے کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی ذکر کا پابند نہ رہے گا بلکہ صرف ان امور کو انتخاب کرے گا جو اس کے مطلوب کے لئے مفید ہوں۔"

یہاں اس عملی تنقید کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جو اس ضمن میں مرزا رسوا نے مختلف اردو اساتذہ کے اشعار پر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مقصد ان کے کلام پر اجمالی تبصرہ کرنا نہیں ہے اور جو اشعار انہوں نے منتخب کئے ہیں وہ صرف زیرِ بحث موضوع پر اپنے خیالات کی وضاحت کرنے کے لئے چن لئے گئے ہیں لیکن پھر بھی ان کے تنقیدی زاویۂ نظر کی غمازی عملی تنقید سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر محاکات کے ضمن میں وہ اس بات

زور دیتے ہیں کہ شعر سے جو تصور قائم ہو یا فضا تعمیر ہو وہ جمالیاتی طور پر خوشگوار اور آسودگی بخش ہو اس میں ناگواری اور کراہت کا پہلو پیدا نہ ہو۔ لہٰذا جب شاعر یا ادیب کسی واقعے یا مضمون کو بیان کرنے کے لئے اس کے نمائندہ گوشے چن لیتا ہے اور چند مخصوص زاویوں سے اس کو پیش کرنا چاہتا ہے تو اس انتخاب میں خوشگوار اور جمیل پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ایسے تمام گوشوں کو ترک کرنا چاہیئے جو بقول ان کے مضر یا غیر مفید ہیں اور بسط و قبض دونوں کے لئے معاون ثابت نہیں ہوتے اور انقباض کا باعث ہوتے ہیں۔ عملی تنقید میں وہ اس بات کو ایک کلیے کی حیثیت دے دیتے ہیں:

"ہم اس موقعہ پر ایک بہت ہی سہل قانون امور مکروہ سے احتراز کرنے کے لئے تحریر کئے دیتے ہیں اگر اسے یاد رکھیں گے تو شعر اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا وہ قانون یہ ہے۔ ہر ایک شعر کے ماحصل پر غور کر کے دریافت کریں کہ اس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے اگر اس تصویر کے اجزا یا لزومات قریبہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے تو اس کو نظری کر دینا چاہیئے۔"

اس کی مثال میں انہوں نے تین اشعار پیش کئے ہیں جن میں سے دو غالب کے ہیں اور ایک ذوق کا۔ ذوق کا مشہور شعر ہے ؎

واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

اس شعر پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ "اس سے ایک تصویر ذہنی ایسی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے یعنی انسان کی ہڈیوں کا نمکین ہونا اور ایک جانور کا اسے کھانا عمدہ تخیل نہیں ہے۔"

ایک دوسرے شاعر کا شعر انہوں نے پیش کیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تصویر ذہنی کو "بعید از قیاس، مضحک اور مکروہ" قرار دیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

شغل اگر چاہئے ہوجی کے بہلنے کے لئے ۔۔۔ دل میں آ بیٹھو کلیجہ مرا ملنے کے لئے

لکھتے ہیں:

"دل میں ایک شخص کا آ بیٹھنا اور ہاتھ بڑھا کر کلیجہ کو ملنا ایک مہمل سی بات ہے اور یہ بھی ظاہر ہے اس شعر میں مخاطب معشوقِ مجازی ہے معشوقِ حقیقی اس سے منزہ ہے کہ کسی کے دل میں بیٹھ کر اس کے کلیجہ کو مسلے۔"

غالب کے جو اشعار انہوں نے نقل کئے ہیں ان میں سے ایک فارسی کا ہے اور دوسرا اردو کا ہے۔ فارسی شعر یہ ہے ؎

داغم ز سوزِ دل نہ خجل دارم ز خلق
بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد

"ہڈیوں کے جلنے سے چراندھ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے خجل رکھتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے۔"

غالب کے اردو شعر پر بھی انہیں یہی اعتراض ہے ؎

داغِ دل گر نظر نہیں آتا ۔۔۔ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرزا کا کہنا ہے:

"داغِ دل کی بو میں چراندھ ضرور ہوگی صرف داغِ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اس کے جلنے اور اس میں سے بو کے

پیدا ہونے کا بیان مشرح کیا گیا ہے۔ اس مرقع پر ٹو کا استعمال اس امر مکروہ پر دلالت واضح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا تو اس کا جواب دیا جائیگا کہ مجاز کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے ذریعے سے ذہن نشین ہو کیونکہ مجاز میں اکثر امور عقلی کو محسوسات کے ذریعے سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں.......... اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومۂ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں درست ہیں لیکن ان کا تخیل مکروہ ہے، اس سے اس کا لطف معدوم ہو جاتا ہے۔"

پہلے مراسلے کے آخر میں موضوع اور انداز بیان کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ فلسفیوں سے لے کر ادیبوں تک ہر ایک کو زبان کی تنگی اور الفاظ کی محدود رسائی کی شکایت رہی ہے اور یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ دقت مضمون یا گہرے فلسفیانہ خیال کا اظہار سادہ صاف اور سلجھے انداز میں نہیں ہو سکتا۔ موضوع کی گہرائی اور دقت اظہار کی سلاست کو ختم کر دیتی ہے اور بیان کی مٹھاس اور روانی تصنع اور بناوٹ کی نذر ہو جاتی ہے مرزا نے اس مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا ہے:

"شعر پر نظر کرنے کے دو رخ ہیں ایک آزادیٔ لفظ، دوسرے آزادیٔ معنی۔ جس زمانے میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ نظر کی جاتی ہے تو جبرا اسی طرف مبذول ہو جاتی ہے معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے، اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو لفظی باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں ان دونوں میں نسبت عکسی ہے۔ ایک کی افراط دوسرے کی تفریط کا موجب ہوتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں ان کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چنداں لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطف زبان کے دلدادہ ہیں۔"

اسی بحث کا دوسرا پہلو مرزا نے اس طرح پیش کیا ہے:

"...... جو شاعر خلاق مضمون ہیں ان کو طرز ادائے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے اس لئے کہ ہر ایک جدید خیال کے لئے ایک جدید لفظ چاہئے ان کو زبان مروجہ میں تصرفات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں ان کا کلام موافق روزمرۂ عوام کے نہیں رہ سکتا لہٰذا اکثر اشخاص جن کی نظریں سطحی ہیں ان کو ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔"

اس کی مثال میر کے دیوان کی پہلی غزل سے دیتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

اور لکھتے ہیں:

"ذرا 'ہنگامہ گرم کن' کو دیکھئے اور اردو زبان کو، مگر لاتے کیا؟ اس مضمون کو کسی اور طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔"

لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مرزا رسوا مشکل الفاظ اور خالص "ادبی زبان" کے استعمال کے قائل تھے۔ وہ فصاحت اور سلاست کے درجے کا لحاظ رکھتے ہیں لیکن ان کے مدارج کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مثلاً غزل میں سلاست کا جو معیار ہوگا وہ قصیدے کی سلاست کا نہیں ہو سکتا۔ اس فرق کو انہوں نے اس استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے:

"غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے اس لئے کہ اس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور ان کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیئے۔"

اس بحث کا خلاصہ مرزا نے اس طرح کیا ہے کہ لفظی نزاع اور تکنیک کی باریکیوں سے نفس مضمون کو نقصان پہنچتا ہے اور جب طرزِ بیان کے غیر ضروری اجزا پر زور دیا جائے گا اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاعری صرف صنعت گری ہو کر رہ جائے گی اور اس میں جذبہ کی گرمی اور احساس کا خلوص اور شدت ختم ہو جائے گی۔

"وزن اور قافیہ کی پابندی شاعر کے لئے کم نہ تھی کہ اس پر ردیف بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے بے چارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔"

اس دلیل کے ساتھ مرزا نے متوسطین اور متاخرین کی شاعری کو متقدمین کے مقابلے میں پست اور سطحی قرار دیا ہے اور معنویت کی طرف لانا مبارک بتایا ہے۔ ان کے پہلے مراسلے کے آخری حصے میں واضح طور پر یہ صراحت کی گئی ہے:

"ہندوستان میں سو برس ادھر کی شاعری آج کی شاعری سے اچھی تھی۔ متوسطین نے جھگڑے حد سے زیادہ بڑھا دئے۔ اس لئے مزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانے میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے اس لئے مجھے ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔"

اس مختصر مقالے کا مقصد مرزا رسوا کی تنقیدی نگارشات کا تعارف کرانا ہے۔ پہلے مراسلے کے ساتھ ہی یہ مقالہ بھی ختم ہوتا ہے۔ اگر یہ مقبول ہوئی تو مرزا کے دوسرے مراسلات بھی تعارفی حواشی کے ساتھ پیش کئے جائیں گے۔

اس مراسلے میں بھی جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ تنقید نگار کی حیثیت سے مرزا رسوا غیر معمولی استعداد کے ادیب تھے۔ جس طرح ادب کے نفسیاتی عوامل اور فلسفیانہ بنیادوں پر انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ اردو ادب کے تنقیدی سرمایے میں خاصے کی چیز ہے۔ ان کے نزدیک صرف قدما کی پیروی نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے علوم انسانی کے دوسرے تمام ذخیروں سے ملتے ہیں پھر یہ بات خاص تعجب خیز ہے کہ مرزا رسوا کی تنقید میں مغرب سے غیر معمولی مرعوبیت کا انداز نہیں ملتا نہ وہ حالی کی طرح اخلاق اور اصلاح کے تصورات تک محدود رہتے ہیں نہ قدیم رنگ سخن کے پیرووں کی طرح محض لفظی نزاع، صحت زبان اور بیان کے فروعی مسائل میں الجھتے ہیں۔

ان مراسلات میں پہلی بار کسی اردو تنقید نگار نے ادب کے فلسفیانہ مباحث کو دوسرے تمام علوم سے منسلک کر کے پیش کیا ہے اور تشبیہ و استعارے اور ادب کی تکنیک کو فلسفیانہ اور نفسیاتی انداز سے پرکھنے اور ان کے اصول و ضوابط قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مراسلات سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ شاعری اور ادب میں احساس صحیح، تجربے کے خلوص (Genuine Experience) اور شعور کی

ہمہ گیری کی طرف جس طرح مرزا رسوا نے رہنمائی کی ہے۔ اس کی مثال ہمارے تنقیدی سرمائے میں بہت کم ملتی ہے۔ اپنے دور کے رواج کے برخلاف وہ شاعر یا ادیب کو صرف اپنی ذات میں گم ہو جانے والا انسان نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات سے باخبر اور تجربے اور مشاہدے کی لامحدود پہنائی رکھنے والا مفکر قرار دیتے ہیں۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کی تازگی آج بھی قائم ہے اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو اب بھی ان پر غور کرنے اور ان پر بحث کرنے سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے مرزا رسوا کے تمام تر تنقیدی نظریات سے آج اتفاق نہ کیا جا سکے لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں ہے جو خیال انگیز اور خیال آفریں نہ ہو اور جو تخلیق و تعمیر فن کے سلسلے میں کارآمد خیالات کے لئے مفید نہ ہو۔ پھر اب سے اتنے عرصے پہلے لکھے ہوئے یہ مراسلات حقیقتاً اپنے دور میں انقلابی حیثیت رکھتے ہوں گے اور اس دور میں اس قدر جدید اور ہمہ جہت آگاہ ذہن سے ادبی مسائل پر سوچنا ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کارنامہ غالباً حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد ہمارے تنقیدی سرمایے میں سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبے کا مستحق ہے۔

—— —

اودھ پنچ کا ایک رتن

محمد طاہر فاروقی

قدیم داستانوں نے ہمارے ادب میں جو مفید چیزیں چھوڑیں، ان میں ظرافت بھی تھی۔ لیکن وہ ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کی چیز ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا تو مزاح و طنز نے ایک نیا روپ دھارا۔ اور اردو میں اس لطیف مگر مشکل صنف ادب کے ایسے جواہر پارے جمع ہو گئے، جن پر شائقین آج بھی سر دھنتے ہیں۔ سرسید کی طرح خوش قسمتی سے منشی سجاد حسین کو بھی ایسے رفقائے کار میسر آ گئے تھے، جنہوں نے ان کا ہاتھ بٹانے اور ان کے مقصد کو پورا کرنے میں، ان کے ساتھ پورا قلمی تعاون کیا۔ اودھ پنچ کے ان مستقل انشا پردازوں کی فہرست کافی بڑی اور روشن ہے۔ مگر ان میں زیادہ نمایاں حضرات یہ تھے:۔

منشی احمد علی کسمنڈوی۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ نواب سید محمد آزاد۔ اکبر الٰہ آبادی۔ منشی تربھون ناتھ ہجر۔ اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔

افسوس ہے کہ اودھ پنچ کے فائل اب بہت کم نظر آتے ہیں۔ اور پاکستان میں تو شاید ہی کہیں مکمل موجود ہوں۔ "مضامین اودھ پنچ" اور بعض انشا پردازوں کے مضامین کے دوسرے مجموعے بھی اب بہت کم جگہ محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ اودھ پنچ کے فائلوں میں سے انتخاب کر کے ان باکمالوں کے مزاح و طنز کے بہترین نشتر علیحدہ علیحدہ کتابی صورتوں میں شائع کئے جائیں۔ ورنہ کچھ دن اور یونہی گزرے تو تاریخ ادب کا یہ اہم باب بھولا بسرا ہو جائے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل موضوع پر آنے سے قبل چند لفظ طنز و مزاح کی بابت بھی کہتا چلوں۔

طنز و مزاح ہمارے روزمرہ کے معمولی الفاظ ہیں۔ روز دوستوں کی محفلوں میں، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، چھیں اور چھیڑ خانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جب تک بات ہنسنے ہنسانے میں محدود رہے ٹھیک ہے لیکن ایسا بھی اکثر ہو جاتا ہے۔ کہ یاران محفل ہی میں سے کوئی ایک روٹھ بھی جاتا ہے۔ بلکہ کبھی بات اس سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ناگواری اور تلخی کیوں پیدا ہوئی؟ مزاح کرنے والے یا نشانۂ مزاح بننے والے میں سے کسی ایک کی کمزوری ضرور ہوگی۔ اس کمزوری کا تعلق اگر ناشائستگی سے ہے تو ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ بے ادبی میں ادبیت کہاں!! لیکن اگر یہ کمزوری محض کسی کے بے ڈھنگے پن سے پیدا ہوئی تو اس کو ادب میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ مگر ایسے مزاح کو کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہ ہوگا۔

ادب کا جیسا گہرا تعلق زندگی سے ہے، ویسا ہی اقدار و اخلاق سے ہے۔ ادب بھی ایک آرٹ ہے بلکہ آرٹ کی بہترین قسم۔

اور آرٹ میں جمالی اور افادی دونوں حیثیتیں جتنی ممتاز اور نمایاں ہوں، اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوگا۔ طنز و مزاح ادب کی قسمیں ہیں۔ اس لئے ان میں حسن اور افادیت دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ سوقیت اور ابتذال سے ان پر جیسے حرف آتا ہے، اسی طرح محض لڑکوں والی چہلیں بھی ان کو اعلیٰ ادب کی حدود سے دور لے جاتی ہیں۔ اور ہمیں بحث ہے صرف اس طنز و مزاح سے جسے ادب میں قابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔

طنز اور مزاح میں بڑا نازک فرق ہے۔ کسی کی کسی بے ڈھنگی بات سے لطف لینا مزاح ہے، اور اسی بات سے کوئی کارآمد نکتہ پیدا کرنا طنز ہے۔ کسی کے پھسل کر گرنے پر ہنسنا اور فقرہ چست کرنا مزاح میں داخل ہے اور گرنے کے بے تکے فعل کو دیکھ کر زندگی کا ایک مفید نکتہ اخذ کرنا اور بتانا طنز ہے۔ مزاح بری چیز نہیں، بشرطیکہ اس کا مقصد محض دوسرے کی دل آزاری نہ ہو۔ یہی بات دشوار ہے۔ مگر طنز اس سے بھی مشکل شے ہے۔ کسی کے چرکے لگانا اور وہ بھی اس طرح کہ اسے ناگوار نہ ہو، اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا خواہاں ہو، واقعی ٹیڑھی بات ہے۔ اسی لئے عموماً طنز کی تلخی میں مزاح کی ذرا سی چاشنی ملائی جاتی ہے، تاکہ وہ صرف کڑوی دوا بن کر نہ رہ جائے۔

مزید وضاحت کے لئے دو شعر پیش کرنے بے محل نہ ہوں گے۔ غالب کہتے ہیں:

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین   ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

اکبر کا شعر ہے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دونوں شعروں میں مزاح صاف نظر آتا ہے۔ غالب کے شعر پر نظر ڈالئے۔ قبر میں منکر نکیر کے آنے کو کون ٹال سکتا ہے! رند خراب حال کے لئے یہ سوال جواب اور بھی زیادہ ناخوش گوار ہوگا۔ نکیرین فرشتے ہیں۔ فرشتے ہر برے کام سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ رند سوچتا ہے کہ اگر قبر میں بھی اس حال میں جاؤں کہ منہ سے شراب کے بھبکے اڑ رہے ہوں، تب تو یقیناً منکر نکیر قریب بھی نہ پھٹکیں گے، اور میں اس سوال جواب کی مصیبت سے چھوٹ جاؤں گا۔ دیکھئے کیسا مذاق اڑایا ہے! کیا خوب بات پیدا کی ہے! بہت شوخ مزاح ہے۔
اب اکبر کا شعر دیکھئے:۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کہتے ہیں ایسا زمانہ آگیا کہ اکبر کے منہ سے خدا کا نام نکلتا ہے تو لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ اور مخالفین تھانے میں جا کے رپٹ لکھوا دیتے ہیں۔ جیسے کہ اکبر نے کوئی بڑا سنگین جرم کیا ہے۔ زمانے کی بے دینی پر کتنا گہرا طنز ہے! لیکن اس کو خوشگوار بنانے کے لئے مزاح کے قرص میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ تاکہ یہ تلخ دوا حلق سے اتر سکے اور مرض کے ازالے میں مدد دے۔

ہم آہنگی اور توازن کے فقدان پر انسان کا ہنسنا ایک فطری بات ہے۔ اگر لمبے قد کے آدمی کے ساتھ کوئی پست قد آدمی جا رہا ہو تو ہمیں خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔ کسی کے کیچڑ میں پھسل کر گر پڑنے پر بھی اسی لئے آپ ہنس پڑتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بار بار ایک ہی بات یا ایک ہی عمل کو دہراتا رہے تو جگ ہنسائی کا سبب بن جاتا ہے۔ ان سب صورتوں میں ہم آہنگی اور توازن مفقود ہے، اسی لئے ہنسی کی تحریک ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کو ان باتوں پر ہنسی آتی ہے جن میں بظاہر ہنسی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اس کا سبب خوش طبعی نہیں بلکہ ہمدردی ہوتا ہے۔ اگر آپ ہر چھوٹے بڑے ناگوار واقعہ سے متاثر ہوتے رہیں، تو زندگی اجیرن ہو جائے، اس لئے بعض دفعہ فطرت خود ایسی باتوں کو ہنس کر اڑا دینا چاہتی ہے۔

نیٹشے نے انسان کے حیوانِ ضاحک ہونے کی دلچسپ توجیہہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "چونکہ انسان پر سخت سے سخت مصائب پڑتے ہیں۔ اس لئے ہنسنے کی قوت بھی اسی میں پائی جاتی ہے۔" برگساں نے ہنسی کی بابت ایک اور لطیف بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "انسان زندگی کی تخلیقی قوت کا مرکز ہے۔ اب اگر ہم اسے کوئی میکانکی حرکت کرتے دیکھتے ہیں تو چونکہ یہ بات ہماری توقع کے خلاف ہے، اس لئے ہم کو خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔"

مزاح اور طنز کے مواقع زندگی کے ہر قدم اور ہمارے اعمال کے ہر موڑ پر مل جاتے ہیں۔ ان تک پہنچتا و دیکھتا ہر شخص ہے لیکن ان کو ادبی طنز و مزاح کا مواد بنانا ایک صاحبِ فن ہی کا کام ہے۔ واقعات، احساسات، تجربات کے بہت سے ایسے پہلو بھی ہوتے ہیں، جن پر ہر ایک کی نظر نہیں پڑتی یا نہیں پڑ سکتی۔ لیکن کامیاب ادیب کی تیز بین نگاہیں اُن تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ کبھی وہ بہت ہی معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں کو بھی پیش کرتا ہے، مگر یہ اس کا کمال ہے کہ وہ ان کے بیان و ادا کے لئے ایسا نادر اور اچھوتا اسلوب اختیار کرتا ہے، کہ ان میں بھی کشش اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ حسبِ ضرورت اپنے بیان میں کسی رنگ کو گہرا اور کسی کو ہلکا کر دیتا ہے، تاکہ پڑھنے سننے والے اس کے منشا کے مطابق اچھا اور پختہ اثر قبول کریں۔ یہی سبب ہے جو ہم غالب اور اکبر کے ان شعروں میں جو ابھی میں نے آپ کو سنائے تھے (یا ایسے ہی دوسرے بہت سے شعروں اور فقروں میں) باوجود معمولی مضامین کے اچھا اثر اور لطف پاتے ہیں۔

اس طول بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی قسم کے بے ڈھنگے پن سے محظوظ ہونے اور اس میں لطف لینے کا نام مزاح ہے اور اس پر برہم ہونا اور اس سے مفید نکتہ نکالنا طنز ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ زبان و بیان کو ان دونوں میں وہی درجہ حاصل ہے جو جسم میں روح کو۔ پھر یہ بھی نہ بھولئے کہ اس لطف و برہمی کے حدود ایسے نازک اور غیر محسوس ہیں کہ ان سے ذرا سا بھی تجاوز ہو جائے تو مزاح اور طنز دونوں ٹکسال باہر ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مزاح و طنز کی بہت سی صورتیں ہوتی ہوں گی۔ انسانی جذبات، حسیات اور تجربات کا شمار ناممکن ہے۔ تو ان سے پیدا ہونے والی کیفیات کے نام رکھنے کب آسان ہوں گے! پھر بھی اردو ادب میں ایسے کئی لفظ استعمال ہوتے ہیں، جن سے لطف اُٹھانے، برہم ہونے یا ہنسنے ہنسانے کی کیفیت کا کوئی نہ کوئی پہلو سمجھ میں آتا ہے۔ خوشگوار اور پسندیدہ ظرافت سے لے کر ناخوشگوار اور ناپسندیدہ ظرافت تک۔ ان درجوں میں سے اکثر یہ ہیں۔ اس تفصیل میں اک گونہ معنوی تنزلی ترتیب بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ (۱) طنز (۲) تعریض (۳) ظرافت (۴) خوش طبعی (۵) بذلہ سنجی (۶) شوخی (۷) چٹکلہ (۸) لطیفہ (۹) تمسخر (۱۰) ٹھٹھول (۱۱) نقرہ بازی (۱۲) پھبتی (۱۳) ضلع (۱۴) جگت (۱۵) ہزل (۱۶) شہدپن (۱۷) ہجو (۱۸) پھکڑ (۱۹) ابتذال (۲۰) اور فحش۔

ہمارے ادبی سرمائے میں مزاح و طنز کے۔ پسندیدہ و ناپسندیدہ (یا ادبی و غیر ادبی) اقسام اس طرح خلط ملط ہیں کہ ایک طالب علم کو ان کے مطالعہ سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔ اودھ پنچ جس معاشرے میں پیدا ہوا وہ ہمارے زوال و انحطاط کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ اس میں ناپسندیدہ اور غیر ادبی اصناف جگہ نہ پاتیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اودھ پنچ کا مقصد اصلاحی تھا اور لکھنے والوں میں بلا کا خلوص پایا جاتا تھا۔ اس لئے ان کی ظریفانہ تحریروں کے خال خال معائب محاسنِ انشا کے سامنے ہرگز نمایاں نہ ہوتے تھے۔ اور مجموعی اثر اسی لئے مفید اور مستحسن ہوا کرتا تھا۔ اور شائقین اودھ پنچ کے نئے شمارے کا اسی ذوق و شوق سے انتظار کیا کرتے تھے جس طرح مولانا محمد علی مرحوم کے کامریڈ کا۔ چنانچہ اودھ پنچ کے ممتاز انشا پردازوں نے مزاح و طنز کے جو خوش نما پھول اور تیز نشتر ہمارے لئے جمع کئے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ تاریخِ ادبِ اُردو کا قیمتی سرمایہ بنے رہیں گے۔

نواب سید محمدؔ آزاد اودھ پنچ کے انہی انمول رتنوں میں سے ایک رتن تھے۔ آپ ۱۸۴۶ء میں ڈھاکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی سید محمود آزاد اپنے زمانے کے مشہور اور ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ سید محمود آزاد کی تعلیم و تربیت اس عہد کے دستور کے مطابق گھر پر لائق استادوں کی سرپرستی میں ہوئی۔" جوان ہوئے تو سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔" خاندانی وجاہت اور ذاتی قابلیت کی بدولت من مانی ترقی کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اسسٹنٹ رجسٹرار کلکتہ کے پولیس مجسٹریٹ، اور آخر میں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ اور حسن خدمات کے صلے میں اول خان بہادری کا اور پھر نواب کا خطاب ملا۔

نواب سید محمدؔ آزاد گزشتہ صدی کے بہترین انشا پردازوں میں تھے۔ آپ کے مضامین اس زمانے کے اکثر اخبارات میں شائع ہوا کرتے تھے۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:- آگرہ اخبار آگرہ۔ اکمل الاخبار دہلی بشیر قیصر لکھنؤ۔ دوربین دہلی۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ کلکتہ کا انگریزی اخبار۔ رئیس اینڈ ریعیت۔ آپ عموماً مختلف فرضی ناموں سے ان مضامین کو شائع کراتے تھے۔ مثلاً خطوط کے آخر میں "سید ازلی"۔ "تیغ بے نیام"۔ "لیڈی خردس"۔ "صوفیہ" جیسے نام مضمون خط کی مناسبت سے اختیار کئے ہیں۔ اپنے مضمون "سائنس نیچر" کے راقم کا نام آپ نے "فطرت" پسند کیا تھا۔ "ڈکشنری" کی قسطوں میں ایک جگہ راقم کا نام "کوئی نہیں" تجویز کیا تھا۔ اور کبھی "نئی روشنی کا ہستی سوختہ چراغ" اور کہیں "تمدنی سوئیپر" جیسی معنی خیز اصطلاحیں تراشی تھیں۔ لیکن آپ کے اکثر مضامین "آزاد" کے قلمی نام سے شائع ہوئے ہیں، اور بعد کو یہی لفظ آپ کے نام کا جزو بن گیا تھا۔

آپ کے بڑے بھائی سید محمود کا تخلص آزاد تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سید محمدؐ صاحب نے بھی کبھی کبھار شعر کہہ لئے ہوں جیسا کہ اس زمانے میں ہر لائق شخص کا طریقہ ہوتا تھا۔ لیکن نہ تو آپ نے کبھی شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی؛ اور نہ بزرگان ڈھاکہ میں سے کوئی مجھے یہ بتا سکا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ اس لئے میں اس قیاس پر مجبور ہوں کہ آپ نے بڑے بھائی کے تخلص ہی کو اپنا قلمی نام بنانا پسند کیا تھا۔ شیخ محمدؐ اکرام صاحب نے "ارمغان پاک" کی نئی اشاعت میں "آزاد جہانگیر نگری" کا فارسی کلام شامل اشاعت کیا ہے۔ اور مصنف کا پورا نام نواب سید محمدؐ آزاد لکھا ہے۔ معلوم نہیں کاتب کی غلطی سے "محمود" کی جگہ "محمدؐ" لکھا گیا۔ یا واقعی چھوٹے بھائی اردو کے نہیں تو فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے

پروفیسر عبدالغفور شہباز نے سید محمدؐ آزاد کے بعض مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا پہلا حصہ "خیالات آزاد" کے نام سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ شہباز نے اس مجموعے کا ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جو مختصر ہوتے ہوئے بھی بے حد اہم ہے۔ دیباچہ میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

"چونکہ مجھ کو مولانا آزاد کی تحریرات سے باقتضائے حالات زمانہ و اتفاق مذاق ایک طرح کا انس بلکہ عشق تھا، میں ان کو مسلسل طور پر جمع کرتا جاتا۔ یہاں تک کہ جب ان کا ایک ذخیرہ وافر فراہم ہو گیا۔ تو میرے ذہن میں بڑے زور سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو بترتیب معقول مرتب کر کے یک جا چھپوا دیا جائے، تو غالباً ملک و قوم کے لئے بہت نافع ہو گا۔ یہ مجموعہ اس خیال کی پہلی قسط ہے۔ .... اس مجموعے میں جس قدر تحریریں ہیں، شوخی و ظرافت آمیز ہیں۔ وہ بھی کل نہیں۔ اگر کل یکجا کی جاتیں تو بار عظیم ہو جاتا۔ بہت سے ڈرامے (ناٹک) جو اس شخص کے قلم جادو رقم سے مختلف اخلاقی مضامین پر نکلے، متروک النظر کئے گئے۔ اس لئے کہ وہ بجائے خود ایک رسالہ جداگانہ کے مقتضی ہیں۔"

"خیالات آزاد" کا یہ نسخہ پہلی دفعہ ۱۸۸۷ء میں حصہ اول کے نام سے قومی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا۔ دوسرے حصے کے

علٰحدہ چھپنے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ حصہ اول جلد ہی فروخت ہوگیا۔ اس لئے شہباز نے اس میں دوسرے مضامین کا اضافہ کرکے چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ لیکن ان کی بیماری کے سبب چھپنے میں دیر ہوئی۔ آخر شہباز کی فرمائش پر محمد عبدالحمید صاحب نے خیالات آزاد کی طباعت کی نگرانی کی۔ اپنی طرف سے "التماس" کے نام سے چند صفحات شامل کئے اور طبع اول کا دیباچہ بدستور برقرار رکھا۔ محمد عبدالحمید صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آزاد کے بعض دوسرے مضامین بھی کتابچوں کی صورت میں علٰحدہ چھپے تھے۔" ان میں سے (مضامین آزاد سے) بعض کتابیں مثلاً سوانح عمری آزاد۔ نوابی دربار وغیرہ اس عرصے میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر بصیرت افروز شائقین ہوئیں۔ اور ملک و قوم نے ان کی پوری قدردانی کی۔"

قیاس حمید صاحب کی تحریر کی تائید کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ مضامین باوجود اپنی جدت شہرت اور پسندیدگی کے اس مجموعے میں شامل نہیں کئے گئے تھے۔ "خیالات آزاد" کا یہ دوسرا اور مکمل ایڈیشن ۱۹۰۸ء میں رضوانی پریس کلکتہ میں چھپا تھا۔ عبدالحمید صاحب کی وضاحت سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۷ء اور ۱۹۰۸ء کی دونوں کتابوں کے مندرجات میں کیا فرق ہے۔

پہلے ایڈیشن میں صرف یہ سولہ عنوان اور ان کے تحت پچیس مضامین تھے۔ مولانا آزاد کی نئی ڈکشنری۔ نئے سال کی نئی ڈکشنری۔ تیرھویں صدی کی نئی ڈکشنری۔ چودھویں صدی کی نئی روشنی کی نئی ڈکشنری۔ چودھویں صدی کی پرانی روشنی کی ڈکشنری۔ نئی روشنی کا نامہ و پیام۔ مہذب نامہ و پیام۔ اخلاق آموز نامہ و پیام۔ تہذیب آموز نامہ و پیام۔ پرانی روشنی کا نامہ و پیام۔ سعادت فرجام نامہ و پیام۔ مولانا آزاد کا خمارستان کا ڈنر۔ مولانا آزاد کا ولایت کا شوق۔ مولانا آزاد کا سفرنامہ۔ مولانا آزاد کا اشتہار مسرت بار اور مولانا آزاد کی ستائش نیچر۔

دوسرے ایڈیشن میں دس عنوان اور ان کے تحت گیارہ مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ۔ نئی چمکتی ہوئی ڈکشنری۔ نئے سال کی نئی روشنی کی نئی ڈکشنری۔ پرانی روشنی کی نئی اسکول ڈکشنری۔ چودھویں صدی کی پرانی روشنی کی نئی ڈکشنری۔ حسرت انجام نامہ و پیام۔ حسرت فرجام نامہ و پیام۔ بادشاہ نسب امراض۔ جن کا مالیخولیا۔ روئداد اجلاس۔ جنجال کونسل۔ گرماگرم تار کی خبریں۔

ان عنوانات کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی طبیعت میں کتنی جدت اور اپج تھی۔ اور وہ کیسی نئی چیزوں پر قلم اٹھاتے تھے۔ یہی جدت و شگفتگی اور ندرت و بے ساختگی ان کے اسلوب تحریر میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مزاح و طنز کے اکثر پسندیدہ امثال ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مغربیت کا جو سیلاب امنڈا، وہ خزف ریزوں کے ساتھ جواہر پاروں کو بھی بہالے گیا۔ اور نئی روشنی کی مسحور کن دلفریبیوں نے نئی پود کے دل و دماغ پر بہت سے غلط نقش ثبت کئے۔ ذکی الحس اور تیز نظر حضرات نئی نسل کے لئے اسے از حد خطرناک سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی خواہش صرف یہ تھی کہ قدیم و جدید دونوں کی اچھی چیزیں لے کر ایک بہتر توام تیار کیا جائے۔ نواب سید محمد آزاد کی تحریروں کا مقصد بھی صاف یہی نظر آتا ہے۔ ان کا مزاح مہذب اور شگفتہ ہے۔ ان کی عبارت میں سلاست اور روانی کے ساتھ زور اور خلوص پایا جاتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے کبھی کبھی وہ اپنی تحریر میں سجع بھی پیدا کردیتے ہیں جس سے عبارت اور بھی شگفتہ ہوجاتی ہے۔ کہیں کہیں ان کی تحریریں شوخ، رنگین اور چٹپٹی بھی ہوجاتی ہیں، لیکن کسی صورت میں بھی وہ شائستگی کے درجے سے گرنے نہیں پاتیں۔ ان کے طنز میں زہرناکی نہیں ——— پھر بھی ان کے طنز کے نشتر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

آزاد کی تحریریں اس زمانے میں بیحد مقبول تھیں۔ قدرشناس ان کے رنگ کو کیسا اور کتنا پسند کرتے تھے۔ اس کی بابت پروفیسر

شہباز کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں :۔

"یہ اس شخص کے خیالات ہیں، جس کا قلم آزاد، قم زمان دراز تک اخبار نویسی اور وقائع نگاری کی عمارت کا ایک محکم اور استوار ستون رہا ہے۔ عالم انشا پردازی پر اس شخص کا اتنا بڑا احسان ہے کہ فرنگستان میں شاید میکالے، کارلائل، اور گولڈ اسمتھ کا بھی اتنا ہی ہو۔ اس شخص نے اپنی وسعت خیالات کے مطابق، بزور ذہانت و ذکاوت، اردو انشا پردازی کے تنگ کوزے میں وہ گنجائش نکالی، کہ دریا کیا دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی سمائی نظر آئی"

آزاد کے اسلوب ظرافت میں وہ دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے کہ اس کا ہر دور میں قبول عام پا لینا قدرتی نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کی جولانی کے مظاہرے کے لئے نئے نئے موضوع انتخاب کئے تھے، اور پھر وہ ان کو جدید ناموں اور اچھوتے انداز سے پیش کرتے تھے۔ وہ کبھی انگلستان نہیں گئے، لیکن ان کے خطوط پڑھ کر اکثر ادیبوں اور تاریخ ادب کے مصنفوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ یہ خطوط واقعی لندن میں بیٹھ کر لکھے گئے تھے۔ نقل کو ایسا اصل بنا کر دکھانا کہ خود ماہرین فن دھوکا کھا جائیں کتنا بڑا کمال ہے۔

ڈکشنری ان کی خاص ایجاد ہے جس میں انہوں نے نئے اور پرانے تصورات اور خیالات کا خاکہ اڑانے کے لئے بعض الفاظ اور اصطلاحات کے مفصل معنے لکھے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اس پردے میں وہ تیز اور گہرے نشتر چھوڑ گئے ہیں۔ عموماً سال کے شروع میں آزاد اپنی ڈکشنری کی ایک قسط لکھ کر چھپوا دیا کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس لئے مجموعے میں بھی بارہ عنوانوں کے ماتحت لغات کی یہ نئی تشریح ہماری دلچسپی اور بصیرت افروزی کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اورنگ زیبی پھوڑے سے متعلق جو روایات مشہور ہیں، انہوں نے آزاد سے" بادشاہ نسب امراض" کی چبھتی ہوئی طنز ترشوا دی۔ اور اس ذیل میں ان کی قوت ایجاد نے بہت سی دوسری" بادشاہ نسب" بیماریوں کے نام اور خواص گنا دیئے۔" روئداد جنجال کونسل" کے تحت آزاد نے ہمارے قانون سازاداروں پر کامیاب اور موثر طنز کیا ہے۔" حسن کا مالیخولیا"،" تار کی خبریں"،" خمارستان کا ڈنر"،" سفر نامہ"،" ستائش" غرض جس مضمون پر نظر ڈالئے،" کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست"۔

موضوعات کے اس تنوع کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آزاد پرانی معاشرت اور نئی روشنی دونوں کے معائب و نقائص اور بے راہ روی پر یکساں طنز کے تیر چلاتے ہیں، تو ہمیں ان کی انصاف پسندی، سلامت طبعی اور بے تعصبی کا اعتراف کرنا اور قائل ہونا پڑتا ہے۔ اور اس سے ان کی شخصیت اور بھی بلند نظر آنے لگتی ہے۔ پروفیسر شہباز نے تحسین سخن شناس کا حق ادا کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے

" شوخی و ظرافت جو اس شخص کا ایک خلقی جوہر ہے، وہ بھی اس آزادی کے زمانے میں بے چمکے نہ رہی۔ اور اس کی چمک دمک اس غضب کی ہوئی کہ اکثر شپرہ چشم گھبرائے۔ اور بہت سے صاحب نظر چکر میں آئے۔ اکثر مجالس میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے فقرات نقل محفل بنے۔ اور اکثر زبانوں پر ان کے بعض برجستہ جملے ضرب المثل کی طرح جاری ہوئے۔ جدت پسندی سے مضمون آفرینی کا جو راستہ نکالا ایسا نکالا جس پر لوگ قدم بھی بمشکل رکھ سکتے ہیں، منزل مقصود کو پہنچنا تو بڑی بات ہے۔ اور ساتھ اس مشکل پسندی کے عام پسند اس قدر کہ ہر شخص اس پر والہ و شیدا ہے۔ سب سے پہلے ڈکشنری ایجاد کی۔ اس رنگ نے وہ عام مقبولیت حاصل کی کہ اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے۔ اور اکثروں نے جوش پسندیدگی میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن آخر وہی مثل ہوئی" بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا"۔

آزاد کی تحریروں کا تنوع اور بوقلمونی فی الحقیقت رنگ برنگے خوشنما پھولوں کا ایسا گلدستہ ہے کہ ہمیں شہباز کی اس رائے

سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ :

"ہرچند فرداً فرداً بھی ہر ایک تحریر دل پذیر اور بجائے خود جدید طرز کی مفید انشا پردازی کی ایک اعلیٰ نظیر ہے۔ لیکن کل تحریروں کی مجموعی قوت عجب شگفت افزا و جادو تاثیر ہے۔ اور میرا قیاس ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی انشا پرداز ایسا ہوگا جس کے قلم سے اتنے مختلف نوایجاد رنگوں میں اتنی مقبول اور دل پسند تحریریں نکلی ہوں"۔

جنوری ۱۸۸۷ء میں آزاد نے اودھ پنچ کے شائقین کے سامنے "نئی ڈکشنری" کے نام سے اپنی جدت طراز طبیعت کی نئی تخلیق پیش کی تھی، جو گویا ان کی طرف سے ملک کے لئے نئے سال کا تحفہ تھا۔ اس میں آپ نے ان دس لغات کے "مطالب" تفصیل سے سمجھائے تھے۔ "پالسی۔ آنر۔ انٹرسٹ۔ پارٹی فیلنگ۔ سویلزیشن۔ نیشنل ایجوکیشن۔ کورٹ شپ۔ کانشنس۔ تھینکس۔ پارلیمنٹ"۔ اس نئے تحفے کو پیش کرتے ہوئے آپ نے چند سطری تمہید بھی لکھی تھی جو اپنی جگہ کافی دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں:

"نئی روشنی کے گھر کے کراسن لیمپ مسٹر اودھ پنچ بہادر زاد ظرافتہ، ! واللہ! آکا آپ تو تہذیب کے بیلون پر سوار ہو کر روم روس کی لڑائی، اور مدرسہ تہذیب آموز مغربی و شمالی کی کارگزاری کے ملاحظے کے لئے ایسے رفوچکر ہو جایا کرتے ہیں کہ آپ کا پتہ لگنا دشوار ہے۔ یہ لیجئے چند ایسے انگریزی لفظوں کے معنی، جن کے جاننے کی ان دنوں ہر ہندوستانی کو ضرورت ہے۔ پیش کش ناظرین با تمکین اودھ پنچ کرتا ہوں آپ بھی چونکہ تیرھویں صدی کے ایک نئی روشنی والے محقق ہیں، اس لئے امید ہے اگر میری تحقیق غلط ہو تو آپ براہِ عنایت مجھے ہدایت فرماویں گے"

اس کے بعد آپ ہر سال کے شروع میں کچھ الفاظ کے نئے معانی و مطالب کا تحفہ ناظرین اودھ پنچ کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے رہے۔ "خیالات آزاد" میں مختلف مناسب اور پھڑکتے ہوئے عنوانوں کے تحت ذیل کے الفاظ اور ملتے ہیں:

"یوروپین کنسرٹ۔ سائنٹفک فرانیٹر۔ تانگہ۔ قرمساق۔ اولڈ پاپا۔ مہذب بی بی۔ نوچی۔ ڈومنی۔ الیکشن زادہ۔ آیا۔ اردلی بہرہ۔ میانجی۔ بیرانی"۔

یوں تو ہر لفظ اور اس کی مختلف تشریحات بیحد دلچسپ، پر لطف اور چٹپٹی ہیں، مگر نمونے کے طور پر بعض لفظوں کے "صرف چند معنی" دیکھئے اور آزاد کے مزاح کی جدت و جودت، ان کی نظر کی گیرائی و گہرائی اور طنز کی تیزی و شوخی کا مزا لیجئے۔

"انٹرسٹ ــ (حقوق) وہ چیز جس کی حفاظت ضروری نہیں۔ ساری دنیا کو اپنا جاننا۔ ایک شکل تصوری دوسروں کو ڈرانے کے لئے کرنا۔ ایک نازک ہڈی جس پر ایک محلے کے ایک ہی رنگ اور نسل کے کتے اس ہیبت ناک طرح سے لڑیں کہ ان کی آواز سے دوسروں کے ڈرنے کا احتمال ہو ....

سویلزیشن۔ (تہذیب) اپنے ہم وطن کو وحشی جاننا۔ اپنے بزرگوں کو اولڈ فولز (پرانا فاز) کہنا۔ سڑک پر چلتے وقت سیٹی بجانا، چھڑی ہلانا، اور بوٹ پٹکنا۔ آلو کھانے کا شوق، شراب پینے کا ذوق۔ ہارمونیم کی گت پر برانڈی کی دھن میں پیروں کی تال دے دے کر ناچنا...

"تھینکس ــ (شکریہ) انگریزی معصوم لفظوں کا اولڈ پاپا۔ خشک تحسین۔ خشک سلام۔ خشک احسان۔ وہ لفظ جو دنیا بھر کو خوش کرنے کے لئے بلا کسی قسم کے صرف کے ایک مجرب دوا ہے۔ وہ دولتِ لازوال جس کا تہذیب یافتہ دنیا میں بے انتہا خرچ ہے۔ خوش کرنے کا کم خرچ بالانشین آلہ ....

الکشن زادہ ــ ووٹ کی کشتی کے بے اصول مستول پر اپنی خود غرضی کی لمبی اور خوشنما دم کو لٹکا کر بیٹھنے والا طائر۔ جہلا اور حمقا کو سبز باغ

دکھاکر اور بیشمار اور بیکار ایسے وعدے کرکے کہ جن کو ایفا نے مدت ہوئی طلاق دے دی تھی اپنے دام فریب میں لانے میں ماہر۔ الیکشن کے دو مہینے قبل ہی سے اخلاق اور انکسار مجسم۔ ہر ادنی ووٹر کی مصنوعی تعظیم کے خیال سے ہر دم خم۔ خود ستائی کا ڈنکا ہر موقع پر بے موقع بجائے۔ وہ لالچی اور بھوکا بلا جس کا منہ کسبیوں کے دروازے کی طرح کسب منفعت کے خیال سے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ہر کہ و مہ کے قدم پر ایک بازیگرانہ چالاکی سے ٹوپی گرا دینے میں مشاق۔ ابلہ فریبی داحمق نوازی کے فن میں طاق۔

مہذب بی بی — دل کش دلربا اور دلفریب جڑی۔ میاں سے سن میں دس بیس برس بڑی۔ غنچۂ دل احباب کے کھلانے کی ہوائے بہار۔ ایک انار سو بیمار۔ مہذب دماغوں کے معطر رکھنے کا سدا بہار گل شبو۔ سوسائٹی کا پھڑکتا ہُوا اور دلچسپ و ستبنو۔ میاں کی افزائش عزو مراتب اور ترقی عہدہ میں اکسیر تاثیر ...

غرض اسی طرح مذکورہ بالا تیئیس لفظوں میں سے ایک ایک کے درجنوں معنی بتائے ہیں، جو خیالات، آزاد کے پہلے صفحے سے شروع ہوکر صفحہ ۶۶ پر ختم ہوتے ہیں۔ اور اس پردے میں آزاد نے پرانی معاشرت اور نئی روشنی کی ہلاکت آفریں بدعنوانیوں پر یکساں گہرے چرکے لگائے ہیں۔

آزاد کی اس کتاب میں ڈکشنری کے بعد خطوط آتے ہیں۔ جو تعداد میں پندرہ ہیں۔ اور صفحہ ۶۶ سے صفحہ ۲۰۳ تک درج ہیں سب خطوط کافی طویل ہیں۔ اور ان کی نوعیت کافی دلچسپ اور عجیب ہے۔ آزاد نے کبھی انگلستان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ لیکن انہوں نے فرضی خطوط "انگلستان میں بیٹھ کر" لکھے ہیں، وہ جانے والوں کے جذبات و تاثرات کی جیسی صحیح ترجمانی کرتے ہیں، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایسے خط بارہ ہیں۔ سات خط ایک نوجوان رئیس زادے کی طرف سے ہیں، جو اس نے باپ، بیوی اور دوست کے نام لکھے۔ مغرب کے نگار خانے میں پہنچ کر جس طرح اس زمانے کے نوجوان نئی تہذیب کے ہاتھوں بک جاتے تھے، اور اپنے ملک، خاندان اور معاشرے کو جس نظر سے دیکھنے لگتے تھے، اس کی اس سے بہتر عکاسی ناممکن ہے۔ اسی طرح وہ خط ہے جو ہندوستان واپس آنے کے بعد ایسے ہی ایک نوجوان کی طرف سے اس کے انگریز دوست کے نام لکھا گیا ہے۔ یا وہ دو خط جو ایک انگریز لڑکی نے اپنے دیسی شوہر کے ساتھ ہندوستان آکر یہاں سے اپنی انگریز سہیلی کے نام لکھے ہیں۔ "مغرب زدہ نوجوان" جس زاویۂ نظر سے دیکھتے اور سوچتے تھے اس کی صحیح ترجمانی جیسی آزاد نے کی ہے، شاید کوئی "ولایت پلٹ" بھی اس طرح نہ کر سکتا تھا۔

یہ سب خط بحد دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں۔ اور مزاح کے تیروں اور طنز کے نشتروں سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن آزاد کی بے تعصبی اور انصاف پسندی کا اس سے بھی بڑا ثبوت ان پانچ خطوں سے ملتا ہے، جو انہوں نے "تیغ بے نیام" کی طرف سے "پرانی روشنی کا نامہ و پیام" کے عنوان سے لکھے ہیں۔ یہ خطوط ایک پرانی وضع کے بزرگ کے ہیں جو لندن گئے۔ اور وہاں سے انہوں نے "مولانا اودھ پنچ" کو اپنے تاثرات و تجربات لکھ کر بھیجے ہیں "نئی تہذیب" اور "مغربی تمدن" پر ان خطوط میں ایسی بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تنقید ہے کہ آزاد کی ذہانت اور بالغ نظری کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے مشرقی معاشرے کی خرابیوں پر بھی بے تکلف نکتہ چینی کی ہے اور اکثر جگہ انگریزوں کے تمدن کو سراہا ہے۔ لیکن ایک دوسرے کی مدح و ثنا اور تنقیص و حرف گیری میں کہیں انصاف و اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آزاد کی بڑائی کا ہم پر اور زیادہ گہرا نقش اس بات سے جمتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان خطوط کے ذریعے باتوں ہی باتوں میں انہوں نے معاشرے کے بہت سے اہم مسائل، مثلاً تعلیم، صحافت، پردہ، تعلیم نسواں، شادی وغیرہ پر بے لاگ اور آزادانہ رائے زنی کی ہے، اسی لئے ان کے مزاح کے چھینٹے اور طنز کے چرکے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر پڑتے ہیں اور دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

خطوط سے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ـــ نئی روشنی کا دلدادہ نوجوان رئیس زادہ لندن پہنچ کر اپنی بیوی کو لکھتا ہے :-

"اکثر راتوں کو جہاز میں تمہارے گیسوئے مشکیں، موباف سرخ، تنگ و چست کلی دار پاجامے، اور اگرئی ململ کے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا حتیٰ کہ ذرا آنکھ جھپکی اور خواب میں تم موجود ہو۔ مگر جب سے کہ اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا، روز بروز صدمۂ مفارقت گھٹتا گیا۔ اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ اب بخدا تمہاری محبت اس قدر اور اسی طرح کی مجھے ہے کہ جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا، یا کسی جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمہاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے۔ بلکہ تمہاری حالت کا جب کہ میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں، تو تم بالکل ایک نیم وحشی چوپایہ بن کر میرے دیدہ تصور کے سامنے آتی ہو۔ اور میں نہایت اس سے پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ کیوں نیم وحشی گوشت کی ایک ہلنے ڈولنے والی چیز کو میرا باپ بنایا گیا۔ اور کیوں تم سی معصوم نیم وحشی آدمی کے دائمی عیش و آرام و پرورش کا میں ضامن ٹھہرا۔۔"

ان رئیس زادے نے باپ سے شراب کے لئے جن الفاظ میں روپے منگوائے ہیں، وہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں :-

"ہندوستانی لباس سے اس سرد ملک میں اعضائے اندرونی و بیرونی کی پوری حفاظت بھی نہیں ہو سکتی۔ فقط لباس سے کیا خاک حفاظت ہو، اگر غذا گرم نہ کی جائے اور عمدہ عمدہ ولائتی عرق کا استعمال نہ ہو۔ کیونکہ مزدور تک تو پانی پینا حرام جانتا اور بیر یعنی جو اتہ اور دشتی جو کا مرکب، عرق کشیدہ پیتا ہے۔ اسی کو آپ لوگ اپنے خیالات کے مطابق بیر شراب کہتے ہیں۔ اور اس بارے میں آپ لوگوں کا سارا ایمان خانساماں لوگوں کے قول پر ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہہ دیا، وہ ہندوستانیوں کے لئے وحی آسمانی ہے۔ یہاں آنے کے تھوڑے روز بعد میری طبیعت بدمزہ ہو گئی تھی، میں نے فوراً ڈاکٹر لیکنگ کو بلوایا۔ انہوں نے دوا بھی دی اور مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر میں روز چار پائنٹ (یعنی نابالغ بوتل) کلاریٹ سے کم پیوں گا، تو ناگہاں مر جاؤں گا۔ اب مجبوری سے مجھے کلاریٹ کا عرق پینا پڑتا ہے۔ اس خرچ کا حساب بھی وہاں نہ ہوا تھا۔ ضرور ہے کہ اب جو آپ ایجنٹ کے نام خط لکھیں، اس میں اس خصوص میں ایک عام ہدایت فرما دیں کہ میری حفاظت جسمانی میں بصلاح اطبا جو خرچ ہو، اس کا بل وہ پاس کر دیا کرے"۔

اسی طرح باپ کے نام کے اسی خط میں ناچ سیکھنے کا تذکرہ دیکھئے :

"پرسوں ایک رئیس کے مکان میں جلسہ تھا، وہاں میں بھی گیا تھا۔ میری جان پہچان کی ایک میم نے مجھ سے ناچنے کو کہا۔ اور اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ ناچوں۔ مگر میں نے شرمندہ ہو کر انکار کیا۔ وہ کب مانتی تھی۔ مجبوری سے اس سے لپٹ کر کودنا، تڑپنا اور اچکنا پڑا۔ چونکہ میرا پاؤں بے قاعدہ پڑتا تھا، اس سے بڑی ہنسی ہوئی۔ اور بعض طبیعت دار میموں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اور بعض مسخرے صاحبوں نے ہرا دیا۔ دوسرے روز مجھے ایسی ندامت ہوئی کہ میں علی الصباح ایک ناچ سیکھنے کے اسکول میں چلا گیا۔ اور ایک ہفتے کے دو پونڈ دے کر اپنا نام لکھوایا۔ اب میں ناچ کی بھی تعلیم پا رہا ہوں اور بعنایت ایزدی میرے پاؤں خوب اچھی طرح پڑنے لگے ہیں اور اسکول میں میری بڑی تعریف ہے اور میرے ہم درس طلبا مجھے "برہما پرنی" کہتے ہیں۔ اور یہ نام مشہور ہوتا جاتا ہے۔ اس سے یہ غرض نہیں کہ میں جانور ہوں، بلکہ میری قدم بازی کی پرلے سرے کی تعریف ہے"۔

آپ نے ملاحظہ کیا۔ کیسا حسین اور شوخ طنز ہے! ۔ اشاروں کنایوں میں کتنی چیزوں پر چوٹ کر گئے ہیں! ایسے ہی انداز انداز نگارش کی بلاغت ایک اور جگہ دیکھئے۔ باپ کے خط کی رسید میں یہی رئیس زادہ لکھتا ہے :

"مائی ڈیر پاپا! — دو دو ہاتھ کے القاب و آداب لکھنے اور بیش قیمت وقت ضائع کرنے کی فرصت نہیں۔ اسی وجہ سے حضور کے سرفرازناموں کے پڑھنے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ خرچ وغیرہ کے مضامین پڑھ کر ان کو بکس میں بند کردیتا ہوں۔ مہینے دو مہینے بعد فرصت میں اور مضامین (جن کو حضور ضروری جانتے ہیں اور جن سے میرا وقت برباد ہوتا ہے) دیکھتا ہوں۔ حضور کے سرفرازناموں میں نہ تو کہیں امورات تمدن پر رائے زنی ہوتی ہے، نہ کسی مسئلہ اخلاقی پر بحث، نہ گورنمنٹ کی کا۔ وائی پر نکتہ چینی، نہ جنگ کابل کا حال . . . میں حضور کے سرفرازناموں کو اس طرح چھپاتا ہوں جیسے عورت عمر یا مبروص داغ کو۔ کیونکہ خدانخواستہ اگر حضور کا غیر مہذب مراسلہ یہاں کسی کے ہاتھ پڑ جائے، تو پھر میرا لندن میں رہنا مشکل ہو جائے۔ اور شاید فرط غیرت سے میں خودکشی کرلوں۔"

لندن کے قیام کا اب پورا پورا اثر نظر آتا ہے۔ اس سے کسے انکار ہوگا کہ آزاد نے حقیقت حال کو کس حسن و خوبی کے ساتھ آشکار کیا ہے۔ اور طنز کے کیسے زہریلے نشتر جمع کر دیئے ہیں!!!

آزاد کے مجموعے میں خطوط کے بعد مختلف مضامین نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ لذت و ندرت رکھتا ہے۔ "مولانا آزاد کا خمارستان کا ڈنر" ان کی عجیب و نادر ایجاد ہے۔ یہ چیمبر آف کامرس کے سالانہ جلسوں کا خاکہ ہے۔ تحتی عنوان یہ ہے:۔ "خمارستان کے تہذیب یافتہ مدکیوں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر"۔ اس کے بعد "روئیداد" کے ذیل میں شرکا کی فہرست اس طرح درج کی گئی ہے:۔

حاضرین نکہت قرین

مسٹر بینک الدولہ	——	چیئرمین
چسکی الملک	——	گورنر صوبۂ تریاک آباد
مرزا خمار بیگ	——	راقم نوجو گزٹ
میر مہرو خاں	——	منڈا لین ٹانگ کانگ
سید بانبو جنگ	——	کمانڈر انچیف افواج نعفوریہ
دھواں دھار خاں	——	انسپکٹر جنرل چانڈو خانہ جات

ایسے جلسوں کی تعریف میں مشہور ہے "نشستند و گفتند و برخاستند"، لیکن آزاد نے شرکائے محفل کو جس عنوان اور جیسے ناموں کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ یقیناً اس مشہور مقولے سے بہت زیادہ تعریف کے مستحق ہوں گے!۔ چنانچہ ارکان مجلس اور صدر محفل کی تقریریں خمارستان کے مخمور شرکا کی ذہنیت کی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔ اور آزاد کی شگوفہ کاری اور چٹکیوں گدگدیوں کے سبب چنڈو بازوں اور مدکیوں کی خرافات کو شرماتی ہیں۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ایسے نازک بیانات میں بھی ان کا دامن ابتذال سے دور رہتا ہے۔

آزاد کا سفرنامہ بھی انوکھی چیز ہے۔ خطوط کی طرح یہ سفرنامہ بھی بغیر سفر کیے لکھا گیا ہے جس میں آزاد کے تخیل نے طرفہ گلکاریاں کی ہیں۔ مگر بقول شہباز کے "سفرنامہ مولانا آزاد افسوس کہ ناتمام رہا ورنہ اپنی نظیر آپ ہی ہوتا۔ پھر بھی جس قدر ہے کحل الجواہر بصر ہے"۔ زیر نظر مضمون اس سفرنامے کی پہلی قسط ہے۔ جس میں ہندوستان سے سوئیٹزر تک پہنچنے کا حال درج ہے۔ "ایک" دقیانوسی اور متعصب پرانے اسکول کے ایک ستون اعظم" کو ولایت جانے کا شوق چراتا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر ہے۔ اعضا قوائے جسمانی مضمحل ہو چکے ہیں لیکن

"سفرِ یورپ کے عشق" کی دیوانگی کی بدولت وہ "اپنی غذا کا ہفتہ وار بندوبست" کرتے ہیں۔ اور ایک انگریزی ہوٹل میں دو وقتہ آنا جانا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ "چھ ہی مہینے میں بعنایت ایزدی ایسی طاقت آئی کہ تمام جھریاں غائب ہوگئیں۔" اور ڈاکٹر نے امتحان کر کے سفرِ یورپ کی اجازت دے دی۔ انگریزی کمپنی کے جہاز کے سفر میں اس طرح کے مسافر کو جو دشواریاں پیش آنی چاہئیں، ان کا تصور آسان ہے۔ لیکن ان معمولی باتوں کو بھی آزاد کے قلم کی تندی و شوخی نے چار چاند لگا کر پیش کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کوا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ جہاز میں یہ "ساٹھ سالہ جوان" پہلا کھانا کھانے کے بڑے کمرے میں پہنچتے ہیں۔

"جب کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ پھر تو چھری کانٹے اس سرعت اور صفائی سے چلنے لگے کہ گوروں کی سنگین اور کابلیوں کی تلوار کی کاٹ یاد آگئی۔ اس وقت میں نے اپنی تہذیب کی حفاظت کی بجز اس تدبیر کے، جو اکثر رندان خانہ خراب عید اور جنازے کی نماز میں کرتے ہیں، یعنی کنکھیوں سے دوسروں کی طرف دیکھتے جاتے ہیں، اور جتنی مرتبہ تکبیر میں ان کو ہاتھ اُٹھاتے دیکھتے ہیں، اتنی ہی مرتبہ آپ بھی ہاتھ اُٹھاتے ہیں، اور کوئی معقول اور کارآمد تدبیر نہیں دیکھی۔ پس اس عمدہ اصول کو آغوش خیال میں دبا کر کھانے لگا۔ مگر خلافِ معمول جلدی جلدی تیز چھری کانٹے سے کام لینے میں زبان اور لبوں پہ بڑی آفت آئی۔ اور کھانا تمام ہونے کے قبل میری زبان کی وہ کیفیت ہوئی جو مربے کے آموں کی شیرے میں ڈالنے کے قبل کانٹوں سے ہو۔ اب مصیبت کا وقت آگیا۔ وہاں تو مچھلی تقسیم ہو رہی ہے، یہاں میں ابھی مٹن چاپ کو کانٹے سے گرفتار کر کے محبس دہن میں ڈال نہیں چکا۔ وہاں کاری بھات برتنوں میں چمچے اور کانٹے سے سٹا سٹ اڑ رہا ہے اور میں ہوں کہ مچھلی کے ٹکڑے کے پیچھے برتن پر کانٹے کو اس تیزی سے دوڑا رہا ہوں کہ گیا سرکاری سوار ایوب کی فوج کا پیچھا کریں گے، مگر وہ ٹکڑا ہے کہ کسی طرح ہاتھ نہیں لگتا۔"

اس چھوٹے سے اقتباس میں چار مرکب تشبیہیں اور تمثیلیں جمع ہوگئیں جن کی ندرت و جدت، اور اچھوتے پن نے مزاح کی چاشنی اور طنز کی گہرائی کو بے پناہ کر دیا ہے۔

"روئداد اجلاس جنجال کونسل" پھر ایک نئی چیز ہے۔ اور آزاد کی جدت پسند طبیعت نے یہاں بھی ان سے انوکھی طنز میں ترشوا دی ہے۔ روداد اجلاس کا خلاصہ ان تحتی عنوان میں کر دیا گیا ہے "منتخب شدہ ممبروں نے ذیل کے سوالات کئے، جن کا جواب سرکاری ممبروں نے قاعدے کے موافق دیا۔" سچ پوچھئے تو اس بلیغ فقرے میں سبھی کچھ آگیا۔ آنریبل ممبران کے نام بڑے دلچسپ اور معنی خیز ہیں مثلاً "آنریبل مسٹر ٹینی پرشاد۔ آنریبل مسٹر شارپ۔ آنریبل بابو بگلا چرن داس۔ آنریبل مسٹر فاکس۔ آنریبل مسٹر ہٹ بونگ میونسپل سکریٹری۔ آنریبل مسٹر مفرامن الدین احمد خان۔ آنریبل مہاراجہ بدھل چند داس۔ جنجال کونسل میں ایسے اسم بامسمّٰی سرکاری ممبروں کی طرف سے قومی ملکی اور معاشرتی مسائل کے جوابات، خواہ سوال کیسے ہی اہم کیوں نہ ہوں، جیسے کچھ ہونے چاہئیں، ان کا ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ آزاد نے ان جوابوں کو زیادہ شوخ اور چٹپٹا بنا دیا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ مگر۔ شب آخر می شد و افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اس لئے اختصار کی خاطر اب میں "خیالات آزاد" کے آخری مضمون پر آجاتا ہوں۔ عنوان ہے "گرما گرم تار کی خبریں"۔ یہ سب خبریں یورپ کے مختلف اہم سیاسی مرکزوں سے موصول ہوئی ہیں۔ اور ان میں اس وقت کے اسلامی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات پر شگفتہ چھینٹیں اور گہری چوٹیں ہیں۔ اور خاص طور پر "یورپ کے مردِ بیمار" (ترکی)۔ جنگ بلقان۔ اور سوڈان کی جنگ آزادی کے بارے میں مسیحی حکومتوں کے

روپیے پر شوخ طنز ہیں۔ بعض خبروں میں سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

"ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار کو معتبر سفارتی ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ سلطان نے جبل الخطر سے باشی بزوقوں کی ایک نا فرجام اور خوں آشام، وحشی سیرت جماعت کو اس غرض سے جلد طلب کیا ہے۔ کہ ان مردم آزار و خونخوار بھیڑیوں کو کریٹ کے معصوم مظلوم مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ عیسائیوں پر چھوڑ دے۔ اس خبر کے پھیلنے سے یورپ کے تمام تہذیب یافتہ حلقوں میں نہایت تشویش پھیلی ہوئی ہے۔"

"تاریخ ۲۴ مارچ۔ لندن۔

ڈیلی ہیرالڈ کے تار مطبوعہ مارچ تاریخ ۲۱ کے دیکھنے کے بعد سے مسٹر گلیڈسٹون کی حالت صحت بہت نازک اور مخدوش ہو رہی ہے۔ دو شب سے ان کو مطلق نیند نہیں آئی۔ اور ایک سرسامی حالت میں بعض اوقات مبتلا ہو کر زیرِ لب سلطان کی نسبت کچھ لعن طعن اور گریس کے حق میں دعا کرلیتے ہیں۔ اور وزارت سے اپنی معزولی پر اکثر آہ سرد بھرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اس مرض کو ہنگیرین ہذیان بتایا ہے۔ اور مذہبی جوش، انسانی ہمدردی، اور مسلمانوں کی فطرتی عداوت کو اس کی اصل وجہ کہتے ہیں"

"تاریخ ۲۷ مارچ۔ ایتھنس۔

جنرل ڈفلونی کو جو بلیک ایگل کا تمغہ زار نے دیا تھا، اس کو انہوں نے اظہار ناراضامندی قومی اور حقارت روس کے خیال سے اپنے مکان میں سنگ فرش بنایا ہے۔ اور ان کے ڈرائنگ روم کے قالین کے کنارے وہ ایک نمایاں مقام پر دھرا رہتا ہے"

"تاریخ ۲۹ مارچ۔

لندن میل کو اپنے خاص نامہ نگار مقیم ہندوستان سے معلوم ہوا کہ مسلمانان ہند معاملات مشرقی سے مطلق دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ اور ان کو شاید اس کی بھی خبر نہیں ہے۔ کہ آج کل کون سلطان ٹرکی ہے۔ چند ہندوستانی نابکار اور بے وقعت مسلمان اخبار سلطان کو غلط طور پر اپنا خلیفہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ کل شیعہ سلطان کے جانی دشمن ہیں۔ اور متعصب سنی نہایت حقارت سے ان کو یاد کرتے ہیں"

"وائنا۔ ۸ تاریخ۔

ڈاکٹر ریورینڈ کلیفالڈ (جو کہ مشرقی یورپ میں ایک مشہور زوالوجسٹ ہیں) نے نہایت تحقیق سے دریافت کیا ہے کہ یوریپین کنسرٹ ایک قسم کا عجیب وغریب جنگلی بلاؤ ہے جس کی آواز نہایت سامعہ خراش ہوتی ہے۔ اور جو چند گزشتہ سالوں سے کثرت سے یورپ کے پہاڑوں پر پیدا ہونے لگا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ بہت غور کرنے سے یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ یہ لنکا کے اس تاریخی اور مذہبی بندر کی نسل سے ہے، جس کا ذکر ہندو مذہبی تاریخ میں بہت ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ اس جانور کی دم قدرتی طور پر اس قدر چکنی ہے کہ اس کا پکڑنا بہت مشکل ہے اور بغیر دم کے پکڑے یہ قابو میں نہیں آتا ہے ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے بار بار لارڈ سالسبری کا ہاتھ خالی پڑ رہا ہے اور اب تک اس کی تمدنی چکنی دم ان کے ہاتھ نہ لگی۔"

یہ ظرافت و شوخی، یہ طنز و مزاح، اور یہ فقرے اور چٹکلے کسی تفسیر کے محتاج نہیں۔ مگر آزاد کی کامیاب فنکاری اور ساحرانہ اعجاز بیانی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ اودھ پنچ کا یہ رتن، اور اہل زبان سے خراج تحسین لینے والا یہ انشا پرداز اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا جس کو عام طور پر اردو کا مرکز نہیں سمجھا جاتا۔ مگر مشرقی بنگال کے آغوش میں پل کر بھی اسے دنیائے ادب میں وہ بلند مقام حاصل تھا، کہ ہم ہمیشہ اس کا نام عزت و احترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہوں گے۔ "جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔"

اشارہ یا استعارہ

ڈاکٹر شوکت سبزواری

تنقید میں اصطلاحات کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ خصوصیت سے اُردو تنقید میں جو اپنے پھیلاؤ اور نئے پن کے باوجود ابھی خام و ناتمام حالت میں ہے اور ترقی کی ابتدائی منزلوں سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ عام طور سے تنقیدی بحثوں کے سلسلے میں جو اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں ایک طرف ان کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ ان پر ایک دھندلکا سا چھایا رہتا ہے۔ دوسری طرف ان کا مفہوم جو ایک نقاد کے ذہن میں ہوتا ہے اکثر حالات میں اس سے مختلف ہوتا ہے جو دوسرے نقاد کے ذہن میں ہے۔ اس لئے تنقیدی مباحث میں سخن گسترانہ باتوں کی گنجائش نکل آتی ہے اور سلجھاؤ کی جگہ الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تنقید کوئی منضبط اور مرتب فن نہیں۔ جیسے منطق، فلسفہ، تاریخ، قانون، حساب، ہندسہ وغیرہ ہیں۔ ان علوم کی اپنی اصطلاحیں ہیں۔ جب کوئی ان علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو پہلے ان کی اصطلاحیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا ہے اس کے بعد آگے قدم بڑھاتا ہے۔ تنقید کی اپنی کوئی اصطلاح نہیں دوسرے علوم و فنون سے درآمد کر لی گئی ہیں۔ ہر چند یہ اصطلاحات ان علوم کی کتابوں میں واضح تھیں لیکن تنقیدی مباحث میں ان کی تشریح نہیں کی گئی تھی اس لئے تنقید پڑھنے والے کے لئے جو ان علوم کو نہیں جانتا یہ معمّا بنی رہیں۔ دوسرے ان اصطلاحات کا مفہوم ان علوم میں جہاں سے انہیں درآمد کیا گیا کچھ اور تھا ادبی تنقید میں کچھ اور ہے۔ فارم، رنگ، ڈیزائن، پس منظر وغیرہ الفاظ ادبی تنقید میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ادب کے سلسلے کے نہیں مادی فنون کے ہیں جہاں سے انہیں ادب میں مستعار لے لیا گیا ہے۔ ادب میں ان کا مفہوم وہ نہیں جو مصوری اور سنگتراشی وغیرہ فنون میں ہے۔ اصطلاحات بھی الفاظ کی طرح ہیں۔ الفاظ جتنے زیادہ استعمال کئے جائیں اتنے ہی زیادہ منجھتے اور نکھرتے ہیں۔ اصطلاحات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ بھی کثرت استعمال سے اُجاگر ہوتی ہیں۔ لیکن جدید ادبی تنقید چونکہ حال کی پیداوار تھی۔ اس لئے تنقیدی اصطلاحات کثرت استعمال اور کثرت رواج سے نہ منجھ سکیں۔ ان پر تاریکی و باریکی کا پردہ پڑا رہا۔ اصناف ادب میں سے شاعری اور ڈراما البتہ قدیم ہیں۔ یونانی اور ہندی قدیم زمانے ہی میں ان کے متعلق تنقیدی اصول وضع کر چکے تھے۔ ناول جدید صنفِ ادب ہے۔ اس پر حال میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ ناول کی ساخت و پرداخت پر جن نقادوں نے غور کیا ہے انہیں شدت کے ساتھ اس کا احساس ہے کہ ناول کی تنقید کے سلسلے میں استعمال ہونے والے الفاظ و اصطلاحات غیر واضح ہیں۔ پرسی لبک نے تو یہاں تک لکھا ہے، کیا اچھا ہوتا اگر ناول کا آغاز سو سال بیشتر ہی ہو گیا ہوتا۔ اس صورت میں سترھویں صدی عیسوی کے اساتذۂ نقد کے ہاتھوں اس کے اصول بھی وضع ہو جاتے اور اصطلاحات بھی نکھر جاتیں۔ عہد رومانس یا اس سے کچھ پہلے کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ناول صدیہ فیصلے کی صحت اور وضاحت سے محروم رہا انگریزی

ناول کی یہ بڑی بدقسمتی ہے۔

اردو تنقید کی بدقسمتی انگریزی ناول کی بدقسمتی سے کہیں زیادہ ہے۔ اردو تنقید کا سرمایہ دو قسم کا ہے جدید اور قدیم۔ جدید سرمایہ جدید تنقیدی اصطلاحات پر مشتمل ہے ایک عام تنقید پڑھنے والے کے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ اس لئے کہ وہ حالی کی پیداوار ہے مستعمل اور متداول نہ ہونے کی وجہ سے چکنا سڈول، نرم اور چمک دار نہ بن سکا۔ اور قدیم سرمایہ قدیم ہونے کی وجہ سے ناقابلِ توجہ ہے۔ تنقید کے لئے اس کا مطالعہ ضروری نہیں۔ ایک عام نقاد اس سے بے خبر رہ کر بھی کام چلا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا اردو تنقید کی افادیت پر بہت برا اثر پڑا ہے۔

(۲)

استعارہ اور اشارہ ادب کی تنقید میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ استعارہ قدیم اصطلاح ہے۔ عربی، فارسی، اردو کے کلاسیکی ادب میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔ اشارہ البتہ جدید اصطلاح ہے۔ یہ انگریزی لفظ Symbol کا ترجمہ ہے۔ علامت، رمز، ایما اس کے مرادفات ہیں۔ اردو کے تنقیدی ادب میں جس طرح یہ دو اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لکھنے والوں کے ذہن میں ان کا کوئی واضح (Definet) اور متعین (Definite) مفہوم نہیں۔ اور اشارے اور استعارے میں فرق بھی نہیں کیا جاتا۔ ان کو باہم خلط ملط کر کے غلط اور گمراہ کن نتیجے نکال لئے جاتے ہیں۔

استعارے کی بنیاد تشبیہ پر ہے جس کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں اور حقیقتوں کے درمیان احساس یکسانی جو ظاہر ہے کسی ایک صفت میں ہوگی یا ایک سے زیادہ صفات میں۔ یکسانی کا احساس قوتِ تخیل سے ہوتا ہے۔ جو فن اور ادب کی روح ہے سائنس اور آرٹ میں مختلف طریقوں سے فرق کیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان کا واضح ترین فرق یہ ہے کہ سائنس کشفِ حقیقت کر کے ان دو چیزوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتی ہے جن کی حقیقتیں مختلف ہیں۔ آرٹ صفات پر نظر رکھتا ہے اور جن دو چیزوں میں یہ صفات مشترک ہوتی ہیں انہیں رشتۂ وحدت میں منسلک کرتا ہے۔ سائنس کا تعلق حقائق سے ہے اور آرٹ کا صفات سے لیکن احساس کی حد تک۔ آرٹ صفات کی ماہیت دریافت نہیں کرتا ان کا احساس دلاتا ہے۔ سائنس کا کام تحلیل (Analysis) ہے اور آرٹ کا تالیف (Synthesis)۔ آرٹ کا تخلیقی عمل تالیف ہی کا شرمندۂ احسان ہے۔ ناول نگار مختلف صفات لے کر ایک کردار میں جمع کر دیتا ہے۔ یہ صفات الگ الگ خارجی دنیا میں موجود تھیں لیکن ان کا اجتماع کسی ایک فرد میں نہیں ہوا تھا۔ فن کار نے یہ کام تخیل کے تخلیقی عمل کے ذریعے انجام دیا۔ یکسانی یا مشابہت کے احساس کی دو چار مثالیں غالب کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ——— جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ——— جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ——— حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

پہلے شعر میں بوئے گل، نالۂ دل اور دودِ چراغِ محفل تین مختلف چیزیں ایک صفتِ پریشانی میں شریک ہیں۔ تینوں پراگندہ خاطر اور پریشاں حال ہیں۔ دوسرے شعر میں جادہ یعنی پٹیا کو جو دور تک لائن کی طرح کھنچی چلی گئی ہے کتابِ دشت کا شیرازہ قرار دیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں نقشِ قدم بلبلے کی طرح ہے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ ظاہر میں اس لئے کہ ابھرے ہوئے نقشِ پا کی شکل پانی کے بلبلے کی سی ہے۔ اور باطن میں اس لئے

کہ حباب موجِ آب کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کبھی ماندہ نہیں ہوتا۔ نقشِ پا رفتار کا رفیق طریق ہے۔ تھک کر کس لئے بیٹھ جائے۔

غالب کے علاوہ اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی شاعرانہ تخیل کے احساس یکسانی کی مثالیں مل جائیں گی لیکن غالب اردو کا فلسفی شاعر ہے۔ اس کے یہاں اس کی مثالیں ہی نہیں بلکہ تخیل کی کارفرمائی کا ذکر بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیٔ ناز　　جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

شاعر کہتا ہے یار کی شوخیٔ ناز دیکھئے کہ اہلِ نظر کو جوہرِ آئینہ اس کے سامنے طوطیٔ بسمل کی طرح تڑپتا پھڑکتا نظر آیا۔

بعض خیالات اتنے باریک و تاریک ہوتے ہیں کہ جب تک کسی محسوس مادی چیز سے تشبیہہ دے کر ان کی وضاحت نہ کی جائے سننے والے کے ذہن میں کوئی روشن تصویر نہیں آتی۔ اکبر نے ذیل کے شعر میں

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر　　مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

لفظوں کو بدلیوں سے اور معنی کو چاند سے تشبیہہ دے کر معنی کی وضاحت کو نور قرار دیا جو بدلیوں سے چھن چھن کر باہر آرہا تھا۔ یہاں تشبیہہ سے توضیح کا کام لیا گیا۔ عام طور سے تشبیہہ توضیح کا کام دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی شاعر تشبیہہ سے توجیہہ کا کام بھی لیتا ہے جو ایک طرح کا فنکارانہ استدلال ہے۔ مثلاً غالب کے مذکورہ بالا شعر میں شاعر نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کتنا ہی ماندہ کیوں نہ ہو اس کے ذوقِ رفتار اسی طرح تازہ رہتا ہے۔ بظاہر یہ بات ناممکن ہے کہ ایک شخص چلتے چلتے تھک نہ جائے۔ پاؤں جواب دے جائیں لیکن شوقِ رفتار بدستور دل میں انگڑائیاں لیتا رہے۔ شاعر نے تشبیہہ کی مدد سے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس کی رفتار سے جو نقشِ قدم اُبھرے وہ موجِ رفتار (رفتار کو موج سے تشبیہہ دی گئی) کے بلبلے تھے نقشِ پا نہ تھے بلبلہ موجِ آب کے ساتھ چلتا ہے۔ مدھم نہیں پڑتا۔ میرا نقشِ قدم موجِ رفتار کا ہم عناں کیوں نہ ہو۔ اس کا ذوقِ رفتار دھیما کیوں پڑے۔ یہ ہے توجیہہ جسے میں شاعرانہ استدلال کہتا ہوں۔ صرف ایک مثال اور

ہوا شاروں کا اگر اہلِ نظر کی تابع　　خلق آنکھوں پہ جگہ دے تجھے ابرو کی طرح

ابرو کو اہلِ نظر جب چاہتے ہیں حرکت میں لے آتے ہیں۔ وہ اہلِ نظر کے چشم و ابرو کے اشاروں پہ رقص کرتی ہے۔ اس سے شاعر نے نتیجہ نکالا کہ ابرو کو آنکھوں پر جگہ شاید اس کی اس صفت کی وجہ سے ملی کہ وہ اہلِ نظر کے اشاروں کی تابع تھی۔ اس لئے جو اہلِ نظر کے اشاروں کا تابع ہوگا اسے چشم و ابرو پر جگہ دی جائے گی۔

(۳)

اس منزل پر پہنچ کر منطقی استدلال کی نوعیت واضح ہو جانی چاہیئے تاکہ اس کی روشنی میں شاعرانہ استدلال کو سمجھا جا سکے۔ عام طور سے استدلال کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ قیاس جسے انگریزی میں Deduction کہتے ہیں اور استقراء جس کا انگریزی ترجمہ Induction کیا گیا ہے (اُردو کے بہت سے نقاد جو عربی علوم و فنون سے ناواقف ہیں Deduction کو استخراج اور Induction کو استنباط کہتے ہیں۔ حالانکہ عربی میں استنباط اور استخراج ہم معنی الفاظ ہیں) قیاس یہ ہے کہ عام کلیہ کے ماتحت کسی جزئی کو رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ استقراء میں بہت سی جزئیات کو دیکھ کر کلیہ قائم کیا جاتا ہے۔ قیاس کا عمل استقراء کے عمل کے خلاف اور اس کے برعکس ہوتا ہے۔ قیاس میں عام سے خاص کی طرف حرکت ہوتی ہے اور استقراء میں خاص سے عام کی طرف۔ استدلال کی تیسری قسم بھی ہے جسے

تمثیل (انگریزی [illegible] سنسکرت اپماہرن) کہتے ہیں۔ ارسطو نے منطقیات میں استدلال کی اس تیسری قسم کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہندی فلسفے نظامہائے شستگانہ کی بنیاد و اساس یہی استدلال ہے۔ نیائے اور ویشیشک میں جہاں استدلال پر بحث کی گئی ہے اپماہرن کو واضح ترین قسم بتایا گیا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو قیاس کوئی مستقل اور آزاد طریق استدلال نہیں۔ اس کی بنیاد استقراء پر ہے۔ کوئی کلیہ ایسا نہیں جو ذہن میں خود بخود اُبھر آئے۔ کلیے جزئیات کو دیکھ کر وضع کئے جاتے ہیں۔ ان کا ماخذ حواس کی فراہم کردہ اطلاعات ہوتی ہیں۔ مثلاً ہر متغیر حادث ہے۔ یا ہر مادی چیز اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے کلیے ہیں۔ اس قسم کے کلیے قیاس کے مقدمات میں سے بڑا مقدمہ (کبری یا Major Feenuux) بنتے ہیں۔ یہ کلیے خود بخود انسان کے ذہن میں نہیں آئے۔ انسان کے ذہن نے انہیں اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک بہت سی نت نئی بدلنے والی چیزوں کو مٹتے فنا ہوتے یا بہت سی مادی چیزوں کو اوپر سے نیچے کی طرف گرتے اس نے نہیں دیکھ لیا۔ یہ استقراء ہے۔ قیاس استقراء سے غذا حاصل کرتا ہے۔ استقراء پر مبنی ہونے کی وجہ سے قیاس کا درجہ استقراء کے بعد ہے استدلال کا پہلا قدم استقراء تھا۔ دوسرا قدم قیاس ہے۔ لیکن تمثیل استقراء کی طرح مستقل اور آزاد طریق استدلال ہے۔ استقراء پر اس کا دار مدار ہے نہ قیاس پر۔ بلکہ یہ ان دونوں سے ممتاز ہے۔ اس میں ایک جزئی کو دیکھ کر کسی مشابہت یا یکسانی کی بنا پر دوسری جزئی کی بابت فیصلہ کیا جاتا ہے۔ استقراء میں حواس سے کام لیا جاتا تھا۔ قیاس میں عقل سے کام لیا گیا اس لئے کہ فیصلہ عقل کا فعل ہے تمثیل تخیل (Imagina-tion) کی کارفرمائی ہے یا وہم (Phantacy) کی۔ سائنس کی بنیاد حواس پر ہے۔ فلسفہ کی عقل پر۔ فن کی تمثیل یا توہم پر۔ سائنس مشاہدہ ہے۔ فلسفہ استدلال ہے اور فن تمثیل۔ صرف ایک مثال اور۔

مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز نادان ہے کواڑ ہٹائے جو چول سے

مذہب قوم کے لئے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب اور قوم کا رشتہ چول اور کواڑ کا سا ہے۔ اگر چول نکال لی جائے تو کواڑ حرکت نہ کر سکے گا۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ قوم کی زندگی سے مذہب خارج کر دینے کے بعد قوم محفوظ نہیں رہتی۔

ہندی نظام فلسفہ میں تمثیل سے قیاس و استقراء کا کام لیا گیا تھا۔ اس سے ہندی فکر کی سادگی اور کود کی ظاہر ہوتی ہے لیکن تمثیل پر شاعرانہ استدلال کی چھاپ بھی ہے۔ ہندی فلسفے میں اس کا استعمال جہاں ذہن ہندی کی سادگی کی چغلی کھاتا ہے۔ وہاں اس کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی اس سے اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ شعر کا تعلق تخیل سے ہے اور تمثیل تخیل کی کارفرمائی ہے۔ اردو اور فارسی شعراء نے اکثر تخیل سے کام لیا ہے۔ صائب تمثیل کا بادشاہ تھا۔ اس کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے تمثیل کو حسن و خوبی سے برتا۔ تمثیل تشبیہہ ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ ایک تشبیہہ ہے جس میں وجہ شبہ ذرا پیچیدہ قسم کی ہوتی ہے۔ تمثیل دو طرح کی ہے۔ تمثیل تشبیہہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ تمثیل استعارہ یا اشارہ جسے انگریزی میں Allegory کہتے ہیں۔ اس پر بحث کرنے سے پہلے تشبیہہ اور استعارہ کا فرق واضح ہو جانا چاہیئے۔ تشبیہہ اور استعارہ کا اصلی اور بنیادی فرق تو یہ ہے کہ تشبیہہ حقیقت ہے اور استعارہ مجاز۔ تشبیہہ میں مشبہ بہ کے اصلی یعنی وضعی معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ استعارے میں مشبہ بہ (مستعار منہ) مشبہ (مستعار لہ) کی جگہ اور اس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا مشبہ کے لئے مشبہ بہ مستعار لیا جاتا ہے۔ (اسی لئے اسے استعارہ کہتے ہیں) استعارے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صرف مشبہ بہ (مستعار منہ) کا ذکر ہوگا۔ مشبہ مذکور نہ ہوگا۔ میر انیس کا شعر ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

یہاں شیر سے حضرت امام مراد ہیں۔ لفظوں میں ان کا ذکر نہیں صرف شیر کا ہے جس کے اصلی معنی یعنی درندہ بھی مراد لئے جا سکتے تھے لیکن رن میں آمد ایک ایسا قرینہ ہے جو مجبور کرتا ہے کہ ہم شیر کے اصلی معنی مراد نہ لیں۔

(۴)

قیاس استقراء کا اگلا قدم تھا۔ استعارہ تشبیہہ کا دوسرا قدم ہے۔ تشبیہہ کی حد تک مشبہ اور مشبہ بہ جُدا جُدا دو حقیقتیں تھیں۔ شاعرانہ تخیل نے ان میں وحدت کے جلوے دکھائے۔ استعارہ میں مستعار لہ اور مستعار منہ مل کر ایک حقیقت بنی۔ تشبیہہ دو قالب و یک جان کی مثال تھی۔ استعارہ یک جان و یک قالب کی مثال ہے۔ تشبیہہ کی منزل میں قالب کی دوئی قائم تھی۔ استعارے تک پہنچتے پہنچتے یہ ظاہری دوئی بھی نہ رہی۔ تشبیہہ واضح تھی۔ استعارہ جہاں وحدت کا جلوہ تھا غیر واضح تھا۔ اس لئے ایک قرینے کی ضرورت پیش آئی جو ہمیں یہ بتائے کہ دو قالب و دو جان تخیل کی کارفرمائی سے یک قالب و یک جان ہو گئے ہیں۔ غالب کا شعر ہے۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز　　چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یہاں آئینہ سے دل مراد ہے۔ دل اور آئینہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ تزکیہ و طہارت کے بعد دل جلا یافتہ آئینہ کی طرح چمک اُٹھتا ہے۔ اور رخِ یار کی جھلک اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دل کی صفائی کے لحاظ سے شاعر نے پہلے دل اور آئینہ کو واحد فرض کیا۔ اس کے بعد دل کو آئینہ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ جتانے کے لئے کہ آئینہ سچ مچ کا نہیں دل کا آئینہ ہے کوئی قرینہ ہونا چاہیئے تھا تاکہ کسی کو شاعر کا مطلب سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس شعر میں چاک اور گریباں قرینے ہیں۔ یہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ آئینہ سے دل کا آئینہ مراد لیں۔ یہ استعارہ ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اس میں تشبیہہ ہے۔ اس لئے کہ آئینہ کے ساتھ یہاں مشبہ یعنی دل بھی مذکور ہے۔

مستعار منہ مستعار لہ کی جگہ اور اس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ اگر کوئی ایسا لفظ نہ ہو جو ہماری رہنمائی کرے اور ہمیں یہ بتائے کہ مستعار منہ اپنے اصلی معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مستعار لہ کی نمائندگی کر رہا ہے تو ہم اس کے اصلی معنی مراد لیں گے اور شاعر نے جو بات بتانی چاہی تھی۔ جس حقیقت کا اظہار مقصود تھا اس کے سمجھنے اور دریافت کرنے سے قاصر رہیں گے۔ وہی آئینہ والی مثال لیجیئے۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

یہاں آئینہ تمثال دار شاعر کا دل ہے جس میں پرتوِ رخِ یار نظر آتا ہے۔ لیکن شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو ہمیں یہ بتائے کہ آئینہ تمثال دار سے شاعر نے اپنا دل مراد لیا ہے۔ سچ مچ کا شیشہ بھی مراد ہو سکتا ہے جس پر شاعر کے محبوب کی تمثال یا اس کا خاکہ کھینچ دیا گیا ہے۔ (خلکے کی وجہ سے شیشہ کو آئینہ کہا جا سکتا ہے) پھر دل مراد لینے کے لئے ہم کیوں مجبور ہیں؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس شعر میں آئینہ بطور اشارہ استعمال ہوا ہے۔ اشارے کی صورت میں لفظی یا خارجی قرینے کی ضرورت نہیں۔ استعارے کی طرح اشارہ بھی ایک طرح کا مجاز ہے۔ استعارے میں مستعار کے دو معنی ہوتے ہیں حقیقی اور مجازی۔ اشارے میں بھی لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ استعارے میں لفظ مستعار کے حقیقی معنی نظر انداز کر کے مجازی معنی لئے جاتے ہیں۔ اشارے میں اصلی معنی کی جگہ اشاراتی معنی مراد ہوتے ہیں۔ استعارے میں اس کا خارجی قرینہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر نے

لفظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیئے۔ اشارے میں خارجی قرینہ نہیں ہوتا۔ اشارے اور استعارے میں صرف اسی قدر فرق ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ اشارے میں اگر کوئی قرینہ نہیں ہوتا تو لفظ کے اصلی قدیم معنی مراد لینے سے کون سی چیز ہمیں باز رکھتی ہے؟ اشارے میں لفظی یا خارجی قرینہ نہیں ہوتا، ذہنی یا داخلی قرینہ ہوتا ہے۔ شاعر اور اس کے سننے والوں میں ایک سمجھوتا سا ہوتا ہے کہ جب شاعر مثلاً آئینہ کہے تو اس کی مراد حلبی شیشہ نہ ہو شاعر کا دل ہو۔ یا جب قاتل کہے تو خونی مراد نہ ہو محبوب ہو۔ میرزا مظہر جانجاں کا شعر ہے۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو　　　یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے تو کسی کو تشویش لاحق نہیں ہوتی کہ شہر میں کوئی خونی گھس آیا ہے اور شاعر اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔

اشارے کی صورت میں شاعر اور قاری کے درمیان مفاہمت یا کالنگ وڈ کے لفظوں میں معاہدہ (agreement) ضروری ہے۔ معاہدہ استعارے کی صورت میں بھی تھا لیکن وہ خارجی معاہدہ تھا یہ ذہنی معاہدہ ہے۔ استعارے میں معہود خارجی کے طور پر لفظ کے مجازی معنی مراد لئے گئے تھے۔ اشارے میں معہود ذہنی کے طور پر لفظ کے اشاراتی معنی مراد ہوئے۔ معہودیت دونوں صورتوں میں ہے۔ ایک جگہ خارجی ہے تو دوسری جگہ ذہنی۔ اس نکتے کو میلارمے۔ بودلیر۔ ورلین وغیرہ شعراء نے جو ادب میں رمز و ایمائی تحریک کے علمبردار تھے۔ نظر انداز کر دیا۔ اشارے کی اشاریت (SUGGESTIVENESS) کو پس پشت ڈال کر وہ ابہام کو لے بیٹھے۔ اور شعر میں تاریکی و باریکی ڈھونڈنے لگے۔ حالانکہ ادب اور فن کی غرض افہام و تفہیم ہے۔ ادب میں جب تاریکی آتی ہے تو افہام و تفہیم خاک میں مل جاتی ہے۔ اردو میں میرا جی اسکول نے قاری کے ذہن سے رشتہ قائم کرنا ضروری نہ سمجھا مفاہمت یا معاہدے کے بغیر انہوں نے اشارات استعمال کئے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ بقول غالب "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"۔ وہ خود ہی کہیں اور خود ہی سمجھ لیں۔

اشارہ استعارے کے بعد کا قدم ہے اور تشبیہہ کے سلسلے کی تیسری اور آخری کڑی ہے۔ اشارہ نئی اصطلاح سہی اس کا مفہوم نیا نہیں۔ وہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا استعارہ ہے۔ اشارات کا استعمال فارسی شاعری میں اس زمانے سے ہے جب صوفی شعراء نے شعر کو جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ صوفی شعراء کے یہاں بڑے نازک اور لطیف اشارے استعمال ہوئے ہیں جن کی وجہ سے فارسی کے صوفی شعراء کی زبان دوسرے شاعروں کی زبان سے مختلف ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے یہاں انیسویں صدی عیسوی کے فرانسیسی شعراء کا سا ابہام نہیں جو شعر کو شعر نہیں رہنے دیتا چیستاں اور پہیلی بنا دیتا ہے۔

(۵)

مولانا روم کے مندرجہ ذیل شعر میں۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

اشارات ہی کا ذکر ہے۔ مثنوی معنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　وز جدائیہا شکایت می کند

اس میں "نے" (بانسری) روحِ انسانی کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا نے اس اشارے کو آخر تک نبھایا ہے اور "نے" کے تعلق سے نیستاں، نفیر، نالہ، نغمہ، دمساز وغیرہ الفاظ جو "نے" کے مناسبات سے ہیں استعمال کئے ہیں۔ مولانا نے اشارات کے استعمال کو شاعری

میں خوشتر بتاتا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ شاعر کے لئے اشارات کا استعمال ناگزیر ہے۔ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ وہ کتاب دل کی تفسیر اشاراتی زبان میں کرے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ رومی اور غالب کے نقطۂ نگاہ کا فرق ہے۔ رومی کا نقطۂ نگاہ حکیمانہ ہے اور غالب کا فنکارانہ۔ رومی نے اشارات کو اظہار حقیقت کا پردہ بنایا۔ معقول کو محسوس کی شکل میں جلوہ دے کر مخاطب کے ذہن سے قریب تر لانا چاہا۔ غالب کے سامنے خود اظہار کا سوال ہے۔ رومی معقول کو اشارات کا سہارا لئے بغیر بھی بیان کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو وہ بیان ہوتا اظہار نہ ہوتا۔ دوسرے فلسفیانہ انداز بیاں ہوتا اور شعر اس کے لئے موزوں نہ تھا۔ نثر کے اسلوب میں اسے بہتر طریقے سے بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے رومی نے اشاراتی طرز اظہار کو واقعاتی طرز بیان سے بہتر بتایا۔ غالب کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یوں تو غالب بھی فلسفی شاعر ہیں، لیکن جیسا کہ میں اپنی ایک مستقل تصنیف میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، غالب پہلے شاعر ہیں اس کے بعد فلسفی۔ غالب نے فلسفے کو فن کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ رومی اقبال کی طرح حکیم پہلے ہیں اس کے بعد کہیں شاعر ہیں۔ اقبال کے یہاں مدارج ہیں۔ رومی کا اوّل سے آخر تک ایک انداز ہے۔ اقبال پر کبھی کبھی فن کا غلبہ بھی ہوتا ہے لیکن رومی حکمت و اسرار کی گہرائیوں سے کبھی نہیں اُبھرتے۔ فن کے تقاضوں کا انہیں دماغ نہیں۔

میں نے کہا تھا کہ غالب کے سامنے اظہار کا سوال ہے۔ یہ بات ذرا تشریح طلب ہے۔ کالنگ وڈ نے لکھا ہے جب تم کسی جذبے کو ظاہر کرنا چاہو تو کسی وضعی لفظ سے ظاہر نہ کرو۔ کیونکہ وضعی لفظ جذبے کو ظاہر کرنے کی بجائے بیان کرتا ہے اور بیان سے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اظہار مخصوص اور معین مفہوم رکھنے والے الفاظ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا اظہار کے لئے تخصیص۔ (Individualiza-tion) ضروری ہے اور کوئی وضعی لفظ ایسا نہیں جس میں تخصیص ہو اور جو متعین یا منفرد مفہوم ادا کر سکے۔ وضعی الفاظ عام طور سے عام مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ مسرت، غم وغیرہ الفاظ وضعی مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں۔ مسرت کے بیشمار درجے ہیں جیسے سفید، سیاہی وغیرہ کے ہیں۔ غم کے درجات کی بھی کوئی حد نہیں۔ اگر کوئی شخص کہے "میں آج مسرور ہوں" تو آپ کیا سمجھیں گے۔ آپ کو کیا علم ہو گا کہ اس کی مسرت کس درجے کی ہے۔ لیکن اگر وہ کہے میں خوشی سے کھل گیا۔ یا جامے میں پھولا نہ سمایا تو آپ کم سے کم خوشی کے درجات جان لیں گے۔ آپ کو علم ہو جائے گا کہ اس کی خوشی کس درجے کی ہے۔ ادب میں چیزوں کا بیان نہیں ہوتا چیزوں کی بابت تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ چیزوں کے نام اگرچہ شروع میں چیز کی صفت کے لئے وضع ہوئے تھے۔ ذات کی بجائے صفت کا نام تھے اور صفت کو ظاہر کرتے تھے لیکن استعمال ہوتے ہوتے وہ چیز کا (اس کی تمام صفات کے ساتھ) نام بن گئے۔ مخصوص صفت کی جگہ چیز کی ذات پر دلالت کرنے لگے۔ مثلاً آئینہ (آہینہ = منسوب بطرف آہن) جیسا کہ غالب نے لکھا ہے اول اول صیقل شدہ پارۂ فولاد تھا۔ ماہ (ما = ناپنا) وقت و ساعت کا حساب لگانے والا آلہ۔ سانپ (سرپ = سرکنا) پیٹ کے بل سرکنے اور چلنے والا۔ آفتاب (تب = چمکنا) چمکنے والا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آج ان الفاظ کے وضعی معنی کون جانتا ہے۔ یہ الفاظ چیزوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان سے بلحاظ صفات چیزوں کی ذات ذہن میں آتی ہے۔ اور چیزوں کی ذات مراد ہوتی ہے۔

ادیب کی بابت میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وہ صفات پر نظر رکھتا ہے۔ چیز اور اس کی ماہیت سے اسے سروکار نہیں۔ صفات بھی دو طرح کی ہیں کچھ ذاتی ہیں اور کچھ عرضی۔ مثلاً نطق یا علم (Logos) انسان کی صفت ہے لیکن یہ ذاتی صفت ہے۔ جس سے انسان انسان بنا۔ ضحک (ہنسنا) بھی انسان کی صفت ہے۔ یہ ذاتی نہیں عرضی ہے۔ انسان ہے ضحک نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ نطق کی طرح ضحک بھی انسان ہی کا خاصہ ہے۔ ارسطو نے اسی لئے انسان کو حیوان ناطق کہا، حیوان ضاحک نہیں کہا۔ بہرحال فنکار چیز کی صفات کو دیکھتا ہے ذاتی ہوں یا عرضی۔ خاص ہوں یا عام۔ صفات کی تقسیم و ترتیب فلسفی کا کام ہے۔ ادیب جذبے یا تاثر کا اظہار چاہتا ہے۔ وہ بقول کالنگ وڈ چیزوں کے رواجی یعنی عرفی نام چھوڑ دینے کے لئے مجبور ہے۔ نام چیزوں کی ذات بتاتے ہیں اور ادب کو ذات سے دلچسپی نہیں۔ نام مردہ اور بے جان علامات ہیں۔ اسے زندہ اور متحرک علامات چاہئیں۔ اظہار کے لئے زندہ علامات اسے خود وضع کرنی پڑیں۔ یہ ایک طرح سے الفاظ کی تخلیق نو ہے۔ حشر و نشر اور حیات تازہ سے بہرہ یاب ہونا ہے۔ مثلاً غالب کے مذکورہ بالا شعر میں آئینہ کی جگہ دل کہا جاتا تو سننے والے کے ذہن میں صنوبری شکل کا گوشت کا لوتھڑا آتا جو انسان کی بائیں پسلی میں کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ اس میں محبوب کی یاد کیسے جاگزیں ہوئی یہ کسی کے سمجھ میں نہ آتا۔ آئینہ تمثال دار کہنے سے شاعر کا مفہوم آئینہ ہوا۔ حقیقت میں دل ٹوٹنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ آئینہ توڑنے کے معنی بھی نکل آئے۔ کالنگ وڈ نے کہا تھا۔ وضعی الفاظ میں تعمیم (Generalisation) ہوتی ہے اور اظہار کے لئے تخصیص ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وضعی الفاظ چیز کی مجموعی صفات پر دلالت کرتے ہیں لیکن جب وہی لفظ کسی دوسری چیز کے لئے استعمال ہو تو اس سے وہ مخصوص صفت مراد ہوگی جو دونوں میں مشترک ہے۔ آئینہ اپنی جگہ شیشہ، قلعی، صفائی، مخصوص لمبائی چوڑائی وغیرہ سب کے لئے موضوع ہوا تھا۔ جب شاعر کے دل کے لئے استعمال ہوا تو اس سے اس کی مخصوص صفت یعنی صفائی مراد ہوئی جو آئینہ اور دل شاعر میں مشترک ہے۔ کالنگ وڈ نے اس کو تخصیص (Individualisation) کہا۔ یہ الفاظ کی تخلیق نو ہے۔ آئینہ اول اول خاص صفت کے لئے وضع ہوا تھا۔ کثرت استعمال سے قلعی شیشے کے ساتھ مخصوص ہوا اور پورے شیشے پر اس کی صفات سمیت بولا جانے لگا اور شیشے کے لئے ایک مردہ علامت بن گیا۔ مردہ اس لئے کہ شروع شروع آئینہ سن کر ذہن میں ایک مخصوص صفت آتی تھی اس کے بعد قلعی شیشے کی طرف ذہن منتقل ہوتا تھا۔ اس میں حرکت تھی جو زندگی کی دلیل ہے۔ لفظ اور اس کے معنی میں ایک قابل فہم رشتہ تھا۔ لیکن اب آئینہ سنتے ہی قلعی شیشے کی صورت ذہن میں آجاتی ہے۔ پہلے صفت کی طرف ذہن منتقل ہوتا تھا اب شروع ہی میں ذات ذہن میں پرتو فگن ہوتی ہے۔ شاعر نے دل کے لئے آئینہ کی علامت وضع کرکے ذہن کے اس عمل کو تازہ کر دیا جو قلعی شیشے کے ساتھ مخصوص ہو جانے کے بعد مردہ ہو گیا تھا۔ آئینہ کہنے سے پہلے اس کی صفت یعنی صفائی ذہن میں آئی۔ اس کے بعد شاعر کے دل کی طرف ذہن منتقل ہوا جو آئینہ کی طرح شفاف اور جلا یافتہ تھا۔ یوں لفظوں کا حشر و نشر ہے جس میں ان کی زندگی کی داستان دہرائی گئی ہے۔ الفاظ چیزوں کی علامات تھے۔ اشارے صفات کی علامات ہیں۔ الفاظ فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اشارے فطرت کے ترجمان ہیں اور ادب فطرت کی عکاسی نہیں ترجمانی ہے۔

(۶)

اشارے سب ایک طرح کے نہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں عمل تخصیص کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تمام صفتی الفاظ جو مفہوم کے

اعتبار سے عام تھے لیکن شعراء نے انہیں کسی فرد واحد متعین کے لئے مخصوص کر لیا اس قسم میں شامل ہیں۔ قاتل، ستمگر، دیوانہ، شیخ، سید، واعظ، جنون وغیرہ الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں۔ ستمگر بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور سرمایہ دار بھی، مزدور بھی اور شاعر کا محبوب بھی لیکن شاعر صرف اپنے محبوب کو ستمگر کہتا ہے۔

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پہ نہ ہوا تھا

یہی حال قاتل، دیوانہ، سید وغیرہ کا ہے۔ آل نبی سبھی سید ہیں۔ اکبر نے خاص طور سے سرسید احمد خاں کو سید کہا۔

ہر قدم ان کا شہید لغزش مستانہ تھا — سر میں تھا سید کے قرآں زیر پا میخانہ تھا

کچھ اشارے ایسے ہیں جو عرف عام میں ایک مفہوم کے لئے خاص تھے۔ شاعر نے کسی دوسرے خاص مفہوم کے لئے انہیں استعمال کیا۔ ان کے اصلی معنی بھی خاص اور معین تھے اشاراتی معنی بھی خاص اور متعین ہیں۔ طائر۔ قفس۔ آشیانہ۔ صیاد۔ عنادل۔ فرہاد۔ پرویز وغیرہ الفاظ عرف عام میں خاص خاص چیزوں کے لئے وضع ہوئے تھے۔ شاعر نے عرفی معنی نظر انداز کر کے ان کے مناسب دوسرے معانی میں ان کو استعمال کیا۔ جگر کا شعر ہے۔

صیاد نے پھونکا تھا عنادل کا نشیمن — صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اس میں صیاد، عنادل، نشیمن اپنے اصلی معانی میں استعمال نہیں ہوئے۔ صیاد استعمار پرست ہے اور عنادل محکوم و مظلوم اقوام اور افراد۔ اقبال کے اس شعر میں بھی صیاد اک اشارہ ہے۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اقبال کا ایک اور شعر ہے۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یہاں کوہکن مزدور ہے اور پرویز سرمایہ دار۔ یہ اقبال کے نئے اشارے ہیں۔

پہلی قسم کے اشارے حقیقت میں اشارے نہیں۔ انہیں اشاروں میں شمار کرنا نہ چاہئے۔ ان میں لفظ مجازی معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ متعدد حقیقی معانی میں سے ایک معنی یا فرد معنی کے ساتھ اسے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ ملک و وطن کی محبت میں از خود رفتگی جنون ہی کی ایک قسم ہے۔ جنون کے بے شمار افراد میں سے ایک فرد ہے۔ علامہ اقبال جب لفظ جنون استعمال کرتے ہیں تو اس میں عمومیت نہیں ہوتی۔ اس کی قسموں میں سے صرف یہی ایک قسم یعنی جنون وطن و ملت مراد ہوتا ہے۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی — ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

میر تقی میر نے جنون سے اس کی دوسری قسم یعنی جنون محبت مراد لی ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — داماں کے چاک اور گریباں کے چاک میں

لیکن اقبال اور میر کے یہاں جنون اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ اشارہ نہیں حقیقت ہے۔

(۷)

اشارہ کو استعارہ سمجھ کر بعض اہل علم نے اردو کے مشہور جدید غزل گو شاعروں پر اعتراض کیا ہے کہ وہ پامال اور فرسودہ استعارے

استعمال کرتے ہیں۔ انہیں نئے خیال انگیز اشارے ایجاد کرنے چاہئیں۔ استعارہ بھی مجاز کی قسم ہے اور اشارہ بھی۔ ماہیت دونوں کی واحد ہے لیکن اشارے میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، لفظی قرینہ نہیں ہوتا اس لئے اگر اس کے استعمال میں سلیقے سے کام نہ لیا جائے تو کلام میں ابہام پیدا ہو سکتا ہے۔ شعر کی فضا پر تاریکی چھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ استعارے نت نئے ایجاد کئے جا سکتے ہیں۔ ہر نیا استعارہ کلام میں تازگی اور شادابی پیدا کرتا ہے۔ لیکن اشارہ جب تک استعارے کی منزل سے نہ گزرلے اشارہ نہیں بنتا اور جب اشارہ بن جاتا ہے تو لفظ کی طرح برابر بنا رہتا ہے۔ لفظوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ جب تک وہ الفاظ ہیں، جب تک ان کے معنی ہیں استعمال کے باوجود ویسے ہی اچھوتے رہتے ہیں۔ یہی کیفیت اشارے کی ہے۔ اشارہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، لفظ کی تخلیق نو ہے اس لئے جب تک اشارہ اشارہ ہے یعنی اس میں ذہنی انتقال کی وہ کیفیت ہے جس کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا۔ جب تک لفظوں کا حشر و نشر اور تخلیقِ نو کا عمل اس کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ جب تک اشارہ اشاراتی مفہوم کے ساتھ خاص ہو کر وضعی لفظ نہیں بن جاتا وہ اچھوتا اور نیا ہے۔ قدیم اشارات کے استعمال سے کلام کی تازگی مجروح نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح شاداب اور پُر بہار رہتا ہے۔

نئے اشارے بھی ہو سکتے ہیں۔ اکبر و اقبال نے کئی نئے اشارے وضع کئے۔ جن کی جڑیں ہماری تہذیبی زندگی میں دُور تک چلی گئی ہیں۔ الفاظ قوم کی تہذیبی زندگی کے ارتقا اور وسعت کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اشاروں میں بھی سماجی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جب تک زندگی ارتقا کی طرف قدم نہ بڑھائے اشارے وجود میں نہیں آتے۔ اُردو کے بعض نوجوان شاعروں نے مغربی شعراء کی تقلید میں جو اشارے وضع کئے ان کا ارتقاء ہماری تہذیبی زندگی کے مطابق اور اس کے ارتقا کے دوش بدوش نہیں ہوا۔ اس لئے ان میں تصور زائی نہیں۔ اشارے میں اگر تصور زائی نہ ہو تو اشارہ نہیں رہتا۔ اس میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سمجھنا پہیلی بوجھنے سے کم نہیں ہوتا۔ میلارمے اور ایلیٹ وغیرہ شعراء کے یہاں ایک طرح کا دھندلکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اشارے تصور زا اور خیال انگیز نہیں۔ وہ زندگی کی آئینہ داری نہیں کرتے پردہ داری کرتے ہیں۔ اشاروں میں وضاحت ہونی چاہیئے۔ تحریک اشاریت کے علمبردار شعراء نے دیکھا کہ ان کے اشارے واضح نہیں تو وہ ابہام کو سراہنے لگے اور اشاریت کو ابہام قرار دے کر انہوں نے کہنا شروع کیا کہ ابہام کے صحیح استعمال سے اشاریت وجود میں آتی ہے۔

استعارے میں لفظ مستعار کا مفہوم اور مقصود متعین یا کالنگ وڈ کے لفظوں میں منفرد ہوتا ہے۔ اس میں عمومیت نہیں ہوتی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل اشارے میں لفظی قرینہ نہ ہونے کے باعث اشارے کا مقصود غیر متعین رہتا ہے سامع جو چاہے اس سے مراد لے۔ اس لحاظ سے اشارے میں عمومیت ہوتی ہے۔ اشارہ ایک طرح سے کلیت (UNIVERSALITY) یا ہمہ گیری کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن یہ عمومیت محل یعنی محل استعمال کی ہے۔ مثلاً جگر کے مذکورہ بالا شعر میں صیاد و عنادل وغیرہ الفاظ کے معانی واضح ہیں لیکن معین نہیں۔ صیاد سے مثلاً انگریز بھی مراد ہو سکتا ہے۔ جس نے مشرقی اقوام کو استعمار پرستی کا شکار بنایا اور ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ اس صورت میں جگر کے شعر میں دوسری بڑی عالمی جنگ کی طرف اشارہ ہوگا جبکہ جرمنی نے لندن پر دھواں دھار بم برسائے تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر نے خاص طور سے لندن پر بم باری کا ذکر کیا ہے۔ صیاد ظالم کی علامت ہے۔ اس سے دنیا کا ہر ظالم مراد لیا جا سکتا ہے خواہ وہ فرد واحد ہو یا پوری جماعت۔ اشارات کے ذریعے شاعر عام حقائق کو واضح انداز میں بیان کرنا چاہتا ہے۔ اگر وضعی الفاظ اختیار کئے جائیں تو حقائق کی نقاب کشائی نہ ہوگی۔ خاص واقعہ کا بیان ہوگا عام حقیقت کا اظہار نہ ہوگا۔ لیکن شعر کی مدح حقائق کا اظہا

ہے۔ مجرد طور سے ہو جیسے غنائی شاعری یعنی اردو غزل میں ہے یا مثالی طور سے جیسے بیانیہ، رزمیہ یا ڈرامے میں۔ اشارات میں عمومیت ہوتی ہے اس لئے بھی اشارات کا واضح ہونا ضروری ہے۔ اشارات واضح نہ ہوں تو اشاراتی شاعری شاعری نہ ہوگی تعمیہ بن جائے گی۔

اشارے اور استعارے مسلسل اور طویل بھی ہوتے ہیں۔ یہ تمثیل کہلاتے ہیں۔ عام طور سے تمثیلیں بطور اشارہ ہوتی ہیں۔ ان میں لفظی قرینہ اس امر کا نہیں ہوتا کہ وہ تمثیلیں ہیں۔ کسی حقیقت کا اظہار تمثیلی انداز میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ بوستانِ خیال کو از اوّل تا آخر بعض اہلِ علم نے تمثیل بتایا ہے اور لکھا ہے کہ میر تقی خیال نے علمی اور مذہبی مسائل افسانے کے رنگ میں بیان کئے ہیں۔ مہا بھارت سنسکرت کا مشہور رزمیہ ہے۔ کہتے ہیں اس کا ایک بہت بڑا حصّہ تمثیلی انداز میں ہے لیکن تمثیل بطور اشارہ ہے اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا پلاٹ اور کردار خیالی یا مثالی ہیں۔ سچا تاریخی واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔

استعارے کی ایک قسم ہے جسے اہلِ بیان نے استعارہ بالکنایہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس میں مستعار منہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی خصوصیات یا مناسبات مذکور ہوتی ہیں۔ جیسے وہ غصّہ سے بھڑک اُٹھا۔ گویا غصّہ آگ ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ استعارہ نہیں ایک طرح کی ذہنی تشبیہ ہے۔ غصّہ کو ذہنی طور سے آگ فرض کر کے اس کی تیزی اور شدّت کو بھڑکنا کہہ دیا گیا۔ استعارے کے سلسلے میں نے اس لئے اس کا ذکر مناسب نہ سمجھا کہ بعض اہلِ علم نے اسے استعارہ نہیں کہا۔

مرقع اکبر تجویدی

سید علی عباس جلالپوری

"رباعیات عمر خیام مصور" کے عنوان سے یہ حسین و جمیل مرقع شرکت سہامی تحریر ایران نے تہران سے شائع کیا ہے۔ اس میں حکیم عمر خیام کی ۷۵ منتخب رباعیات کو ایران کے نوعمر نقاش اکبر تجویدی نے تصویر کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ تصاویر ان کی سہ سالہ محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ راقم الحروف اس مقالے میں حکیم عمر خیام کے فلسفہ حیات کو معرضِ بحث میں نہیں لائے گا کہ اس کا حق مرقع کے مقدمہ نگار نے ادا کر دیا ہے بلکہ ارباب وطن کو ایرانِ جدید کے اس جواں سال اور ہونہار مصور کے فن سے روشناس کرانے کی کوشش کرے گا۔

تاریخ تمدن کے طلبا اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہماری تہذیب کے تار و پود میں ایرانی فرہنگ و تمدن کے عناصر و عوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے فنونِ لطیفہ موسیقی، مصوری، تعمیر، شاعری اور ہمارے تصوف و عرفاں سے لے کر ہمارے ملبوسات، تفریحات، مشروبات و ماکولات اور روزمرہ کی رسوم تک میں ایرانی تمدن کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت اثرات کا کھوج ملتا ہے۔ عنوانِ زیر نظر کی مناسبت سے فنِ مصوری کو لیجئے۔ ہندوستانی آرٹ میں مغل مصوری کو ایک قابلِ فخر مقام حاصل ہے اور یہ مصوری نتیجہ تھی ہندوستانی روایاتِ فن اور ایرانی مصوری کے خوشگوار امتزاج کا۔ گلیڈ سٹون سالومن کے الفاظ میں ہندوستانی تنے پہ گلِ ایران کی شاخ کا پیوند لگایا گیا جس نے جہانگیر کے عہد میں عدیم النظیر شگوفے کھلائے۔ ظہیر الدین بابر اور ہمایوں اپنے ساتھ نہ صرف بہزاد اور اس کے معاصرین کے شاہکار لائے تھے بلکہ ان سلاطین نے بہزاد کے شاگردوں کو بھی اپنے درباروں کی زینت بنایا۔ انہی ایرانی استادوں کے ذوقی فیضان کا نتیجہ تھا کہ ملکی روایات میں زندگی کی نئی رو دوڑ گئی اور مغل مصوری کا وہ شہرۂ آفاق دبستان تشکیل پذیر ہوا جس کی روایات آج بھی بنگال کی مصوری میں زندہ و باقی ہیں۔

ایران و ہند میں باہمی تاثیر و تاثر کا سلسلہ زریں صدیوں تک جاری رہنے کے بعد انقراضِ دولتِ مغلیہ پر منقطع ہو گیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ پاکستان کی تاسیس کے بعد ان ملکوں کو دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع مل گئے ہیں اور اس بات کا قوی امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ایران اور پاکستان کے دانشور اور اربابِ فن اپنے اسلاف کی طرح دوبارہ ایک دوسرے کے لئے ذوقی و وجدانی تحریک و تشویق کا باعث ہوں گے۔ اس وقت جبکہ ہمارے مصوروں کی اکثریت مریضانہ رومانیت یا تجریدی فن کے صحرا میں حیران و سرگرداں ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انہیں اکبر تجویدی کے فن سے متعارف ہونے کا موقع بہم پہنچایا جائے جس نے مشرقی روایات کو جدید مغربی رجحانات میں ممزوج کر کے پیش کیا ہے۔

مرقع کی تقطیع جیبی ہے۔ اس کے دلفریب گرد پوش کے ایک طرف حکیم عمر خیام کی شبیہہ ہے اور دوسری جانب ایک مغنیہ کی

تصویر ہے جس نے انگور کی بیل کے نیچے بربط چھیڑ رکھا ہے۔ اس کے اِدھر اُدھر چنگ، خم مے، صراحی، ساغر اور کتاب جیسے آلاتِ ذوق و عیش بکھرے پڑے ہیں۔ یہ تصویر گویا عنوان ہے مرقع کے جملہ مطالب پر اور عنوان بھی ایسا کہ جس کی دلفریبی پر بقولِ غالب جان نذر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

رباعیات کے فارسی متن کے ساتھ ان کے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور عربی کے منظوم ترجمے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ انگریزی ترجمہ فٹز جیرلڈ کا ہے۔ جرمنی ترجمہ آقائے غلام رسول تربیت، فرانسیسی ترجمہ آقائے اعتصام زادہ اور عربی ترجمہ آقائے احمد صافی النجفی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ناشرین کا ارادہ ہے کہ ان رباعیات کو یورپ کے بیشتر ممالک میں مقبول بنایا جائے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس مرقع کا دوسرا ایڈیشن دنیا کی دس معروف زبانوں کے ترجموں پر مشتمل ہوگا۔ ان زبانوں میں اردو کا نام بھی لیا گیا ہے۔ رباعیات کے تراجم کے علاوہ انہی چار زبانوں میں پیش لفظ بھی لکھے گئے ہیں۔ آقائے سعید نفیسی کا پیش لفظ محض تبرک ہے البتہ صادق ہدایت نے مبسوط اور محققانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں عمر خیام کے فلسفہ اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ یہ صاحب بعض مقامات پر تعصبِ بے جا کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

> "قہقہہ ہائے عصبانی او و کنایات و اشاراتی کہ بہ ایرانِ گذشتہ می نماید پیداست کہ از تہ قلب از رہزنانِ عرب و افکارِ پست آنہا متنفر است و سیمائی او بطرفِ ایران می رود کہ در دہنِ ایں اژدہائے ہفتاد سر غرق شدہ بود و بانشیج دست و پا زدہ۔"

قطع نظر اس سے کہ عمر خیام جیسے وسیع القلب حکیم کے کلام پر تبصرہ لکھنے والے کو بھی وسیع النظری سے کام لینا چاہیے تھا، فاضل مقدمہ نویس نے تاریخ کے صریح واقعات کو جھٹلایا ہے۔ وہ اس بدیہی حقیقت سے ناواقف ہیں کہ عربوں کے غلبہ اور استیلاء نے ہی ایرانیوں میں تحصیلِ علم و معرفت کے بے پناہ جذبہ کو بیدار کیا تھا۔ ایران کی سرزمین میں مامون الرشید کے اواخر عہد تک چند سالوں میں جتنے علماء اور فضلاء پیدا ہوئے اتنے ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے ایک ہزار سالہ دورِ تسلط و حکومت میں بھی پیدا نہ ہو سکے۔ "رہزنانِ عرب" ہی ایران میں آزادیٔ فکر و نظر کا پیام لے کر آئے تھے۔ یہی صحرانشین تھے جنہوں نے ایران کے تنزل پذیر معاشرہ کی فرسودہ اقدارِ اخلاق و عمل میں زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی اور عوام کو مستبد مرزبانوں اور دہقانوں کے آہنی پنجۂ استبداد سے نجات دلائی تھی اور یہ اسی "اژدہائے ہفتاد سر" میں غرق ہونے کا نتیجہ تھا کہ سرزمینِ ایران نے ابنِ سینا، فارابی، البیرونی اور محقق طوسی جیسے لعلِ بے بہا اگلے تھے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے :

> "خیام در وصف طبیعت تا ہماں اندازہ کہ احتیاج دارد با چند کلمہ محیط و وضع را مجسم و محسوس می کند کہ آنہم در زمانی کہ شعر فارسی در زیر تاثیر تسلطِ عرب یک نوع لغت بازی و اظہارِ فضل و تملق گوئی خشک و بے معنی شدہ بودہ۔"

یہاں آپ نے تاریخ ادبیاتِ ایران و عرب سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ عربی شاعری میں "لغت بازی" کا عنصر عباسی عہد میں دخیل ہوا جب بشار بن برد اور ابو نواس جیسے ایرانی نژاد عربی گو شعراء نے دربارِ خلافت میں بار پایا تھا۔ ان لوگوں نے جاہلی اور اموی شعراء لبید، عنترہ، اخطل، جریر وغیرہ کی فطرت پرستی اور واقعہ نگاری کو صنائع بدائع اور خلوصِ بیان کو تصنع پر قربان کر دیا۔ بعد میں فارسی شاعری کی نشست ہوئی تو یہ عناصر اس میں انہی ایرانی نژاد شعراء کے طفیل داخل ہوئے تھے۔

یہ اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں ورنہ اس مقدمے کے کئی اور مقامات پر بھی گرفت کی جا سکتی ہے۔ بہرکیف عمر خیام کی رباعیات

کی مصوّری میں اکبر تجوبدی کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شاعر کا کلام منتخب کیا ہے جو ایک دقیق النظر فلسفی بھی تھا اور جس کے بعض بسیط افکار موقلم کی دسترس سے ماوراء تھے۔ خیام کی جن رباعیات میں خیالی پیکر (IMAGES) موجود ہیں ان سے مصوّر نے بہ طریق احسن فائدہ اٹھایا ہے ۔ مثلاً ؎

ہنگام صبوح است و خروش اے ساقی — ماہ می: کوئی مے فروش اے ساقی
تہ جای صلاح است خموش اے ساقی — بگذر ز حدیث و درد نوش اے ساقی

یہ رُباعی پڑھتے ہی اس کا خیالی پیکر (IMAGES) چشم تصور کے سامنے ابھر آتا ہے گا ۔ مصوّر نے اس کے نقش میں میکدہ کے دروازے پر بادہ خواروں کا ہجوم دکھایا ہے جن کے ذومعنی اشارے اور بلیغ حرکات و سکنات شراب کا تقاضا کر رہے ہیں ۔

اکثر رباعیات میں عمر خیام نے لطیف تمثیلات اور شگفتہ تشبیہات سے کام لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی رباعیات کے مطالب ایک تصویر میں منتقل نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اکبر تجوبدی نے ایک بدیع اسلوب اختراع کیا ہے ۔ وہ تشبیہہ یا تمثیل کے نقوش کو تصویر کے پس منظر میں ہلکے رنگوں میں نمایاں کر دیتے ہیں اور پھر رباعی کا مرکزی خیال تصویر کی پشت پر خاکہ کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں ۔ اس طرح رباعی کے مطالب پوری جامعیت اور اکملیت کے ساتھ تصویر میں منتقل کر دیتے ہیں ۔ مثلاً ؎

ما لعبتکانیم و فلک لعبت باز — از روی حقیقتی نہ از روی مجاز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطع وجود — رفتیم بصندوق عدم یک یک باز

تصویر میں ایک حسین عورت بساط شطرنج کے سامنے بیٹھی ہے ۔ مُہرے ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں ۔ پس منظر میں چند دھندلے پیکر دکھائی دیتے ہیں جو بظاہر اپنے ہوئے مُہرے ہیں ۔ تصویر کی پشت پر ایک خاکہ ہے جس میں دستِ قضا و قدر دو اشخاص کو رسی میں جکڑ کر کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے ۔ اس طرح جبریت کا مرکزی تصور پوری طرح سے منتشکل ہو گیا ہے ۔

تیسری قسم ان رباعیات کی ہے جن میں مبدا و معاد ، گردشِ افلاک ، ہستی و نیستی ، جبر و تناسخ کے بسیط و مجرّد (ABSTRACT) افکار کو اشارہ و کنایہ کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے ۔ ان رباعیات کی تصویروں میں تمثیل و تشبیہہ سے کام نہیں لیا گیا اور مصوّر کو اپنے تخیل سے کام لینا پڑا ہے ۔ اکبر تجوبدی کی اس نوع کی کوششیں بیشتر ناکام ہیں اور وہ خیام کے بسیط افکار کو کما حقہٗ مصوّر نہیں کر سکے ۔ انہیں خود اپنی ناکامی کا احساس ہے ، لکھتے ہیں " در بعض موارد و فہما و کیفیت نہاں فدای بیان مطلب شدہ " مثلاً ایک رباعی ہے ؎

ای دل چو حقیقت جہاں ہست مجاز — چندیں چہ بری خواری ازیں رنج و نیاز
تن را بقضا سپار و با درد بساز — کایں رفتہ قلم ز بہر تو نابد باز

ظاہر ہے کہ کوئی تصویر ان مطالب کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ اکبر تجوبدی نے سمندر میں ایک غوطہ زن دکھایا ہے جس کے چاروں طرف مچھلیاں گھوم پھر رہی ہیں ۔ اس تصویر میں جبریت کی توضیح نہیں کی جا سکی جو رباعی کا نفس موضوع ہے ۔ بہرکیف اکبر تجوبدی اکثر رباعیات کی نقش گری میں بطریق احسن کامیاب ہوئے ہیں ۔ اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا اگر ان کی چند نمائندہ قسم کی تصویروں پر مختصر تبصرہ کیا جائے ۔ عمر خیام کی مشہور رباعی ہے ؎

گویند کساں بہشت با حور خوش است — من مے گویم کہ آب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست از آں نسیہ بدار — کآواز دہل شنیدن از دور خوش است

تصویر میں ایک جوانِ رعنا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور بائیں ہاتھ سے اپنی محبوبہ کو جامِ بلوریں پیش کر رہا ہے اس جام میں انگور کی بیل سے لٹکتے ہوئے ایک خوشے سے آبِ انگور کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ حسینہ کا رُخ ڈھول تاشے بجانے والوں کی طرف ہے جو دور پس منظر میں گذرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار نوجوان کے پیش کردہ جام کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح اس کی ذہنی کشمکش کو مرئی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ دور افق میں بدلیوں کے بدلتے ہوئے رنگ پھولوں اور پتیوں کو منور کر رہے ہیں۔ تصویر کے پیکر ایرانی حسن و جمال کے مثالی نمونے ہیں۔

رباعی ؎

خیام اگر ز بادہ مستی خوش باش — با ماہ رخی اگر نشستی خوش باش

چوں عاقبتِ کارِ جہاں نیستی است — انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

تصویر میں ایک بوڑھے کی گل ریز شانوں نے دو پیکروں کو اپنی لطیف آغوش میں لے رکھا ہے۔ محبوب جواں سال نے سفید ریش فلسفی کی گردن میں اپنی مرمریں باہیں حمائل کر دی ہیں۔ سال خوردہ مفکر از خود رفتگی کے عالم میں حسینہ کی نرگسی آنکھوں کی گہرائیوں میں شاید عمرِ رفتہ کے لیل و نہار تلاش کر رہا ہے مصور نے نہایت چابکدستی سے پیر کہن سال کے استغراق و محویت کو اس کے بشرے پر منتقل کر دیا ہے جو اس کی نفسیاتی زود رنجی کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریشِ سفید اور زلفِ سیاہ کا تقابل خیال انگیز ہے اور حافظ شیرازی کی یاد تازہ کر دیتا ہے ؎

گر چہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — صبحدم تا ز کنارِ تو جواں برخیزم

رباعی ؎ این کوزہ چو من عاشق زارے بود است — در بند سرِ زلفِ نگارے بود است

این دستہ کہ بر گردنِ او می بینی — دستی است کہ بر گردنِ یارے بود است

یہ تصویر اکبر تجویدی کے شاہکاروں میں سے ہے۔ کوزہ کی ساخت معنی خیز ہے۔ کوزے کے دہانے پر ایک عورت کی شبیہہ ہے جس کو اس کے چاہنے والے نے آغوشِ شوق میں لے رکھا ہے۔ اس کے دہن سے الف لیلائی کوزے کی طرح دھواں اٹھ رہا ہے جس نے بلند ہو کر دو عشاق کی صورت اختیار کر لی ہے۔ شاعر کے بشرے سے جو سامنے رکھے ہوئے کوزے کو مخاطب کر رہا ہے ایک عجیب حسرت آمیز نفسیاتی کیفیت نمایاں ہے۔ تصویر کی پشت پر ایک خاکہ ہے جس میں ایک کوزے کو ایک حسینہ اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ کوزہ دراصل دنیا کی بے ثباتی اور فنا کا علامتی مظہر (SYMBOL) ہے جس کو عمر خیام نے بارہا نہایت کامیابی سے استعمال کیا ہے۔

رباعی ؎ گر دست دہد ز مغز گندم نانی — وز می دو منی ز گوسفندی رانی

وانگہ من و تو نشستہ در ویرانی — عیشی بود آں نہ حدی ہر سلطانی

تصویر کے پیش منظر میں ایک کھنڈر دکھایا گیا ہے جس کے قریب سرسبز گھاس پر دو چاہنے والے بیٹھے ہیں۔ نوجوان کے دائیں بازو نے ملاطفت اور ملاعبت کے انداز سے اپنی محبوبہ کے گرد لائے ہوئے جسم کو سمیٹ رکھا ہے۔ حسینہ کے چہرے پر بےپروائی کی کیفیت نمایاں ہو گئی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جامِ شراب ہے۔ نوجوان کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض کھلی ہے۔ لطف یہ ہے کہ کھنڈر کی ایک دیوار نے بھی دوسری شکستہ دیوار کو سہارا دے رکھا ہے۔ پس منظر میں ایک دربار کا نقشہ دکھایا گیا ہے جس میں ایک سلطان شانِ تمکنت سے تختِ شاہی پر بیٹھا ہے اور ایک درباری کورنش بجا لا رہا ہے۔ تصویر کی پشت پر ایوانِ شکستہ کے قریب شراب کے بھرے ہوئے ساغر رکھے ہیں۔ جوانی کا استغراق اور محبت کی شیفتگی عہدِ گریزپا کے ساتھ دست و گریباں ہے۔

رباعی — این قافلۂ عمر عجب می گذرد / دریاب دمی که با طرب می گذرد
ساقی غم فردای حریفاں چہ خوری / پیش آر پیالہ را کہ شب می گذرد

تصویر میں صبح صادق کا منظر دکھایا گیا ہے جھلملاتی ہوئی بدلیوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے دھندلا چکے ہیں۔ افق کے قریب ایک قافلہ گذر رہا ہے جس کی طرف ایک نوجوان اپنے ہاتھ سے ذومعنی اشارہ کر رہا ہے اور شاید اسے حسنِ طلب کا عنوان بنانا چاہتا ہے۔ ساقی مہوش نے اپنے ہاتھ میں صراحی تھام رکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ صراحی نوجوان کو پیش کر دی جائے گی۔ تصویر کی پشت کے خاکے میں بھی ایک قافلے کو گذرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جسے روکنے کے لئے فضا میں سے ایک غیبی ہاتھ بلند ہو گیا ہے جو شاید عمر گریزاں کے سیماب پا لمحوں کو ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انسانی کوشش کی ازلی اور ابدی بیچارگی اور بے حاصلی۔

رباعی — یاراں چو باتفاق میعاد کنید / خود را بجمالِ یک دگر شاد کنید
ساقی چو مئے مغانہ در کف گیرد / بیچارہ فلاں را بدعا یاد کنید

تصویر میں بہار کا ایک حسین منظر پیش کیا گیا ہے۔ پہاڑ کا دامن ہے۔ ہر طرف سرو اور چنار کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ زمین پر سبزہ مخملیں کا فرش بچھا ہوا ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول کلکاریاں کر رہے ہیں۔ ایک کہنہ چنار کے خمیدہ تنے پر دو محبت کرنے والی روحیں محوِ اختلاط ہیں۔ دور پس منظر میں ایک ادھ جوڑا زندگی کے طاق سے مئیش کا آخری قطرہ نچوڑنے میں محو ہے۔ اس عالمِ سرخوشی اور سرشاری میں "بیچارہ فلاں" کی یاد کیسے آسکتی ہے۔ حبیبِ غربت زدہ کی التجا میں حسرت و حرماں کی اذیت پرور کیفیت نمایاں ہے۔

رباعی — از جرمِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل / کردم ہمہ مشکلاتِ کلی را حل
بکشادم بندہائے مشکل بحیل / ہر بند کشادہ شد بجز بندِ اجل

یہ رباعی سوانحی معلوم ہوتی ہے۔ سقراط اور نیوٹن کی طرح ہر صاحبِ نظر کو کائنات کی پہنائیوں میں اپنی علمی کم مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ شاید اسی تلخ احساس نے عمر خیام کو شراب و شعر کا دامن تھامنے پر مجبور کیا تھا۔ تصویر میں کتبِ حکمت اور اسا اور آلاتِ رصد ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ایک حکیم اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے ہیں اور ان زنجیروں کا سرا موت کے عفریت نے تھام رکھا ہے۔ حکیم کے آسمان کی طرف پھیلائے ہوئے ہاتھ دیکھ کر چاند کے پُراسرار چہرے پر ذومعنی تبسم نمودار ہو گیا ہے۔ تصویر کی پشت پر ایک حکیم اسی انداز سے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا ہے۔ اس کے پاؤں سے بندھی ہوئی زنجیر کو ایک غیبی ہاتھ ہتھوڑے سے چٹان میں نصب کر رہا ہے۔

رباعی — بر چہرۂ گل نسیم نوروز خوش است / در صحنِ چمن روئے دل افروز خوش است
از دی کہ گذشت ہر چہ گوئی خوش نیست / خوش باش و زدی مگو کہ امروز خوش است

تصویر میں دو محبت کرنے محوِ اختلاط ہیں۔ چاہنے والے کے بشرے پر اضطرابِ مواصلت اور وارفتگی شوق کی وہ لطیف کیفیات نمودار ہو گئی ہیں جنہیں دکھانا شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس تصویر میں مصوری شاعری سے بازی لے گئی ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ چنار کے درخت کو انگور کی بیل نے بھی اسی ذوق و شوق سے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے جس طرح چاہنے والے نے اپنی محبوبہ کو، اور پھر سرو کے درخت اور شمر کے ظروف بھی ایک دوسرے کے قرب سے لذت اندوز ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

رباعی ؎
مگذار کہ غصہ در کنارت گیرد — و اندوہ محال روزگارت گیرد
مگذار کتاب و لب جوی و لب کشت — زاں پیش کہ خاک در کنارت گیرد

اس تصویر میں کوزے کی بجائے گلِ کوزہ کو فنا کے علامتی مظہر کے طور پیش کیا گیا ہے۔ ایک حسینہ کو خاک کے خوفناک عفریت نے اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اسی عفریت کے پامال کئے لوگوں کے سر اور دست و بازو ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ حسینہ کے ہاتھ سے شراب کی صراحی گر کر دور جا پڑی ہے۔ وہ مضطربانہ انداز سے عفریت کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور بیچارگی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس خاکِ لئیم میں خدا جانے کتنے گنج ہائے گراں مایہ فنا ہو چکے ہیں۔

رباعی ؎
ہر جرعہ کہ ساقیش بخاک افشاند — در دیدۂ من آتشِ غم بنشاند
سبحان اللہ تو بادہ می پنداری — آبی کہ ز صد درد دلت برہاند

یہ تصویر اکبر تجویدی کا شاہکار ہے۔ صد درد دل، خوفناک عفریتوں کی صورت میں عقب سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ایک حسینہ یاس و حرماں کی زندہ تصویر بنی سرنگوں بیٹھی ہے۔ عاشق اسے شراب کا پیالہ پیش کر رہا ہے جو لا محالہ فرار کا سامان ہے۔ لاشعور کی الجھنوں کو عفریتوں کی شکل میں پیش کیا ہے جو ایک نادر اور اچھوتا خیال ہے۔

رباعی ؎
بر رہگذرم ہزار جا دام نہی — گوئی کہ بگیرمت اگر گام نہی
یک ذرہ ز حکمِ تو جہاں خالی نیست — حکمش تو کنی و عاصیم نام نہی

تصویر میں ایک دشت نمازار دکھایا گیا ہے۔ ایک شخص دیوانہ وار ایک حسینہ کے تعاقب میں بھاگا جا رہا ہے۔ چشمے کے پانی سے نمودار ہوتا ہوا حسینہ کا ہیولیٰ زہرہ کی پیدائش کا منظر یاد دلاتا ہے۔ تعاقب کرنے والے کے کپڑے لپٹ چکے ہیں اور ہاتھ پاؤں کانٹوں کی خراشوں سے لہولہان ہو رہے ہیں۔ عین اس وقت جب کہ وہ ایک جست میں حسینہ کو پکڑ لینا چاہتا ہے قضا و قدر کا ہاتھ غیب سے نمودار ہوتا ہے اور اس کی گردن کے آگے ایک تیز دھار والی درانتی رکھ دیتا ہے۔ یہ تصویر انسان کی ازلی جستجو اور ابدی حرماں نصیبی کو نہایت اچھوتے انداز سے واضح کرتی ہے۔

رباعی ؎
افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد — و آں تازہ بہارِ زندگانی دے شد
آں مرغِ طرب کہ نام او بود شباب — فریاد ندانم کہ کے آمد کے شد

تصویر میں ایک خزاں زدہ بے برگ و بار درخت دکھایا گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ شفق کی سلگتی ہوئی چنگاریاں خاکستر میں دبتی جا رہی ہیں۔ پیشِ منظر میں ایک خمیدہ کمر پیرِ فانی عصا ٹیکتا ہوا جا رہا ہے۔ اس کے قریب سے ہی "جوانی کا پرندہ" تیز غبار میں لپٹا ہوا اڑتا جا رہا ہے۔ تصویر بے حد عبرت آموز ہے۔

رباعی ؎
با تو بخرابات اگر گویم راز — بہ زانکہ بہ محراب کنم راز و نیاز
اے اول و اے آخرِ خلقاں ہمہ تو — خواہی تو مرا بسوز خواہی بنواز

اس رباعی کا موضوع بڑا نازک ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ معبودِ حقیقی گوشۂ محراب سے مانگی ہوئی دعا کو زیادہ توجہ سے سنتا ہے یا میکدے کے در و دیوار سے بلند ہوتی ہوئی مناجات کو۔ خیام کا خیال ہے کہ ایک رندِ لم یزل کی دعا زیادہ موثر ہوتی ہے۔ تصویر میں ایک زاہد مسجد میں دست بدعا کھڑا ہے اور میکدے سے ایک بادہ نوش کے ہاتھ عالمِ خود فراموشی میں آسمان کی طرف اٹھ گئے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ "عابدِ خرابات"

کے انداز میں زیادہ خضوع و خشوع پایا جاتا ہے۔ مصور یہ فرق دکھلانے میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوا ہے۔

رباعی ؎

گویند بحشر جستجو خواہد بود و آں یار عزیز تند خو خواہد بود
از نیکی محض جز نکوئی ناید خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

خیام کی اس منطق کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ تصویر میں خوش عیشی کے سب لوازم موجود ہیں۔ ایک زہرہ شکن کافرہ محو رقص ہے۔ اس کے گھنے بالوں کے تموج میں اس کے گداز جسم کے لطیف خم و پیچ نمایاں ہو گئے ہیں جن کو نغمات کے ہیجان نے اور بھی اجاگر کر دیا ہے۔ اس قسم کے ما... میں قنوطیت کا کیسے گذر ہو سکتا ہے۔

میں نے طوالت کے خوف سے صرف چیدہ چیدہ تصاویر پر تبصرہ کیا ہے جو میرے خیال میں شاعر اور مصور دونوں کے بنیادی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں ورنہ دوسری تصاویر میں بھی دعوتِ نگاہ اور ذوقِ نظر کا سامان وافر موجود ہے۔ اصولِ فن کے نقطۂ نظر سے اس مرقع کا ... لیا جائے تو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا ہوگی کہ اس میں ایران کا روایتی صنعتِ نگاری (INIATURE PAINTING کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ایل خانی نقاشوں نے اس اسلوب کو ایرانی مصوری میں داخل کیا تھا بعد میں کمال الدین بہزاد کے باکمال ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔

اکبر تجویدی سے پہلے فرانس اور جرمنی کے مصوروں نے بھی رباعیاتِ عمر خیام کی تصویر کشی پر طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ مشرقی ماحول ... فضا سے نا مانوس تھے۔ اس لئے انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ہاں مشرق کا وہ تصور محض مریضانہ رومانیت کا حامل ہے اور پیکر کے خدوخال، لباس کی تراش خراش، حاشیہ کی تزئین اور فطری مناظر کی نگارش میں لغزش کر جاتے ہیں۔ اکبر تجویدی کی تصاویر کے پیکر ایرانی ... ایرانی ہے۔ اُن کے پیش کئے ہوئے نسوانی پیکر مشرقی حسن و جمال کے شگفتہ نمونے ہیں۔ ان میں فارسی شاعری کی روایتی محبوبہ اپنی تمام کافر سامانیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

اکبر تجویدی کی دوسری ممتاز خصوصیت ان کی ماہرانہ خط کشی اور رنگ آمیزی ہے۔ مغربی مصوروں میں ولندیزی مصور رنگ کے ... تھے اور اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مغل مصوروں کی تصاویر تک ان کی رسائی ہو گئی تھی۔ اکبر تجویدی نے رنگوں کے انتخاب اور ... لطیف آمیزش میں استادانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے ملک کی اس بیش قیمت روایتِ فن کی ماہرانہ ترجمانی کی ہے۔

اس مرقع میں "برہنہ نگاری" (NUDE) کے بھی چند نہایت حسین و جمیل نمونے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلوب مغرب سے لیا گیا ہے۔ مشرقی مصوری میں اس نوع کی روایت مفقود ہے لیکن اس پر بے جان نقالی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ برہنہ پیکروں کے زاویوں کے انتخاب میں اُپج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ان خصوصیات کی بنا پر مرقع زیرِ نظر کو جدید ایرانی مصوری کا ایک گراں قدر نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے نوجوان مصور اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

نئے نقاد[1]

احتشام حسین

عطا محمد شعلہ

نئی تنقید اور احتشام حسین کا نام اُردو میں لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ پچھلے دس برس میں اردو تنقید کے یدان میں ایک جمود سا رہا ہے۔ پھر بھی بہت سے لکھنے والے آئے اور گئے۔ پُرانوں میں سے کتنوں ہی نے یا تو سکوت اختیار کر لیا لکھا تو جیسے مجبوری میں محض رسائل و جرائد کے مدیران کے تقاضوں سے مجبور ہو کر۔ لیکن احتشام حسین کی تنقیدی سرگرمیوں میں کوئی ی نہ آپائی۔ وہ برابر لکھتے رہے۔ نئے نئے مسائل پر اور اُسی جوش و خروش کے ساتھ۔ لیکن یہ بات غلط کہہ گیا۔ احتشام کو جوش و خروش ے واسطہ نہیں ہے۔ اُن کے یہاں بسیط مگر سرد عقلیت پسندی ہے۔ یا تو اس لئے کہ طبعاً وہ بہت ہی پرسکون اور نرم رو ہیں یا اس ئے کہ مارکسی اسکول میں جوش و خروش کی گنجائش ہی کم ہے۔ یہ جوش و خروش تو Impression (تاثراتی) نقد نگاری کا خاصہ ہے اور احتشام کے یہاں تاثراتی طرز تنقید سے یکسر بے تعلقی پائی جاتی ہے۔ جیسے کہ انہیں اس طرز سے مَس ہی نہ ہو۔

تاثراتی اسکول سے یہ بے تعلقی شاید اس بات کی بھی ذمہ دار ہے کہ عرصہ تک اُن کا اسلوب بیان روکھا پھیکا رہا۔ اُن کے مضامین میں دلائل و براھین ریاضی اور اقلیدس کے مسائل کی طرح آتے رہے۔ صحیح و درست مگر غیر دلچسپ۔ اور جس طرح ریاضی کے مسائل محض اُن ہی لوگوں کے لئے دلچسپ ہیں جنہیں اس مضمون سے رغبت ہو۔ اُسی طرح احتشام کی تنقیدیں اُن لوگوں کے ئے تو ضرور قابل مطالعہ تھیں جنہیں ترقی پسند تحریک سے دلچسپی تھی مگر بحیثیت مجموعی ان مضامین میں وہ جان اور توانائی نہ تھی جو ب لوگوں کو اپنی طرف رغبت دلا سکتی۔ پھر بھی چونکہ ترقی پسند تحریک نے لوگوں کو چونکا دیا تھا اس لئے وہ لکھنے والے جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے یکدم منظرِ عام پر آ گئے۔ لیکن یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اِس کے آگے صرف وہی لوگ جا سکے۔ نہیں اپنے مقصد کے ساتھ عشق تھا۔ اور محض ایک ہنگامہ پر گھر کی رونق کو موقوف نہ سمجھتے تھے بلکہ انہیں اپنے ایمان کی پختگی پر بھروسہ ۔ اس لئے کہ کوئی جذباتی تحریک، رومانی جذبہ یا اُن کی اپنی ہنگامی معاشی بدحالی انہیں اس طرف نہیں لاتی تھی بلکہ وہ سوچ سمجھ کر رسے کفن باندھ کر نکلتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا انہیں گمراہ سمجھتی رہی ہو۔ احتشام بھی انہیں لوگوں کے ہمراہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ثابت قدم رہے۔ اور اُن کا تخلیقی خزانہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور آج لکھتے لکھتے اور سوچتے سوچتے وہ اِس منزل پر آ پہنچے ہیں کہ اُردو کے تنقیدی سرمایہ کا جائزہ لیتے وقت انہیں سرِ فہرست نہ رکھنا ناقابل برداشت بدمذاقی ہے۔

---

[1] یہ مضمون اصل میں تو میرے ایک سلسلۂ مضامین کی کڑی ہے۔

احتشام حسین کے دل کی کلی اُن کے مضامین اور تصانیف میں آہستہ آہستہ کھلی ہے۔ اور آج کل اپنی پوری بہار اُن کی انشا بھی دورِ اوّل کے مقابلہ میں آج بہت جاندار ہوگئی ہے۔ اور وہ ادبی لوچ و چمک جو ایک بڑے ادیب اور دانشا کی زبان میں ہونا چاہئے اُن کے یہاں پورے طور پر جلوہ فرما ہے۔ کچھ لوگ شاید سمجھتے ہوں کہ یہ مسلسل لکھتے رہنے سے پیدا ہو ہوگا مگر میں اس بات کو نہیں مان سکتا۔ یہ بات محض قوتِ ایمانی اور خیالات کی صفائی سے پیدا ہوتی ہے۔ لکھنے کی مشق سے نہ اردو ادب کی تاریخ میں بے تحاشہ لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اور اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے بے تحاشہ لکھنے والوں کا معیار برابر گرتا ہی چلا گیا ہے۔ ابتدا میں ایسے لوگ اہلِ نظر کے ادیب تھے اور آن بازاری لوگوں کے محبوب نظر۔ پھر احتشام تو بے تحاشہ لکھتے بھی نہیں رہے۔ ہاں باقاعدہ طور پر ضرور کچھ نہ کچھ ہمیشہ لکھتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ سوچنا کہ اُن کے اسلوب میں صفائی و اور محبوبانہ ادا محض لکھتے رہنے سے پیدا ہو گئی ہے غلط ہے۔

احتشام کی تحریروں میں سنجیدگی۔ خیالات کی صفائی۔ اُن کی عقلیت پسندی اور مقصد سے لگن جسے میں قوتِ ایمانی کہتا ہوں۔ انہیں ہمیشہ ترقی کے راستے پر گامزن کئے رہی۔ مقصد کے ساتھ وفا ہی ایک وہ شے ہے جس نے احتشام کو بنایا۔ اور آج وہ نئی تنقید کے جنم داتا نہ سہی تو اس کے امام کہے جانے کے مستحق تو بلا شبہ ہیں۔

احتشام کی تحریروں میں ابتدا میں ایک پتلا پن تھا۔ اور ایک خاص مقصد کی ترویج و اشاعت کی وجہ سے مضامین بھی تھی۔ اس پر آہستہ آہستہ انہوں نے قابو پا لیا۔ اسلوب میں سنجیدگی تو پہلے ہی سے تھی اور اب فلسفیانہ گہرائی اور ایک نرخ آ گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور اس کی ضرورت اور محاسن ایک وقت کچھ ایسے نرغے میں تھے کہ پر بار بار لکھنا احتشام کے لئے ایک ناگزیر مسئلہ بن گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس تحریک کے پیش رووں کے ساتھ تھے۔ اور پیدائش سے ہی اس تحریک کا استقبال کچھ ایسے ملے جلے جذبات سے کیا گیا کہ ایک طبقہ نے مستقل طور پر اس تحریک کو بلا سوچے سمجھے بُرا کہنا شروع کر دیا۔ دوسرے طبقہ نے کچھ رومانی طور پر اس کی ہر ادا پر آمنّا و صدّقنا کہنا اپنا شعار بنا لیا۔ ایسے مقابلہ کے ماحول میں دونوں طرف کچھ ایسے لوگ، چھا چلے تھے جنہوں نے اس مسئلہ کو ایک جذباتی مسئلہ بنا لیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں احتشام نے علمی، تاریخی اور سماجی حیثیت سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا۔ یہی وہ نازک وقت تھا جب احتشام کے ایسی معتدل پسندی ہی کام آ سکتی تھی ——— علمی اور ادبی مسائل تاریخی اور سماجی پس منظر ہی میں وہ اور پنپ سکتے ہیں۔ جذباتی ردِ عمل

ترقی پسندی ابتدا ہی سے افراط و تفریط کی شکار رہی ہے۔ اسی کے زیادہ تر ساتھی اس تحریک سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے عقلیاتی و نظریاتی نہیں۔ اور جہاں یہ بات ہو گی وہیں گندگی پیدا ہو جائے گی احتشام اس تحریک کے سقراط ہیں انہوں نے ہر گندگی کا جواب دلائل و براہین اور تاریخی شہادتوں سے دیا ہے اور اس طرح مخالفین کو زچ کر دیا۔

بعض لوگ اس بات پر شاید بُرا مانیں گے کہ میں نے زیادہ تر ترقی پسندوں پر اس تحریک سے جذباتی رابطہ رکھنے کا الزام لگایا ہے۔ لیکن میں کیا کروں جب واقعات میری اس رائے کے ذمہ دار ہوں۔ مثلاً مجازؔ کو دیکھئے وہ اپنے لب و لہجہ کی ترنگ کی بنا پر عمر بھر ترقی پسند تحریک کے معاون مانے گئے مگر اُن کی ترقی پسندی میرے نزدیک کبھی مسلّم نہیں رہی۔ وہ اپنے عمل سے کبھی صحت پسند ترقی پسند ثابت نہ ہو سکے۔ اور اب اُن کی موت پر ہمارے سارے ترقی پسند سماج کو ملزم ٹھہرانا

ہیں - مجازؔ کو کوئی نہیں - درآں حالیکہ وہ اپنے قبل از وقت موت اور ناکامیوں کے تنہا خود ذمہ دار ہیں اور اس لحاظ سے سماج کے سامنے ایک مجرم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے - یہ اور بات ہے کہ اُن کی شاعری ہمارے ادبی ورثہ میں ایک حسین اضافہ ہے - دوسری طرف میجر فیضؔ کو لیجئے زندگی کی نامساعدت کے لحاظ سے وہ مجازؔ سے کم بدنصیب نہیں ہے - بلکہ اُن کے سیاسی شعور کی بنا پر سماج نے اُن سے زیادہ سخت محاسبہ کیا ہے مگر فیضؔ کی مشعلِ فکر ہنوز روشن ہے - وہ زندگی سے برابر دست و گریبان ہیں اور ہر محاذ پر اپنے ناقابلِ شکست عزم و ارادہ کا ثبوت دے رہے ہیں ——— مجازؔ موت سے بہت پہلے جل بجھے تھے اور تھک کر گردن ڈال چکے تھے ——— دونوں کے مزاج اور نظریاتی پختگی کا فرق اس اختلاف کا ذمہ دار ہے - مجازؔ ترقی پسندی کے جذباتی مرید تھے اور فیضؔ عقلیاتی -

احتشام کو بھی زندگی سے کوئی گلے نہیں اس کے برعکس وہ سماجی حالات کا تجزیہ کر کے برابر ہم کو یہ بتلاتے رہے ہیں کہ آج جو ہنگامہ رستخیز برپا ہے وہ تاریخی عوامل کی کارفرمائی کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے ——— نیز یہ کہ ہم اس کے ایک خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے - چپ ہیں تو بھی - خاموش تماشائی بنے رہنا بھی ظالم کی حمایت کا ایک طریقہ ہے - گو یہ مثبت طریق کار نہیں ہے منفی ہے -

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی - بات تو احتشام اور اُن کے مضامین کے متعلق تھی مگر کسی ادیب کا ذکر کرتے وقت اس کے دماغی رجحان کا تجزیہ اور جہد حیات میں اُس کے رُخ پر نظر نہ رکھنا متضاد باتیں ہیں - اس لئے بھی کہ اُن کے بغیر اولاً تو ہم اس ادیب کے مضامین کی اہمیت اور اُن کے لُطف سے بھی بے بہرہ رہیں گے اور دوئم یہ کہ ہم اس طرح ادب میں اُس ادیب کے مقام کا تعین بھی نہ کر سکیں گے - ادب بہر حال زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور پھر نتیجے کے طور پر زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے - اس ادلتی بدلتی دنیا میں کوئی شے جامد اور غیر متحرک نہیں رہ - اور اگر ادب زندگی سے کوئی بھی تعلق رکھتا ہے تو وہ زندگی کی کسی بھی نوعیت سے غیر متعلق کیسے ہو سکتا ہے - چاہے یہ نوعیت سماجی ہو یا اخلاقی، فلسفیانہ ہو یا سیاسی، خارجی ہو یا داخلی اور پھر یہ کہ ادب بھی متحرک ہی ہوگا جامد نہیں - اس لحاظ سے مختلف ادوار کے ردعمل سے مختلف اذہان پیدا ہوتے رہیں گے - یہ حالات کا لازمی نتیجہ ہے - ہاں دیکھنا یہ ہے کہ اُن اذہان میں کوئی رابطہ یا تاریخی تسلسل اور منطقی تعلق ہے تو وہ کس قسم کا ہے - اس لئے کہ یہ تعلق تو لازماً ہوگا - ہاں اس کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے - ان سب کی کوششیں زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے اور ترقی کی طرف لے جانے میں ممد ہیں تو یہ ایک طرح کا تعلق ہے - اور اگر اس کے برعکس ان میں سے سب کی یا کچھ کی کوششیں گھڑی کی سوئی کو پیچھے کی طرف لے جانے والی ہیں تو یہ تعلق کی دوسری نوعیت ہے - بہر حال ان ہر دو تعلقات کی نوعیت کی پرکھ کرنا ہی پارکھ کا کام ہے - دیکھنا یہ ہے کہ احتشام اس حیثیت سے پورے اُترتے ہیں کہ نہیں -

جب ہم احتشام کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے متعلق جدلیاتی نظریہ کے مبلغ ہیں - اور ان پر اشتراکی فلسفۂ حیات کی گہری چھاپ ہے - یہ اور بات ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں ہیں - اس کی صراحت بھی کیا ہے - پھر احتشام جیسے خاموش اور سادہ مزاج انسان تو اپنی جگہ کام کئے جانے کے قائل ہیں - ان ظاہری لوازم سے وہ مبرا ہیں - اس لئے نہیں کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بننے سے اس کے نتائج کا خیال کر کے خوفزدہ ہوں بلکہ یوں ہی - اس یونہی کی کوئی توجیہہ آسانی سے نہیں ہو سکتی جس طرح وہ اپنی زندگی اور ظواہرِ زندگی میں صرف احتشام ہیں اسی طرح شاید بحیثیت ادیب بھی وہ بلا کسی نمائش کے رہنا چاہتے ہیں - یہ اُن کی طبیعت کا فطری خاصہ ہے - اور اس لئے بالکل مناسب حال -

اشتراکی نظریہ ادب کو قبول کرلینا اور بات ہے اور اُسے رگ رگ میں بسانا اور پچانا دوسری بات ہے۔ کچھ لوگ تو اس نظریہ کو بطور فیشن اپنانے کی کوشش کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ وہ عملاً بھی اور نظریاتی حیثیت سے خام کار رہتے ہیں۔ لیکن احتشام کی صورت دوسری ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس نظریہ کو قبول کیا ہے بلکہ اس نظریہ کی روشنی میں اردو ادب کے مشاہیر کا تفصیلی تجزیہ بھی کیا ہے اور کچھ اس غیر جذباتی انداز میں انہوں نے مشاہیر کے ذہنی عناصر کو پرکھا ہے اور کچھ اس طرح عمل جراحی کیا ہے کہ ہمارے بہت سے مجنوں کی قلعی کھول دینے کے باوجود ان سے کوئی آمادۂ پیکار نہ ہو سکا۔ اور وہ ادبی معرکوں سے صاف بچ گئے۔

احتشام کا یہی غیر جذباتی انداز (جسے میں سرد عقلیت پسندی کہتا ہوں) ان کی عظمت اور بزرگی کا ضامن ہے۔ اور یہی وہ منفرد خصوصیت ہے جو احتشام کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ اُردو کا کوئی تنقید نگار اس بات میں احتشام سے آنکھ ملانے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس منزل میں وہ تنہا ہیں۔ اور اس حیثیت سے وہ مستقبل کے تنقید نگار کے لئے منارۂ روشنی ہیں۔

احتشام کے اسلوب کا دھیما پن ایسا ہے کہ جیسے سرشام میدانی دریا کی خاموش روانی۔ جذبات سے معرّا یکسر پرسکون۔ جبھی تو اقبال کے یہاں حقیقت اور تصوریت (عینیت) کا تضاد پالینے کے باوجود ان سے بازپرس کرنے والا پیدا نہ ہو سکا، ورنہ اقبال جیسے شاعر پر ایسی حقیقت پسندانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ احتشام صاف نکل پاتے، اور اقبال کے کسی سرفروش مُرید کی نگاہِ کرم اُن پر نہ پڑتی۔

احتشام کی ذہنی تربیت میں اُن کے استاد پروفیسر اعجاز حسین کا بھی کافی ہاتھ رہا ہے۔ اعجاز صاحب بھی اُردو تنقید کے میدان میں ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ اور یہ وہی تھے جنہوں نے اُردو شاعری اور ادب کو ایک نئے نقطۂ نظر سے پرکھنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ان نئے رجحانات میں صرف سیاسی عروج و زوال ہی کو کارفرما پایا۔ شاگردنے اُن کے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اور تاریخ کے جملہ پہلوؤں کی اجتماعی کارفرمائی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مشاہیر ادب کے کارناموں کو نئی قدروں کی روشنی میں پیش کر کے ان کی نئی توجیہہ و تشریح کی اور اس طرح ہمارے قدیم ادبی ورثہ کو نہ صرف یہ کہ طوفان کی زد سے محفوظ رکھا بلکہ اس کو ایک نئے معنی پہنائے اور اس کے حسن کو ایک نئی جلا بخشی۔ گو وہ اس کام میں تنہا نہیں رہے۔ لیکن اس سمت میں باقاعدہ کام کرنے والوں میں وہی سب سے زیادہ باقاعدگی سے مستعد رہے۔

یہ تو ایک علٰحدہ بحث ہے کہ احتشام جس نظریہ ادب کو مانتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اور نہ تو یہ اس مضمون کا موضوع ہے۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات کے ساتھ کہاں تک سچائی برتی ہے۔ اور انصاف کیا ہے اور یہ کہ جس مدرسۂ خیال سے وہ نظریاتی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ وہ کہاں تک ادب کی صحیح تشریح و توضیح میں اُن کی امداد کر سکا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے اشتراکی ادیبوں اور نقد نگاروں نے ہمارے قدیم ادبی ورثہ کے متعلق کچھ اس طرح جلد جلد رائیں بدلی ہیں کہ ایک عام قاری کے لئے ان کے اندازِ نظر کی سچائی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اُسے بھی کسی سیاسی داؤ پیچ کا جز سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن ایسی کوئی قلابازی احتشام کے یہاں نہیں ملتی وہ ابتدا سے ادب کے تاریخی اور جدلیاتی نظریہ میں یقین رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ابتدا سے آج تک ہمارے قدیم ادبی ورثہ کے حسن و جمال کو نئی قدروں اور نئے تقاضوں کے مطابق اُجالتے رہے ہیں۔ اسی لئے اُن کا اندازِ نظر زیادہ صالح اور قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے بلکہ سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے،

کہ انہوں نے ادب کے مادّی نظریہ کو تاریخی تسلسل اور سماجی عوامل سے الگ کر کے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اسی لئے وُہ اُن کے لئے میکانی حیثیت کبھی اختیار نہ کر سکا۔ ورنہ یہ سب قلابازیاں جو دیگر لوگوں کے یہاں ملتی ہیں اُن کے یہاں بھی لازمی طور پر ملتیں اور ان کی تنقیدی اصابت رائے مشتبہ ہو جاتی۔

لیکن اس کٹھن منزل سے احتشام کس طرح عہدہ برا ہوئے اس کا کھوج بھی لگانا ضروری ہے۔ اس کی ایک بدیہی وجہ تو سامنے ہے، اور وہ یہ کہ ان کے سوچنے کا انداز جب یکسر غیر جذباتی ہوگا تو ان کے راستے میں کوئی اُلجھن باقی نہ رہے گی، اور وہ جس مسئلہ پر سوچنا چاہیں گے ذہن کی صفائی ان کی معاون ہوگی اور خیالات میں کوئی تعقید نہ ہونے سے نتائج تک ان کی رسائی مشکل نہیں رہے گی۔ خیالات کی یہ یک سمتی اور ذہن کی یہ لاتعقیدی کیفیت وہبی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن احتشام کے یہاں یہ وہبی ہو یا نہ ہو ان کی کاوشِ حسن بھی ہے۔ انہوں نے تنقیدی اُصولوں اور نظریوں کے متعلق اتنا سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے بعد گتھیاں باقی ہی نہیں رہتیں۔ پھر یہی نہیں کہ ذہن ایک بے لگام گھوڑے کی طرح جس طرف چاہے چلا جائے ان کے ذہن میں ادب کے مادّی نظریہ میں اتھاہ یقین اُن کی سمت کو متعین کرتا رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اصول تنقید کی جملہ جزئیات پر ابتداہی سے اتنا غور و خوض کیا ہے کہ بے راہ روی اُن سے کوسوں دُور ہے۔ جب تنقید کے اصولوں کی جزئیات کے سلسلہ میں ذہن ترتیب پا کر رچ گیا ہو تو پھر مسائل چٹکی بجانے میں حل ہونے لگتے ہیں اور ایک اُسلوب پیدا ہو جاتا ہے۔ احتشام نے اسلوب کی گتھی اسی طرح سلجھائی ہے اور یہی وہ عینک ہے جس سے آپ اُن کے انداز نقد کو پہچان سکتے ہیں، یہی اُن کی انفرادیت کا راز ہے۔ احتشام کی تحریر کسی دوسرے کی تحریر میں کھپ ہی نہیں سکتی وہ فوراً حقیقت کی غمازی کر دے گی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اردو کے تنقیدی ادب میں کوئی انوکھا پن یا البیلا پن رکھتی ہے۔ بلکہ یہ سوچی ہوئی نثر اور یہ سلیس اور پُر خلوص مگر غیر جذباتی انداز تفکر جو اپنی اک خاص سمت رکھتا ہے قدم قدم پر احتشام کا پتہ دے گا اور یہ چوری نکل کر رہے گی۔

احتشام کے یہاں تنقید نگاری ایک مقدس فریضۂ حیات ہے۔ وقت گزاری یا اُنا کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ فرض کا یہی احساس انہیں راہِ راست پر رکھنے کا ضامن ہے۔ ورنہ یہ منزل بڑی کٹھن ہے اور اس کے خطرات کا انہیں پوری طرح احساس ہے۔ اپنے ایک مضمون اصول تنقید (جو ادب اور سماج نامی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے) میں انہوں نے اس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں...... "بعض اوقات فنکار کی شخصیت کا جادو ہی اسے (نقاد کو) اس طرح بے بس کر دیتا ہے کہ وہ اپنی راہ معین نہیں کر سکتا۔ بلکہ فنکار کی بنائی ہوئی راہوں پر چل کھڑا ہوتا ہے"۔ یہ بات ہمارے تنقیدی سرمائے کے بیشتر حصے پر صادق آتی ہے۔ غالب۔ انیس۔ فانی۔ جگر۔ اقبال اور جوش اور دیگر مشاہیر فن پر نوّے فیصدی مضامین اس لئے کی تائید کرتے ہیں۔ باقی نو فیصدی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کا اشتہار ہیں۔ صحیح قسم کے تنقیدی مضامین جو صالح انداز نظر اور افادی حیثیت رکھتے ہوں وہ ایک فیصدی سے زیادہ نہ ملیں گے لیکن اس پیمانہ پر پورا اُترنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ یوں کہنے میں بڑی سیدھی سادی بات نظر آتی ہے۔ عمل کے وقت بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ نظریات گڑھ دینا اس کی نسبت کہیں زیادہ آسان ہے۔ احتشام نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔"...... اصول کی بات (اگر واقعی انہیں اصول کہا جا سکے) اپنے انفرادی ذوق۔ اپنی ذاتی پسند کی بات نہیں ہو سکتی۔ اصول تو اس لئے بنتے ہیں کہ اُن سے دوسروں کی رہنمائی ہو سکے۔ یا کم سے

کم راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت ہو جائے .... تنقید کی یہی اجتماعی حیثیت ہے جو دشواریاں پیش کرتی ہے۔ اور جس سے عہدہ برآ ہونا ہر نقاد کے بس میں نہیں ہوتا۔" "بنے بنائے اصولوں پر چل کھڑا ہونا آسان ہے۔ لیکن اصولوں کو بنانا یا ان کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونا غیر معمولی ذہنی طاقت اور علم کا مطالبہ کرتا ہے۔" میں اس کے ساتھ یہ اضافہ کروں گا۔ کہ غیر معمولی ذہنی طاقت ہی نہیں بلکہ سوچنے کی سیدھی لکیر بھی ضروری ہے۔ ورنہ نقاد کے بگڑ جانے کا خدشہ ہر وقت لاحق رہے گا۔ علم کے ساتھ اس کو پچانے اور ہضم کرنے کا ہتہ بھی ہونا چاہیئے۔ ورنہ علمی بدہضمی اور انقباض کی مثالیں بھی ادبی دنیا میں کم نہیں ہیں۔ یگانہ کو اس علمی بدہضمی نے ایک عظیم شاعر نہ ہونے دیا۔ اور وہ محض ایک اچھے شاعر ہو کر رہ گئے۔ اس بدہضمی سے بچنے کے لئے ایک حکیمانہ دماغ کی ضرورت ہے۔ جس کی طرف احتشام نے یوں توجہ دلائی ہے۔ "...... جس طرح بغیر ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھے ہوئے اچھا ادیب نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ایک اچھا حکیمانہ دماغ رکھے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں بن سکتا۔" اور میری رائے ہے کہ احتشام اس حکیمانہ دماغ کی دریافت کر چکے ہیں جس کے باعث وہ ایک اچھے نقاد کہے جانے کے مستحق ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنقید کا جو سانچہ احتشام نے ترتیب دیا ہے کیا وہ کوئی اُن کی دریافت ہے۔ یا اس کے اصول و اسالیب مارکسی ڈھانچہ میں پہلے سے موجود تھے جس کو محض اپنا لیا گیا ہے۔ بات صاف ہے۔ تنقید کے جو سانچے احتشام نے اپنائے ہیں اُن کا خاکہ مارکسی تصورِ حیات میں پہلے سے موجود تھا لیکن وہ کوئی ایسا میکانکی یا جامد تصور نہیں ہے جو ہر موقع پر فٹ کیا جا سکے۔ بلکہ اس کو عصری میلانات۔ معاشرتی تقاضے۔ طبقاتی تنظیم اور نیز دیگر تاریخی سیاسی اور اقتصادی فلسفیانہ عوامل مجموعی طور پر تشکیل کرتے ہیں۔ اور اُن سے ایک ایسا آئینہ بنتا ہے جس میں اس دور کی روحِ عصر کا نظارہ ہو سکے اور اس کے خدوخال پہچانے جائیں۔ ان سب باتوں کا مجموعی مطالعہ کرنے کے لئے نقاد کے دماغ میں کافی وسعت اور لچک ہونا چاہیئے۔ ردّ و قبول کی صلاحیت اور یہ لچک ہی دماغ میں حکیمانہ ژرف نگاہی پیدا کرتی ہے۔ اور جب یہ صفت پیدا ہو جائے تو ادب کے حسن و قبح کی سیر کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کے لئے کوئی میکانی پیمانہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اور اس لئے جہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ احتشام نے مارکسی نظریۂ ادب کو اپنایا ہے وہاں یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ یہ پیمانے اُن کے اپنے دماغ کی کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اس لئے اور بھی کہ زیادہ تر ترقی پسند نقد نگاروں نے نظریاتی بحث پر ہی اکتفا کی ہے۔ اور اس ذیل میں ادب پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ احتشام پہلی دفعہ تفصیل سے مارکسی تنقید کی عملی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اور اس نے انہیں قدم قدم پر اصول اور نظریات کی عام بحث سے کنارہ کر کے جزئیات کی علمی اور عملی تفصیلوں میں جانا پڑا ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے نئے پیمانے بھی وضع کئے ہیں۔ ان پیمانوں سے مختلف ادبی کارناموں کو جانچا پرکھا بھی ہے۔ اور ان کے متعلق اپنی بے لاگ رائے بھی پیش کی ہے۔ لیکن جانچنے کے اصولوں کا یہ نیا پن ان کی جدت پسندی کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں ان کے دماغ کا عجب پن اپنے مظاہر نہیں ڈھونڈتا۔ اس میں ذہانت اور الفاظ کی بازی گری نہیں ہے۔ بلکہ ایک سنجیدہ کوشش ہے تنقید اور اصولِ تنقید کو علمی معیار پر لے جانے کی۔

جب بات یہاں جا پہنچے گی تو بہت سے بنیادی سوالات پیدا ہو جائیں گے۔ مثلاً "ادب اور ادیب کا تعلق" "ادیب کا اپنے زمانے اور سماج سے تعلق" مسرت اور ادب کا رشتہ۔ موضوع اور حقیقت کا رابطہ اور ایسے دوسرے سوالات

ظاہر ہے کہ اِن سوالات کے اَن گنت جوابات ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی جواب یہی ہے۔ کہ اُن سب میں ایک اثباتی تعلق ہے۔ منفی نہیں۔ ان سب کی جڑیں زندگی سے اپنی غذا حاصل کرتی ہیں۔ اور اس سے گردوپیش سے ماورا جانے کے باوجود بھی عوام سے اپنا ناطہ نہیں توڑ سکتیں۔ رہا یہ سوال کہ اس ناطے کی نوعیت کیا ہوگی اور حقیقی مسرت اگر انسانی کوششوں کا حاصل ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی؟ احتشام کی جملہ تصانیف اس اجمال کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ ان سوالوں کے ساتھ جتنے ضمنی سوالات پیش آسکتے ہیں احتشام نے کئے ہیں۔ اور پھر ادب کے مادّی نظریہ کے مطابق اُن کے جوابات دئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے ادبی ورثہ کو اس معیار پر جانچ کر انہوں نے اپنے دعووں کی عملی مثالیں مہیا کی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ جو نتائج اُنہوں نے اخذ کئے ہیں اُن سے انحراف کرنا آسان نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ہم اُن کے نظریۂ ادب و تنقید سے حرف بہ حرف متفق نہ ہوں لیکن جس عرق ریزی کے ساتھ انہوں نے جستجو کی ہے اور جو منطقی طرز استدلال انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ایک قابلِ تحسین کوشش ہے اور ساتھ ہی عقل کو لگنے والی بات بھی ہے۔

میں نے اس مضمون میں احتشام کے مضامین سے مثالیں دینے سے عمداً گریز کیا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ میں اس مضمون کو زیادہ طویل نہیں کرنا چاہتا۔ دوسرے یہ کہ احتشام کے یہاں سے ایک دو لائن کے اقتباس سے کام نہیں چل سکتا۔ جس کسی مسئلہ پر اُن کے مضمون کا اقتباس لیا جائے گا۔ اس کا ایک پیراگراف لینا لازمی ہے۔ اس کے بغیر استدلال کی نوعیت اور اقتباس کی صحیح اہمیت واضح نہ ہو سکے گی۔ اور اس طرح اس مضمون کا حجم بڑھ کر کتاب کے قریب قریب پہنچ جائے گا۔ یہ بات جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ احتشام کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ خوبی تو یوں کہ اس سے ان کے خیالات اور استدلال منطقی ربط اور تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اس کے تار و پود کی اس بندش کا پتہ چلتا ہے جس سے کہ اس کو ذرا یا کاٹا چھانٹا نہ جا سکے۔ خرابی یوں کہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اُن کے یہاں اختصار کی صفت کمیاب ہے اور یہ کہ کسی غیر معمولی ذہانت کا کوندا کسی فقرے میں دکھائی نہیں پڑتا۔ کوئی اکیلا فقرہ اُن کی پوری شخصیت اور ذہانت کو سموتا نہیں دکھائی دیتا۔ لیکن اس کی کھوج احتشام کے یہاں کرنا بھی ایک غیر منطقی بات ہے۔ اُن کی طبیعت اُن کے انداز استدلال اور اُن کے جیسے علمی انداز کے تنقید نگار سے جو اپنے موضوع سے۔ سوائے علمی رابطہ کے جذباتی واسطہ بھی نہ رکھنا چاہے۔ اور مکمل طور پر لاتعلق (Detatched) رہے۔ اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو اُن کی تنقید میں وہ متوازن اور علمی لہجہ شاید نہ رہتا۔ جس کو ہم اُن کی سب سے بڑی خصوصیت مانتے ہیں۔

احتشام کے غیر جذباتی انداز نگارش اور علمی تحلیل و تنقید کا ذکر کرنے کے ساتھ ایک بات واضح کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ احتشام جذبات سے معرّا کوئی شخصیت ہے۔ اس لئے کہ ایسا شخص تو سماج کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ اور ادب کیلئے بھی۔ اُن کے غیر جذباتی اسلوب سے میری مراد یہی ہے کہ وہ کسی کارنامہ کا تجزیہ یا اس پر تنقید کرتے وقت اس کے متعلق قطعاً کسی طرح کا کوئی مفروضہ اپنے ذہن میں نہیں رکھتے۔ اس کی خوبی یا خرابی کے متعلق کوئی جذباتی تحریک ان پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتی۔ کسی شاعر یا ادیب کی شہرت و عظمت اُن کے دماغ میں تعصبات کی دیواریں نہیں کھڑی کرسکتی وہ تنقید کرتے وقت ہر چیز کو ایسے پرکھتے ہیں جیسے ہم بازار میں جاکر کسی چیز کو خوب جانچ تول کر خریدنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ محض اس

کی ظاہری چمک دمک یا خوبصورتی سے متاثر ہو کر یوں ہی دام نہیں پھینک دیتے۔ ساتھ ہی اس کی افادیت بھی مدنظر رکھتے ہیں اور محض دوکاندار کے سمجھانے سے اندھے بن کر خریداری نہیں کر لیتے۔ احتشام کا ادبی کارناموں کے ساتھ بالکل ایسا ہی رویہ رہتا ہے اور جس طرح ہم اشیاء کو بازار میں خوب دیکھے پرکھے بغیر اُن کی افادیت کا تصور نہیں کر سکتے۔ احتشام بھی اس طرح ایک ادبی کارنامے کے متعلق بغیر جانچے تولے اپنی رائے قائم نہیں کرتے۔ جانچنے تولنے کے پیمانے اُن کے وہی ہیں جن پر بحث ہو چکی ہے اور جن کی تفصیلیں اُن کی کتابوں میں جا بجا ملتی ہیں۔

لیکن رائے دینے سے پہلے جانچنے پرکھنے کے دوران میں ادبی کارناموں سے جس لاتعلقی کا اظہار احتشام کے یہاں ملتا ہے وہ اُردو تنقید نگاری میں نایاب ہے۔ اسی شے کو میں غیر جذباتی انداز نگارش سے تعبیر کرتا ہوں۔ اور یہ ایسی اصولی اور پسند آنے والی بات ہے کہ ہر تنقید نگار خود کو اس اصول کا پیرو بنانے پر مجبور ہے۔ اور فخر کے ساتھ اس دعویٰ کو پیش کرتا ہے۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی ایک خوبی کمیاب ہے۔ باقی سب کچھ موجود ہے۔ احتشام کے یہاں یہی ایک خوبی سرفہرست ہے اور چاہے کچھ ہو کہ نہ ہو۔ لیکن جب یہ خوبی موجود ہو تو پھر دیگر خوبیوں کا ہونا نہ ہونا زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی اکیلی خوبی اُن کے خلوصِ نیت کی شاہد ہونے کے لئے کافی ہے۔

خلوصِ نیت اور انسان دوستی میں احتمادی نقاد کا سب سے بڑا وصف ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ اگر نہ ہو تو تعمیر کی جگہ تخریب لے لے گی۔ اور ادب کا کارواں اس غلط رہنمائی میں انسان کو گمرہی کی طرف لے جائے گا۔ نقاد ہی تو ادب کا راہنما ہے۔ وہی اس کے جسم میں خونِ صالح کی مقدار کو صحیح رکھنے کا ایک آلہ ہے۔ جب وہ خود ہی صحیح راستہ پہ نہ ہو گا۔ تو رہنمائی کیا خاک کرے گا۔

میں نے اس بات کی وضاحت اس لئے کی کہ جو شخص۔ حالیؔ۔ غالبؔ۔ اکبرؔ۔ میرؔ۔ اقبالؔ۔ پریم چند۔ حسرتؔ۔ فانیؔ اختر شیرانی۔ نظیر اکبرآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی ہر ایک کے کلام اور تخلیق سے لطف لے سکے اور اُن کو اُن کے صحیح تاریخی سیاسی و سماجی شعور کے پس منظر میں جانچ کر اُن کی قدر و قیمت اثباتی حیثیت میں معین کرنے کا شعور رکھتا ہو اس کو یکسر غیر جذباتی مان لینے کی غلطی میں نہیں کر سکتا۔ یقیناً اس میں جذباتِ لطیف نہ صرف یہ کہ موجود ہی ہیں بلکہ اُن میں جذبات کی تربیت بہت ہی ضبط و نظم کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور ہمارے اکثر تنقید نگاروں سے بہتر طریقہ پر احتشام ہمارے ادبی ورثہ سے لطف لینے کا ذوق رکھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے ترقی پسندوں اور اشتراکی نقطۂ نظر رکھنے والوں کے سامنے ہمارے ادبی ورثہ کی ایسی پُرلطف تشریح انہی کی زبان اور نقطۂ نظر کو پیش رکھتے ہوئے کی ہے کہ ہمارے سامنے سے ایک عظیم خطرہ ٹل گیا ہے۔ اور چونکہ یہ تشریح انہی کے نظریہ کے مطابق ہے۔ اس لئے اس کی افادیت اور حسن کا اندازہ کرنے کی سکت ہی نہیں بلکہ اس کو مزید جلا دینے کی خواہش اس مکتبِ خیال میں پیدا کرنے والوں میں احتشام کا بڑا ہاتھ ہے۔ ورنہ خطرہ تھا کہ جلد بازی میں یہ تحریک اس عظیم ادبی ورثہ کو ناقابلِ اعتناء نہ سمجھ بیٹھے اور اس طرح صدیوں کی تہذیبی کمائی غارت ہو جائے۔ اس کام میں کچھ دوسرے نقاد بھی اُن کے شریک رہے۔ لیکن باقاعدگی کے ساتھ انہیں نے اس سمت میں اُن تھک اور لگاتار محنت کی ہے۔ بات یہ ہے کہ احتشام کا دبدبہ اُن حالیؔ کی طرح بڑا رچا ہوا اور نرم رو ہے۔ پُرشور اور تیز رو نہیں۔ ساتھ ہی حالیؔ کی سی تہذیبِ نفس اور دھیما پن اور انہیں کا سا استدلال بھی اِن میں ملتا ہے۔ اور جس طرح عرصہ تک لوگ حالیؔ کو غزل گو کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے ہچکچاتے رہے اُسی طرح احتشام کو شاید

غیر جذباتی سمجھنے کی مجبوری ہے۔ لیکن جس طرح حالیؔ غزل کا ایک رچا رچایا ذوق رکھتے تھے اسی طرح احتشام بھی شعر و ادب کا بڑا منجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بات نہ ہوتی تو احتشام یہ تعمیری اور تخلیقی انداز تنقید کہاں سے پاتے؟

چلتے چلتے اُن کے ایک علمی کارنامے کا ذکر بھی کرتا چلوں اور وہ یہ ہے "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ"۔ یہ ترجمہ ہے جان بیمز (مستشرق) کے ایک کتابچہ کا لیکن اس پر مقدمہ احتشام کا ہے۔ جو اپنے حجم اور افادیت اور علمی انداز تحقیق کی بنا پر اصل ترجمے سے کہیں زیادہ کارآمد ہے۔ ویسے اُن کی لسانیاتی تحقیق و جستجو کا پتہ ان کے مضامین کی کتابوں میں بھی چلتا ہے۔ جن میں ایک ایک دو مضمون اس ذیل کے ہیں لیکن ہندوستانی لسانیات کا خاکہ دیکھ کر تو طبیعت کو اُن کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاید علمی تحقیقات کے لئے ہمارے موزوں ترین صاحب نظر ادیب ہیں۔ کاش عمر اور فرصت اُن کے ساتھ وفا کریں۔ اور ساتھ ہی انہیں ایسے مواقع بھی بہم ہو سکیں کہ وہ علمی کاموں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا انہیں اس علمی تحقیق کے شغف نے اس طرح ڈھالا کہ تنقید کے میدان میں بھی اُن کا لب و لہجہ علمی گہرائی اور توازن سے مالا مال رہا۔ یا تنقید میں علمی اندازِ نظر کا طفیل ہے کہ وہ ایسے بسیط علمی کارنامے کی طرف متوجہ ہو سکے۔ بہر حال ابھی احتشام سے اردو تنقید اور لسانیاتی تحقیق کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اُن امیدوں کو پورا کر سکیں گے۔

جدید ادبی فکر

دیوندر اسر

ادب کی ماہیت، اس کا منصب اور اس کی پرکھ، ایک دوسرے سے ہمیشہ اس طرح منسلک رہے ہیں کہ انہیں الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے وجود کی شرط ان کا غیر منفک باہمی رشتہ ہے۔ کسی بھی شے کی پرکھ کے لئے اس کی ماہیت اور اس کے منصب کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس شے کی ماہیت ہی اس کے منصب کا تعین ہوتا ہے اور اس کی ماہیت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کا مخصوص منصب حاصل ہو جائے جس کے لئے وہ وجود میں آتی ہے یا لائی گئی ہے۔ ہر شے کی تکمیل اس کے مخصوص استعمال میں ہے جس کو اس شے کی ماہیت نے جنم دیا ہے۔ لہٰذا جب پرکھ کی کسوٹی کا سوال اٹھتا ہے تو ہمیں ان باتوں پر غور کرنا لازم ہے کہ اس شے کی ماہیت کیا ہے۔ اس ماہیت سے کیا منصب وابستہ ہے اور اس منصب کی تکمیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ہم عملی طور پر کسی فنی تخلیق کی قدر متعین کر سکتے ہیں۔ ادب اور فن کی ماہیت، ان کے منصب اور لہٰذا اس کی پرکھ کے معیار میں ہمیشہ اختلاف الرائے رہا ہے۔ اس لئے فن تنقید میں مختلف نظریئے کارفرما نظر آتے ہیں۔ نظریات کی اسی کشمکش سے ادبی بحث کے رخ بدلتے رہتے ہیں اور ایسے ہی گوناگوں تجربے ہوتے رہتے ہیں جن سے تخلیقی اور تنقیدی ادب کی ترقی کی نت نئی راہیں وا ہوتی رہتی ہیں۔

جب ہم ان نظریات پر غور کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے فن کو فن کی سطح پر ہی پرکھنے کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ فن برائے فن کا نظریہ ادب یا فن کسی مخصوص مقصد کے وسیلہ اور اس کے حصول کا مخالف ہے۔ اس نظریئے کی رو سے ادبی پرکھ کا معیار اس کی افادیت نہیں بلکہ اس کا جمالیاتی یا فنی جوہر ہے۔ اس لئے فنی تخلیق کو کسی اخلاقی یا افادی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جمالیاتی تجربے کی روشنی میں پرکھنا چاہئے۔ ادب کا واحد مقصد ادب ہے یعنی فنی یا جمالیاتی تجربے کو گہرائی اور وسعت عطا کر کے اسے پڑھنے والے تک تاثر کی اسی گہرائی اور وسعت سے منتقل کرنا ہی فن کی تکمیل ہے۔ اس ضمن میں فن برائے فن کے حامی نامور نقاد اے۔ سی۔ بریڈلے کے خیالات غور طلب ہیں۔

"شاعری برائے شاعری کا نظریہ ہمیں اس تجربے کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، اس سے یہ چیزیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ تجربہ بذات خود مقصود ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ اسے اس کی اپنی خوبی کے باعث ہی حاصل کرنا چاہئے۔ اس کی اپنی اصلی قدر ہے۔ دوسرے اس کی شاعرانہ قدر محض یہی اصلی خوبی ہے۔ شاعری کی دور ازکار قدر بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی تہذیب یا مذہب کے آلۂ کار کی حیثیت سے۔ کیونکہ یہ تعلیم دیتی ہے۔ جذبات کے ہیجان کو معتدل کرتی ہے۔ کسی اچھے مقصد کو آگے بڑھاتی ہے۔ یا شاعر کے لئے شہرت، دولت اور مطمئن ضمیر کو مہیا کرتی ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے بیشک ان باتوں کے لئے بھی شاعری کی قدر کی جائے۔ لیکن اس کی دور ازکار خوبی براہ راست اس کی شاعرانہ خوبی کو بحیثیت ایک تسکین بخش تخیلی تجربے کے طور پر متعین نہیں کرتی اور نہ ہی کر سکتی ہے۔ اس کی پرکھ مکمل طور پر اس کے اندرونی خصائص سے ہونی چاہئے۔ شاعر کے تخلیقی عمل میں یا قاری کے عمل تجربہ میں

دُوررازکار مقاصد کا خیال اُس کی شاعرانہ قدر کو کم کردیتا ہے۔ اِس کا باعث یہ ہے کہ یہ (معیار) شاعری کو اُس کے ماحول سے جدا کرکے اُس کی ماہیت کو تبدیل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ (شاعری) کی ماہیت نہ تو حقیقی دنیا کا حصہ بنتی ہے اور نہ اُس کی نقل جیسا کہ اِس لفظ سے ہم عام طور پر مراد لیتے ہیں، بلکہ یہ اپنے میں ہی ایک دُنیا ہے۔ آزاد، مکمل اور خودمختار۔"

بریڈلے کے اِن نظریات پر کافی بحث کی گنجائش ہے۔ کیا فن مقصود بالذات ہے؟ کیا اس کا کوئی افادی پہلو نہیں؟ کیا تہذیب و تمدن، مذہب اور دوسری کی سطح وہی ہے جو شہرت اور دولت کی ہے؟ کیونکہ بریڈلے نے اِن تمام کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ حالانکہ ادب، تہذیب و تمدن کی ترقی کا مقصد اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ کیا فن کی عظمت اُس کے فنی پہلو سے ہی پیدا ہوتی ہے یا اُس کے لئے فن کے علاوہ دوسرے پہلوؤں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ کیا شاعری میں کسی دُور ازکار قدر کی آمیزش اُس کی شاعرانہ قدر کو کم کردیتی ہے؟ شاعرانہ قدر کی کمی میں دور ازکار قدر کی آمیزش کے بجائے شاعر کی اپنی فنی صلاحیت اور تخلیقی قوت کہیں زیادہ ذمہ دار ہوتی ہے اور اچھے شاعر کے فن میں یہ دُور ازکار قدر اُس کے فن کو پائندگی اور عظمت عطا کرتی ہے۔ کیا فن حقیقی دُنیا کا حصہ نہیں؟ کیا یہ زندگی سے متاثر نہیں ہوتا اور زندگی کو متاثر نہیں کرتا؟ کیا زندگی کے علاوہ فن کی کوئی علیحدہ اور خودمختار ریاست ممکن ہے۔ جو اپنے اندر مکمل اور بھرپور ہے؟ فن کا یہ مجرد نظریہ تنقید میں تو کسی حد تک استعمال میں لایا جاسکتا ہے لیکن تخلیق میں اِس کا کوئی وجود نہیں۔ تاوقتیکہ ادیب خود کوئی ماورائی حقیقت نہ بن جائے۔ فن میں اجزائے حیات کی آمیزش اور اقدارِ حیات کی جانب اُس کا میلان لازمی ہے۔ بڑے ادب کی پرکھ کی کسوٹی بھی یہی ہے۔ ادب کی پرکھ فن اور افادی پہلوؤں کے معیار پر ہی کی جاسکتی ہے۔

کروچے کے خیال میں ذہنی عمل کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تشکیلِ خیال کا عمل ——— (Concept Forming Activity)

۲۔ داخلی تصویر کشی کا عمل ——— (Image - Forming Activity)

فن کی تخلیق اِس دوسرے عمل یعنی داخلی تصویر کشی کے عمل سے وابستہ ہے۔ داخلی تصویر کشی کا عمل انسانی ذہن کا اولین عمل ہے۔ ذہن جو عکس قبول کرتا ہے اُس کی بنیاد پر داخلی تصویر کشی کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ حسن داخلی تصویر یا داخلی تصویروں کے سلسلہ کی ذہنی ترتیب اور تشکیل کا نام ہے جس شئے کا ادراک حاصل ہوتا ہے حسن اس کی روح کو پا لیتا ہے۔ حسن کا تعلق اس خارجی شکل سے نہیں جس میں کہ اُس کا ظہور ہوا ہے بلکہ داخلی تصویر ——— (INWARD IMAGE) سے ہے۔ فن کارانہ عمل کا یہ خاصہ ہے کہ فن کار خارجی دُنیا سے بے نیاز اپنے محسوسات کے اظہار کے لئے کامل تصویر (PERFECT IMAGE) ——— کی تشکیل کرتا ہے جو کہ اُس کے وجدان سے حرکت میں آتا ہے۔ وجدان کامل بصارت، مکمل ادراک اور تخیل ہے۔ حسن کا تخلیقی عمل اُس کا خارجی پیکر نہیں بلکہ داخلی تصوراتی عمل ہے۔ جہاں تک فن کے خارجی مظہر کا تعلق ہے اُس کا انحصار میکانکی تکنیک اور دستکاری پر ہے۔ کروچے نے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

"حسن ہمیشہ تخیل سے جنم لیتا ہے۔ داخلی تصویریں اس کا واحد خزانہ ہیں۔ یہ اشیا کو ترتیب نہیں دیتا۔ انہیں حقیقی یا تخیلی قرار نہیں دیتا اُن کے وصف کو متعین نہیں کرتا۔ اُن کی تعریف نہیں کرتا بلکہ انہیں محسوس کرتا ہے اور پیش کرتا ہے۔ اِس کے سوا کچھ نہیں۔ جب ہم کسی فنی تخلیق سے محظوظ ہوتے ہیں تو ہم ہمیشہ اپنے ہی وجدان کا اظہار کرتے ہیں۔ میرا اپنا وجدان ہے کہ شیکسپیئر پڑھتے ہوئے میں ہملٹ یا اوتھیلو کا مثالی پیکر بنا لیتا ہوں"

اِس طرح کروچے نے تخیل، وجدان، داخلی تصویر کشی اور تخلیقِ فن کو ایک ہی عمل میں یکجا کردیا ہے۔ کروچے نے اِس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ ایک فن کار اور عام آدمی میں داخلی تصویر کو خارجی طور پر پیش کرنے کی تکنیک کا فرق ہی ہے۔ درحقیقت یہ فرق داخلی تصویر کو خارجی شکل میں پیش کرنے

کا نہیں بلکہ جو داخلی تصویر کسی شے کو منظہر کرتی ہے اُس کی اندرونی تشکیل کا ہے۔ فن کی تخلیق فن کار کے ذہن میں ہی ہو جاتی ہے۔ اُس کا خارجی اظہار اور اس اظہار کا خارجی عمل فن کا داخلی نہیں۔ جیسا کہ کروچے نے کہا ہے۔

"جب ہم۔ نے اندرونی طور پر دسترس حاصل کر لی ہے۔ جب ہم نے واضح اور صاف طور پر اسی تصویر یا مجسمے کی تشکیل کر لی ہوتی ہے۔ جب ہم موسیقی کے موضوع کو پا لیتے ہیں۔ تو اظہار جنم لیتا ہے اور یہ (اظہار) مکمل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ ضرورت نہیں۔ تب اگر ہم اپنا منہ کھولتے ہیں، بولتے ہیں یا گاتے ہیں ...... تو ہم اونچی زبان میں وہی کہتے ہیں جو ہم پہلے ہی اپنے اندر کہہ چکے ہیں۔ اونچے سُر میں گاتے ہیں جو کہ ہم پہلے ہی اپنے اندر گا چکے ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھ پیانو پر پڑتے ہیں۔ اگر ہم پنسل یا چھینی لیتے ہیں تو یہ عمل ارادے کا مرہونِ منت ہے۔ یہ عمل خارجی ہے جمالیاتی عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور بڑی حرکات سے وہی کچھ عمل میں لا رہے ہیں جو کہ ہم پہلے ہی چھوٹے پیمانے پر اور سرعت سے اپنے اندر مکمل کر چکے ہیں۔"

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فن خالص طور پر داخلی اور انفرادی عمل ہے اور یہ عمل اپنے میں مکمل ہے اس لئے فن کی پرکھ اُس کی صداقت یا اُس کی افادیت سے نہیں کی جا سکتی۔ فن سچائی کی ترجمانی یا زندگی کی تنقید کے باعث نہیں بلکہ فن ہونے کے ناطے مقدم ہے اناطول فرانس کے الفاظ میں ———

"کبھی کوئی واضح طور پر میری راہ نمائی نہیں کر سکا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں حسن کے لئے اپنے احساس کو اپنا راہ نما مانتا ہوں۔ کیا آدمی کو اس سے بہتر کوئی راہ نما مل سکا ہے۔ اگر مجھے حسن اور صداقت میں انتخاب کرنا پڑے تو میں بغیر کسی جھجک کے حسن کا انتخاب کروں گا۔ دنیا میں سوائے حسن کے کوئی صداقت نہیں۔"

کروچے اور اُس کے ہم خیال فن کار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی آدمی داخلی تصویر کشی کرتا ہے تو وہ فن کار ہے۔ چاہے اُس کا خارجی اظہار ہو یا نہ ہو۔ فکر و خیال سے بہت پہلے فن جنم لے چکتا ہے۔ کیونکہ خیال کے مقابلے میں تخیل کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے فنکارانہ عمل یا داخلی تصویر کشی منطقی اور عقلی عمل سے ظہور میں آتا ہے۔

کروچے نے فن کی ماہیت پر جو خیالات پیش کئے ہیں اُن سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ذہن کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اُن کا باہمی عمل کیا ہے۔ کیا فن محض داخلی تصویر کشی سے وابستہ ہے۔ پپینی (PAPINI) کے الفاظ میں کروچے کا تمام جمالیاتی ڈھانچہ فن کے فرضی نام ڈھونڈنے کے سوا کچھ نہیں مختصراً اور صحیح طور پر اس کا فارمولا یہ ہے۔

Art = INTENTION = EXPRESSION = FEELING = IMAGINATION = FANCY = LYRICISM = BEAUTY = فن = وجدان = اظہار = احساس = تخیل = تصور = غنائیت = حسن

یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا ہر وہ آدمی جو داخلی تصویر کشی کرتا ہے فن کار ہے؟ کیا فن کارانہ عمل محض داخلی تصویر کشی تک محدود ہے۔ اُسے خارجی پیکر عطا کرنے میں نہیں۔ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ فن کار کے ذہن میں کیا عمل ہو رہا ہے اور کیا وہ اُسے اُسی داخلی تصویر کشی سے منتقل کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ جب فن کار اپنی کوئی تخلیق پیش کرتا ہے تو اس کے لئے کوئی غیر جمالیاتی یا خارجی یا افادی معیار قائم کرنا جائز نہیں۔ جب کیٹس یہ کہتا ہے کہ 'حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ... اور حسن خوشی کا ابدی سرچشمہ ہے' تو کیا اس سے مراد وہی ہے جو اناطول فرانس نے لی ہے یا فن برائے فن کے نظریئے میں لاشعوری طور پر حسن۔ صداقت اور مسرت کا امتزاج ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح فن کا افادی پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ کیا صداقت میں حسن نہیں؟ اس مقام پر ایلیٹ کے اس قول کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

"ادب کی ادبیت کو جانچنے کے لئے جمالیاتی معیار ہے لیکن اس کی عظمت کو معین کرنے کے لئے جمالیاتی اُصولوں کے علاوہ دوسرے اُصولوں کی ضرورت ہوتی ہے ...... کسی نظم میں نظریہ حیات ایسا ہونا چاہیئے جو کہ ربط، بالغ النظری اور حقیقی تجربے پر مبنی ہو"۔ ربط جمالیاتی اور منطقی معیار ہے اور بالغ النظری نفسیاتی۔

ایل۔اے۔ ریڈ نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے "عظمت فن کے نفس مضمون سے پیدا ہوتی ہے۔ عموماً فنی عظمت اس پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک اقدار حیات کی رفعت کو پیش کرتا ہے"۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ادب کو کسی مخصوص نظریے کی اشاعت کا آلۂ کار بنا کر ہی عظیم بنایا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہ فنی تخلیقات میں کسی نہ کسی مقصد یا قدر کی آمیزش کا ہونا ضروری ہے۔ کانٹ کے الفاظ میں اس مقصدیت کو بغیر کسی مقصد کے ہونا چاہیئے۔ یعنی ادب کا مقصد کسی خارجی عمل کو حرکت میں لانا نہیں بلکہ اُسے انسان کی ذہنی سطح پر پیش کرنا ہے۔

ادب کے خالص جمالیاتی نقطۂ نظر کے خلاف افادی نقطۂ نظر ادب کی مقصدیت پر زور دیتا ہے۔ ٹالسٹائی، رچرڈز، کاڈویل وغیرہ اپنے اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس نظریئے کے حامی ہیں۔ اُن کے خیال میں ادب ایک اہم سماجی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے ادب میں سماجی نصب العین اور اقدار کا ہونا ضروری ہے۔

ٹالسٹائی ادب کو انسانی سماج کی نشو و نما کا ایک بھرپور اور کارآمد ذریعہ تصور کرتا ہے۔ وہ ادب کو محض جمالیاتی حظ یا تفریح طبع کا آلۂ کار نہیں مانتا بلکہ نوع انسانی کی فلاح و بہبودی کا ذریعہ مانتا ہے۔ ادب کا بنیادی عنصر جذبہ ہے۔ کیونکہ ادب انسانیت پرستی اور اخوت کے پرچار کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اسے ایسے جذبات کا اظہار کرنا چاہیئے جو اُن مقاصد کے حصول کے لئے ممد ثابت ہوں۔ ادب کی سماجی ذمہ داری کے باعث ٹالسٹائی ادب کی افادیت پر یقین رکھتا ہے۔ اور عوام اور مذہب کو نیک خواہشات کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ ٹالسٹائی کے خیال میں عوام کے جذبات ہی سچے ہوتے ہیں اور مذہب کے ذریعہ ادب میں انسانیت اور اخوت کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ہمیں ادب کے ذریعے محض یہ ظاہر نہیں کرنا کہ کیا ہے؟ بلکہ یہ بھی کہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر سے ادب افادی بھی ہے اور ارشادی بھی ہے۔ ادب کی پرکھ بھی اس کی افادیت کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنے نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا ہے۔

"کرسچین آرٹ یعنی ہمارے دور کے آرٹ کو صحیح معنی میں کیتھولک یعنی آفاقی ہونا چاہیئے۔ لہٰذا تمام نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں منسلک کرنا چاہیئے۔ احساس کے دو پہلو ہیں جو تمام انسانوں کو مشترک رشتے میں باندھتے ہیں۔ پہلا احساس جو انسان کا خدا سے فرزندانہ رشتے اور انسانی اخوت کے ادراک سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرا پہلو اُن عام مگر اہم احساسات کا ہے جو بغیر کسی استثنا کے تمام انسانوں میں مشترک ہوتے ہیں مثلاً مسرت، روح کی حلیمی، مستعدی، سکون وغیرہ ...... احساسات کی محض یہی دو قسمیں ہیں جو ہمارے دور کے ادب کا موضوع بن سکتی ہیں جو کہ بلحاظ اپنے موضوع کے افادی ہے —— نوعِ انسانی کا اشتراک صرف مذہب سے ہی ہو سکتا ہے —— فن کا منصب تشدد کو ختم کرنا ہے اور یہ کام صرف فن ہی کر سکتا ہے"۔

ادیب اس فریضہ کو کس طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اس پر بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے: "اپنے اندر اُس احساس کو بیدار کرنا جو کہ اُس نے پہلے محسوس کیا ہے۔ اور اپنے اندر بیدار کرنے کے بعد اُسے اس طرح منتقل کرنا کہ دوسرے بھی اُس سے وہی تاثر قبول کریں۔ تاکہ دوسرے لوگ بھی انہیں احساسات سے متاثر ہوں اور اُن کا تجربہ کریں۔ اس میں فن کا تخلیقی عمل پوشیدہ ہے۔ فن کے مواد کی قدر کا فیصلہ زمانے کے مذہبی شعور سے کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی شعور زندگی کے معنی کو بلند سطح پر سمجھنے کا نام ہے اور اس سے انسان کا رشتہ خدا کے ساتھ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ استوار کرتا ہے"

رچرڈز بھی فن برائے فن کے خلاف فن کو مقصود بالذات نہیں مانتا۔ بلکہ اُس کی افادیت پر زور دیتا ہے کیونکہ ادب تجربات کے اظہار کا ذریعہ ہے اور ان تجربات میں اقدار کی آمیزش ہوتی ہے جس کے باعث وہ پڑھنے والے میں ایک مخصوص تاثیر منتقل کرتا ہے۔ رچرڈز کی ادبی فکر کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ افادی اور فنی۔ افادی اُصول کا تعلق موضوع سے ہے اور فنی اُصول کا ہیئت یا ابلاغ سے۔ رچرڈز کے خیال میں وہ حصّہ جو کسی تجربے کی قدر کو واضح کرتا ہے تنقیدی حصّہ ہے اور جو کسی شے کو بیان کرتا ہے اُس کا تکنیکی پہلو ہے۔ ادب کا تنقیدی پہلو نفسیات سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اقدار کو واضح کرنے کے لئے کسی مخصوص اخلاق یا مابعد الطبیعاتی نظریئے کی ضرورت نہیں۔ رچرڈز نے ادب میں افادی پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے لیکن اُس کے خیال میں اگر فنی پہلو بھی بلند ہو تو افادی پہلو زیادہ ارفع، مضبوط اور اثر انگیز ہو جاتا ہے۔ ادب کی ماہیت کا تقاضہ ہے کہ افادی پہلو اور فنی پہلو میں توازن قائم کیا جائے۔ رچرڈز اقدار کا تجزیہ پسندیدگی یا لگاؤ (APPERTENZY) اور ناپسندیدگی یا لاگ (AVERSION) کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ تمام انسانی رجحانات اِن میں شامل ہیں۔ پسندیدگی یا لگن اشیاء کی طرف راغب ہوتی ہے اور ناپسندیدگی یا لاگ اُن سے دور رہتی ہے۔ اس لئے ہر وہ شے جس سے لگن یا پسندیدگی کی تکمیل ہو افادی ہے۔ کیونکہ ہر پسندیدگی کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لئے وہ شے افادی ہے جو زیادہ اہمیت رکھنے والی پسندیدگی کو دبائے بغیر کسی پسندیدگی کی تکمیل کرتی ہے۔ پسندیدگیوں کی جس تنظیم سے انسانی جذبات کا کم سے کم حصّہ مجروح ہو وہ افادی ہے اس لئے رچرڈز کے خیال میں جو ادیب اقدار کی اضافیت کو سمجھتا ہے وہ زیادہ متوازن ادب کی تخلیق کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذہن کے انتشار کو دُور کر کے متوازن حالت میں لے آتا ہے۔ کیونکہ بغیر کسی تنظیم کے افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ انتشار کی حالت میں اہم اور غیر اہم ہر تحریک تکمیل سے دُور ہو جاتی ہے۔ اس نظریئے کو نفسیاتی اقدار کی یا افادی اس لئے کہتے ہیں کہ اِس افادی کو وہ نفسیاتی پس منظر میں ثابت کرتا ہے۔

ادب کے افادی پہلو پر کارل مارکس کے پیرو کاروں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ انگریزی ادب میں مارکسی تنقید کے ممتاز نقاد کاڈول مانا جاتا ہے۔ مارکسی نقادوں کے نظریئے کے مطابق انسان جوں جوں ذرائع پیداوار میں تبدیلیاں کرتا ہے نئے سماجی تعلقات بناتا ہے تو اس نتیجے عمل خود بھی بدل جاتا ہے۔ اُس کے خیالات اور ان خیالات سے پروردہ اشیاء میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لیکن جب اخلاقیات۔ سیاسیات اور طرز وغیرہ جنم لے چکتے ہیں تو وہ قدرے آزادانہ طور پر نشوونما پانے لگتے ہیں۔ اپنے قوانین اور حرکت کی منطق بنا لیتے ہیں۔ نئی اشکال میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور باہمی تعلقات کے ذریعہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر ان کا اصلی محرک معاشیات میں ہوتی ہے۔ معاشیات ادب پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے اُوپری ڈھانچہ یعنی سیاسیات، مذہبیت، عمرانیات، فلسفہ میں تبدیلی لاتی ہے اور پھر اُن کے باہمی عمل سے ادب بھی متاثر ہوتا ہے۔ مارکس نے کبھی معاشیات اور فن کی مبدأ حرکت کو درست نہیں کہا۔ شعور اور ادب فن کار کی جداگانہ حیثیت کے پرتو نہیں۔ فن اُس کے تمام سماجی تعلقات کی مجموعی حیثیت کا عکس ہے۔ ادیب دُنیا اور اُس کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ ورثے میں پاتا ہے۔ کیونکہ جس طبقہ میں وہ پیدا ہوتا ہے ایسا طرزِ فکر اس سے مطابقت رکھتا ہے اور اگر ادیب کے سرپرست بھی اُسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں تو اُسے اپنے نظریئے میں تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن وہ اپنے طبقے کے خلاف بھی ادب کی تخلیق کر سکتا ہے اور یہ اُس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں ایک ایماندار فن کار کا فریضہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اُسے حقیقت کا علم ہو اور اُسے حقیقت کو بدلنا بھی پڑتا ہے اس لئے وہ انقلابی ہے۔ تخلیقی عمل شعوری ہوتا ہے۔ لیکن فن پارے میں فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اِس اظہارِ رائے کی وجہ سے فن فن کار کا اخلاقی عمل گردانا جاتا ہے۔ جامعیت اور صداقت کے ساتھ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی مساعی کے تناسب سے ادب

کی اہمیت متعین کی جاسکتی ہے۔ ادب کے اسی معاشی نظریئے کو پیش کرنے کے بعد مارکسی نقاد ادیب کے لئے ادبی تخلیق کے عمل اور ان کے عناصر کے لئے کچھ اُصول متعین کرتے ہیں جو کہ اُن کے خیال میں ادب کی افادیت میں ممد ثابت ہوں گے۔ اُن کے نزدیک ادیب کو سماجی حقیقت نگاری کرنی چاہیئے۔ گورکی کے الفاظ میں "حقیقت کے کُلّی وجود سے بنیادی خیال کو جدا کر کے اُسے تصویریت میں سمونے کو حقیقت نگاری کہتے ہیں۔ لیکن جو خیال جُدا کیا گیا ہے۔ اس میں اگر ہم پسندیدہ اور ممکن اجزا شامل کر دیں تو ہم رومانیت کی طرف راغب ہوتے ہیں جو حقیقت کے متعلق انقلابی رویہ پیدا کرنے میں ممد ہے اور یہ رویہ عملی طور پر دنیا میں تبدیلی لاتا ہے۔"

مارکسی نقاد نقدِ فن میں بھی جدلیاتی عمل کارفرما دیکھتے ہیں۔ ادب کے بھی دو پہلو ہیں۔ خارجی اور داخلی یہ دونوں پہلو جو بادی النظر متضاد نظر آتے ہیں اُن میں توازن پیدا کرنا ادیب کا کارِ منصبی ہے۔ خارجی پہلو عملی اور مقصدی ہوتا ہے اور داخلی پہلو تخیلی اور جمالیاتی۔ ادب تخیل کا پروردہ ہے جو بذاتِ خود کسی دَور کے مخصوص معاشی نظام کا پروردہ ہے۔ اس طرح ادب اجتماعی شعور اور جمہوری ذہنیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مارکسی نقادوں کے خیال میں معاشی ڈھانچے سے نہ صرف ادب کے مواد اور اقدار ہی متعین ہیں بلکہ اس کی تکنیک اور ہیئت بھی۔ اس لئے فنکار کی انفرادی آزادی کا نعرہ ایک فریب ہے۔ اس نظریئے کی روشنی میں ادب کی پرکھ کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ وہ کس حد تک اپنے عہد کی سماجی قوتوں کے باہمی عمل، طبقاتی کش مکش اور عوام کی تمناؤں کی عکاسی کی صداقت کر سکتا ہے۔

مارکسی نظریہ فن کے جائزہ سے کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ کیا مارکسیت جامد و ساکت فلسفہ ہے کیا ادب و فن پر اس کا میکانکی ڈھنگ سے اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیا یہ زندگی اور بالخصوص ادب پر کلّی طور پر قابلِ اطلاق ہے۔ کیا فن کو محض غیر ادبی، سیاسی یا اخلاقی معیار پر پرکھا جا سکتا ہے؟ کیا اس معیار سے ادب، صحافت اور پروپیگنڈا کا آلۂ کار نہیں بن جاتا۔ مارکسیت تخلیقی عمل کا تجزیہ کیسے کرتی ہے؟ کیا تخلیق کی اندرونی لگن کے بغیر تخلیقِ فن ممکن ہے؟ کیا سماجی حالات یا خارجی زندگی میں تبدیلی سے ادب براہِ راست متاثر ہوتا ہے؟ فن کے جمالیاتی عنصر کا سرچشمہ کیا ہے؟ نظریئے اور اقدار میں کیا فرق ہے؟ ادب کے اجزائے ترکیبی میں کون سی شے زیادہ اہم ہے۔ کیا مادی ترقی ہی ادیب کی ذہنی آزادی کا باعث بنتی ہے انفرادی آزادی کی کیا ماہیت ہے؟ کیا مارکسی فلسفہ ابدی اور مکمل ہے؟ انسان کی روحانی تشکیل اور تبدیلی کا کیا راز ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ کیا انسان کو بھی مشینوں کی طرح بدلا جا سکتا ہے۔ کلاسکی ادب کی عظمت کا کیا باعث ہے؟ اعلیٰ ادب کے کیا اجزائے ترکیبی ہیں، طبقاتی کشمکش کی پروردہ سماجی حقیقت نگاری کس طرح ماورائی حقیقت نگاری سے زیادہ اہم ہے؟

ادب کے خارجی اور افادی تجزیئے کے برعکس فرائڈ، ینگ اور ایڈلر نے داخلی تجزیئے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ حالانکہ ان ماہرین نفسیات میں باہمی اختلافات موجود ہیں لیکن اُن کے تجزیئے کا مرکز لاشعور ہے اور وہ لاشعور کو ادب کی تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے ہیں فرائڈ کے خیال میں انسان کی دبی ہوئی خواہش (جو بنیادی طور پر جنسی ہوتی ہے اور لاشعور میں پناہ گزین ہوتی ہیں کیونکہ اُن کا شعور احساسِ گناہ کو جنم دیتا ہے اور سماجی رسم و رواج اُن کے اظہار میں سدِ راہ ثابت ہوتے ہیں) بھیس بدل کر ہمارے سامنے آتی ہیں) انسان ان خواہشوں کو ہمیشہ دبا ہی نہیں دیتا بلکہ اُن کا ارتفاع (SUBLIMATION) کرتا ہے۔ اور اُس سے برتر سطح پر قلبِ ماہیت (TRANSMUTA-TION) کرتا ہے۔ جذبہ یا جبلت کسی ایسے موضوع کی طرف راغب ہو جاتی ہے جو سماج کی اقدار کے مطابق ہوتا ہے اور اس باعث اُسے ارفع سمجھا جاتا ہے۔ ادب اور فن اس ارتفاع اور تقلیب سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن ارتفاع کے اس عمل میں اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اور وہ سماجی طور پر قابلِ قبول ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ادیب کو ذہنی تسکین میسر ہوتی ہے۔ ادیب کے اپنے تخلیقی جوہر پر منحصر ہے کہ وہ کس

حدتک قلبِ ماہیت میں کامیاب ہوسکتا ہے اور اُس کو فن کی سطح پر لاسکتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ادب، فن، خواب، بیداری کے خواب، میں کوئی فرق نہیں۔ اُن کے عناصر ترکیبی مشترک ہیں۔ ان سب کا منبع خواہشات کی عدمِ تکمیل ہے۔ اس بھیس بدلنے سے ہی تخلیقِ حسن ہوتی ہے قاری جب ادب سے محظوظ ہوتا ہے تو اُس کا باعث بھی یہی ہے کہ اُس کی خواہشات بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچی ہوتی اور دبا دی جاتی ہے اور وہ لاشعور کے تہ خانے میں تکمیل کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے تخلیقِ ادب اور مطالعۂ ادب دونوں ہی دبی ہوئی خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ ہیں اس عمل کو اظہارِ جذبہ (CATHARSIS) بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کا ذکر ارسطو نے بھی المیہ سے لطف اندوز ہونے کے سلسلے میں کیا ہے ایڈمنڈ برگلر کے خیال میں ادیب کبھی بھی نورمل نہیں ہوسکتا وہ خود اذیتی ہوتا ہے اس لئے وہ دیدہ و دانستہ ایسے کام کرتا ہے جن سے اس کے مقصد کا حصول نہ ہوسکے۔ وہ اپنے تخلیقی عمل سے اپنے آپ کو پاگل ہونے سے بچاتے رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنا مکمل علاج نہیں ہونے دیتا کیونکہ دونوں صورتوں میں اُس کا تخلیقی عمل ختم ہوجاتا ہے۔ اس لئے وہ اس خود اذیتی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ فرائڈ نے ادیب کی ذہنی ساخت بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ لذت، قوت اور عشق کے لئے تڑپتا رہتا ہے اور وہ اس راز کو جانتا ہے کہ اپنے بیداری کے خوابوں کو کس طرح پھیلا دے جس سے کہ اُس کا شخصی پہلو جن میں دوسرے لوگوں کو دلچسپی ختم نہ ہونے پائے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوسکیں۔

ینگ نے آدمی کو مختلف ٹائپ میں تقسیم کیا ہے اُس کے خیال میں ادیب اور فن کار میں دو متضاد رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی ہونے کے باعث وہ اپنی زندگی خوشی و مسرت سے بسر کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اس کی تخلیقی لگن اُسے انسپریشن دیتی ہے۔ زندگی کی ضرورتوں اور تخلیق کی لگن کی اس کشمکش سے ادیب بے چین رہتا ہے اور اُسے اُس وقت تک اطمینان نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس کش مکش کو ختم نہیں کر دیتا یا ایک کی دوسرے پر فوقیت قائم نہیں کر دیتا۔ ادیب اپنی زندگی کی ضرورت کو تخلیق کی لگن کے تابع کر دیتا ہے۔ جس کے باعث وہ ہمیشہ غم زدہ اور آلام میں گھرا رہتا ہے۔

ینگ نے اجتماعی لاشعور کو تخلیقی عمل کا ابدی سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ینگ نے اس "اجتماعی لاشعور" کو ڈسٹربن نہیں سمجھا بلکہ انسان کے تخلیقی اور تخریبی روح کا منبع کہا ہے۔ اجتماعی لاشعور کسی ایک خاص آدمی کے لاشعور میں ہم جتنا گہرا جاتے ہیں۔ فن اتنی گہرائی حاصل کرتا ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے دَور کے شعور کو وقت کی رفتار کے مطابق نہیں ڈھال سکتا تو اجتماعی لاشعور حرکت میں آکر کسی بڑے آدمی یا شاعر کے ذریعہ اس کو مکمل ہونے دیتا ہے۔ ینگ کے خیال میں فن کار ساری نوعِ انسانی کی اُن شدید خواہشوں کا اظہار کرتا ہے۔ جن کا تعلق اُس کے مخصوص دَور کی خامیوں کو دُور کرنے اور ایک نئے توازن کے حصول کے ساتھ ہے۔ ایلیٹ نے اس ضمن میں لکھا ہے۔

"کہ فن کار اپنے ہم عصروں سے زیادہ ابتدائی اور زیادہ تہذیب یافتہ ہوتا ہے۔ مہذب انسان میں قبل از استدلال کا رجحان قائم رہتا ہے۔ جو صرف شاعر کو یا اُس کے ذریعے میسر ہوتا ہے۔"

کسی ادبی تخلیق کی ہمہ گیری کا اندازہ اجتماعی لاشعور کی مطابقت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمیں فن کی پرکھ کی کسوٹی میسر ہوتی ہے۔

اڈلر نے ادب اور فن کو احساسِ کمتری کی تلافی (Compensation) کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ جس کے ذریعے ادیب کو تسکین میسر ہوتی ہے۔ ادیب جسمانی یا ذہنی کمتری (تخیلی یا حقیقی) کو دُور کرنے کے لئے لاشعوری طور پر کسی ایسے عمل یا ذریعے کو اپناتا ہے جس سے وہ اس کے اس احساس پر ایک ایسا احساس غلبہ پا لیتا ہے جو اسے کمتر کے بجائے برتر بنا دیتا ہے۔ ادب و فن بھی اس عمل کی ایک قسم ہے۔ یہ تلافی جسمانی یا ذہنی دونوں طرح کی ہوسکتی ہے۔ ادیب کی یہ کوشش اُسے سماجی مقصد کی طرف لے جاتی ہے جس کے باعث وہ اخوت

کی قدر کو اپناتا ہے۔ اور اس طرح تخلیقِ فن فریب کُن انا پرستی کو دُور کرکے سماجی طور پر کارآمد مقصد کے حصول کے لیئے کوشاں رہتی ہے۔ ایڈلر کے اس نظریئے سے ادب کا افادی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ادیب اپنی تخلیق کے ذریعہ دوسرے لوگوں کے دل پر اثر حاصل کرلیتا ہے اور اِس طرح اُس کے احساسِ کمتری کی تسکین ہو جاتی ہے اور حصولِ قوت کے اِرادے کو تسکین ملتی ہے۔ ایڈلر کے نقطۂ نظر سے ادب و فن میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جبکہ ادیب یا فن کار اپنی جسمانی یا ذہنی کمتری کے باعث فنی عظمت حاصل کر سکا ہے۔ اس طرح فن احساسِ کمتری کی اذیت کو دُور کرکے اُسے بلند تر سطح پر لے آتا ہے۔ ایڈلر نے شعور اور لاشعور کے فرق کو مصنوعی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس شے یا خیال کے بارے میں ہم شعور حاصل کرنا چاہتے ہیں کر سکتے ہیں۔ اس طریقے سے کمتری کا احساس برتری میں بدل جاتا ہے۔ دوسری بات جس پر ایڈلر نے زور دیا ہے کہ جنسی محرک کے بجائے حصولِ قوت کا اِرادہ زیادہ اہم ہے۔ اس نظریئے کے مطابق نہ صرف ہمیں ادبی تخلیق کے عمل کا علم حاصل ہوتا ہے بلکہ فن کی کسوٹی بھی بدل جاتی ہے۔ یعنی کس طرح اپنی ذاتی زندگی کی محرومیوں کو سماجی بھرپور پن میں بدل کر سماجی نصب العین کو پورا کر سکتی ہے۔

فرائیڈ کی جنسی جبلت، ینگ کے اجتماعی لاشعور، اور ایڈلر کے احساسِ کمتری نے ادب اور فن میں کئی رجحانات کو جنم دیا ہے۔ جن میں سرریلزم اور وجودیت خاص طور پر اہم ہیں۔ ادب میں الہام پرستی اور اشاریت وغیرہ کے میلانات بھی لاشعور اور ادب کے باہمی رشتے سے وجود میں آتے ہیں۔

نفسیاتی نظریے میں لِپس کا نظریہ (EMPATHY) یعنی مشترک جذبے سے داخلی عکاسی بھی کافی مشہور ہے۔ لیکن کئی بار مناظر فطرت میں ادیب خارجی طور پر اپنی ترجمانی کا احساس کرتا ہے۔ اس طرح خیالات کے ربط میں صرف تسلسل ہی نہیں بلکہ اُن کی بنیادی وحدت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ادب اس لیئے تنوع میں وحدت کو پیش کرنے کا عمل گردانا گیا ہے۔ کچھ ماہرِ نفسیات ادب کو بھی تفریحی طریقہ کار (PLAY) مانتے ہیں۔ جس سے کہ ادیب اور قاری کے متبع جذبات کو اظہار کا راستہ مل جاتا ہے۔ جو کہ حقیقت سے فرار اور اخراج (PURGATION) ہے۔ ادب صرف متبع جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ اُن کو ایک برتر سطح پر ایک وحدت میں منظم کرکے افادی اور جمالیاتی طور پر پیش کرتا ہے۔

علمِ نفسیات میں لاشعور کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اُسے کچھ ذہنی کمزوریوں تک محدود کر دینا انسانی ذہن کو جنوبی اور مسخ تصویر پیش کرنے کے مترادف ہے۔ انسانی ذہن کو مختلف خانوں میں تقسیم کرکے اُس کے کسی ایک حصے سے مکمل زندگی کی تاویل پیش کرنے سے غلط نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہی کہ انسانی زندگی کی مجموعی حیثیت قابلِ غور ہے بلکہ اُس کے سماجی پہلوؤں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ فرائیڈ کے نظریات کو بنیاد دینے کے لیئے مارکسی فلسفہ اور علم سماجیات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ سماجی حالات انسانی زندگی کی داخلی کیفیات سے آزاد بھی وجود رکھتے ہیں۔ اور اُن پر آدمی کے لاشعور کا اثر بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ضروری ہے کہ لاشعور کی حقیقت کا رشتہ دوسرے حقائق سے بھی استوار کیا جائے اور اُن کے باہمی عمل کو واضح کیا جائے۔ فن کار یا ادیب زندگی کی جزوی حقیقت اور وہ بھی محض ذہن کے ایک محدود عمل کی حقیقت کو پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ مکمل زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے رشتے میں اپنی تخلیقی قوت کو بروئے کار لاتا ہے۔ اُس کا تخلیقی عمل شعوری مساعی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چاہے اُس کا محرک لاشعور ہی کیوں نہ ہو۔ بیداری کے خواب اور فنی تخلیق میں فرق ہے۔ کیونکہ خواب محض خواب کی سطح پر ہی ختم ہو جاتا ہے، لیکن ادیب تخلیقِ فن میں اُسے خارجی پیکر عطا کرتا ہے۔ اس لیئے فن کی پرکھ کے معیار میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا مختلف النوع نظریات کی روشنی میں یہ کہنا موزوں نہ ہوگا کہ یہ نظریات ادب اور فن کے جزوی صداقت کو پیش کرتے

میں۔ ادبی تخلیق کی صلاحیت محض عقل، مشاہدہ، تجربہ (انفرادی اور سماجی) اور وجدان سے ظہور میں نہیں آتی بلکہ صداقت کے شعور میں ان تینوں اجزا کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ تنقید کا مقصد اُن اقدار کی تشکیل میں حصہ لینا ہے جو اپنے ماضی کے تسلسل میں حال کی روح جو اپنے اندر سمو کر مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اِن اقدار میں سماجی عمل اور انفرادیت سلاسل کو پہلے سے بہتر انسان اور سماج کی تعمیر کے لئے انسپریشن دیتے ہیں۔ ادب میں حقیقت پرستی اور آدرشن کا سنگم ہونا چاہیئے۔ جس کے باعث ادب میں روح عصر سموتے ہوئے بھی اپنے دور کا ماورا ہونے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ جمالیاتی پہلو کے ساتھ افادی پہلو بھی وابستہ ہے۔ اس جمالیاتی عنصر کے باعث ہی فن کار کی انفرادیت اور صلاحیت کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی ہمیں روایت اور انفرادیت کے مسئلہ پر بھی غور کرنا لازم ہے۔ اس بحث کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ فن ستیم، شوم، سندرم، (صداقت، افادیت اور حُسن) کا متوازن امتزاج ہے۔ ادب سے ہم اسی لئے اثر قبول کرتے ہیں اور انسپریشن لیتے ہیں کہ اس کے مطالعہ سے ہم اپنے شعور اور جذبات کی عام سطح سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل ادیب اور نقاد دونوں کے ذہن میں پہلے ہی مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں اہلِ علم پر کیا گزری

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

ماہ مئی ۱۸۵۷ء میں آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے جو تیز و تند آندھی دہلی میں چلی اُس سے اس قدر تباہی اور غارت گری پھیلی جس کی انتہا نہیں۔ ہزاروں گھر برباد ہو گئے۔ محلے کے محلے صاف ہو گئے۔ جو بازار نہایت آباد تھے اُن کا نام و نشان نہ رہا۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ امیر ذلیل ہو گئے۔ شریف در بدر مارے مارے پھرنے لگے۔ جن باعصمت دوشیزاؤں کو چاند نے بھی بے پردہ نہ دیکھا تھا وہ بحالِ تباہ ننگے پاؤں۔ ننگے سر جنگلوں میں ٹھوکریں کھانے لگیں۔ سینکڑوں معصوم بچے ذبح کر ڈالے گئے۔ ہزاروں عورتوں کی عصمت بری طرح لوٹی گئی۔ خاندان اُجڑ گئے۔ قبیلے تباہ ہو گئے۔ ہزاروں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ سینکڑوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بہت سے بے گناہوں کو پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔ اور بہت سوں کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ہزاروں پر بیدیں اور کوڑے ایسے پڑے کہ کھالیں اُدھڑ گئیں۔ بکثرت لوگوں کو جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ٹھونس دیا گیا۔ امرا کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اُن کے محلات ڈھا دیئے گئے اور اُن کو یا تو شہر بدر کر دیا گیا۔ یا گرفتار کر لیا گیا اور یا قتل کر دیا گیا۔ غرض ایسی تباہی اور ایسی غارت گری دلی کی سرزمین نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جیسی ۱۸۵۷ء میں دیکھی۔

اس پُرآشوب اور پُرفتن دور میں دہلی کے اہل علم و فضل پر جو گذری۔ اُس کی ایک ہلکی سی جھلک ہم آپ کو اس مضمون میں دکھاتے ہیں۔ دوسرے طبقات کے لوگوں پر جو قیامت ٹوٹی اُس کا اندازہ اس سے لگا ئیں۔

اس مضمون میں ہم تفصیل سے کام نہیں لیں گے۔ بلکہ اسے بہت مختصر طور پر بیان کریں گے۔ کیونکہ مقصود عبارت آرائی نہیں بلکہ حقیقت نگاری ہے۔ اور اُس کے لئے یہ اشارے کافی ہیں۔

۱۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہم مرزا اسد اللہ خاں غالب کو لیتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے خطوط اور کتابوں میں اس تباہی کا نہایت اثرانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مرزا دہلی میں بلیماروں کے محلے میں رہتے تھے۔ ان کے مکان کے سامنے ہی شریفی خاندان کے حکماء کے گھر تھے۔ اس خاندان کے بعض حکیم مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا بہت گہرا دوست اور معاون تھا۔ اس لئے دہلی میں ہنگامہ کے بعد دوبارہ شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور ہر طرف زور شور کے ساتھ لوٹ مار شروع ہو گئی تو مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے فوراً پہنچ کر حکیموں کے مکانات کی حفاظت کرنی شروع کی۔ اس لئے مرزا کا مکان بھی لوٹ مار۔ قتل و غارت اور تباہی و بربادی سے محفوظ رہا۔

مگر اور سب قسم کی مصیبتیں مرزا کو برداشت کرنی پڑیں۔ یہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ نہ باہر جا سکتے تھے۔ نہ کھانے پینے کی کوئی چیز باہر سے منگوا سکتے تھے۔ بعض مرتبہ پینے کو پانی تک میسر نہ ہوتا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی ان سے ذرا فاصلے پر ایک مکان میں رہتے تھے۔ اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت شہر کی حالت یہ تھی کہ نہ مردے کو غسل دینے والا ملتا تھا۔ نہ گورکن دستیاب ہوتا تھا۔ اور نہ کفن کے کپڑے کا کوئی انتظام ہو سکتا تھا۔ گھر میں سے دو چادریں نکال کر مرزا نے دیں کچھ دردمند ہمسائے جمع ہو گئے جنہوں نے خود ہی مردے کو نہلایا۔ اور اُن چادروں میں اُس کے بدن کو لپیٹ دیا۔ اور خود ہی قریب کی ایک مسجد کے صحن میں تھوڑا سا گڑھا کھود کر اُسے دفن کر دیا۔

جب شہر لٹنے لگا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی تو مرزا نے بیوی کا سارا زیور اُتار دور کہیں لے جا کر زمین میں گاڑ دیا کہ جب امن امان ہو جائے گا تو نکال لوں گا۔ لیکن جب کئی مہینے کے بعد نکالنے کے لئے گئے تو وہاں ایک چھلا بھی نہ ملا۔ لوگ سب کھود کر لے گئے۔

مرزا اُس زمانہ میں گھر میں قید تھے۔ سرکاری پنشن اور قلعہ معلّٰی کا وظیفہ دونوں بند تھے۔ بڑی سخت مصیبت اور تنگی میں یہ ایام بسر ہوئے۔ نہ پینے کو شراب ملتی تھی۔ نہ کھانے کو روٹی۔ زندگی دوبھر تھی اور جان عذاب میں مبتلا تھی۔ ناچار گھر میں پہننے اوڑھنے۔ بچھانے اور استعمال کرنے کے جو اور جس قدر کپڑے اور ملبوسات تھے۔ اُن کو اونے پونے بیچ کر پیٹ کی آگ کو بجھاتے تھے۔ خود لکھتے ہیں:" اور لوگ روٹی کھاتے تھے میں کپڑا کھاتا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ جب کپڑے بھی ختم ہو جائیں گے تو برہنگی اور گرسنگی دونوں کا شکار ہو جاؤں گا۔" اُن کا دکھڑا ان الفاظ میں روتے ہیں۔" غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر کی۔ باجرہ بارہ سیر کا۔ گیہوں تیرہ سیر کے۔ چنے سولہ سیر کے۔ گھی روپے کا ڈیڑھ سیر"۔ (کاش ہمارے زمانہ میں یہ چیزیں اتنی "مہنگی" ہو تیں تو ہم غریب لوگ نہال ہو جاتے)

مرزا حالانکہ بالکل خانہ نشین تھے۔ اور کسی سے کسی قسم کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ رکھتے تھے۔ مگر ایک دن دھر لئے گئے کچھ گورے دن دہاڑے مکان میں گھس آئے اور ان کو پکڑ کر کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ اُس نے پوچھا" ول تم مسلمان؟" فوراً جواب دیا" حضور! آدھا" کرنل نے بگڑ کر پوچھا" کیا مطلب؟" کہنے لگے" شراب پیتا ہوں سؤر نہیں کھاتا۔" اس عجیب فقرے پر کرنل کو ہنسی آ گئی۔ کرنل کو ہنستا دیکھ کر مرزا نے موقع کو غنیمت سمجھا اور جھٹ بغل میں سے وہ شکریہ کی چٹھی نکال کر کرنل کے آگے رکھ دی۔ جو وزیر ہند نے لندن سے مرزا کو لکھی تھی جس میں اُس قصیدہ کی رسید تھی۔ جو مرزا نے وکٹوریہ کی شان میں لکھ کر بھیجی تھی۔ اس سے مرزا کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرنل پر کریں۔ اور اس طرح اپنی جان بچائیں۔ چنانچہ یہ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ وزیر ہند کی چٹھی دیکھ کر کرنل مسکرایا اور اُس نے پوچھا" ول تم فتح دہلی کے بعد پہاڑی پر ہمیں مبارک باد دینے کے لئے کیوں نہ آئے"؟ جواب دیا" حضور! میں چار کہاروں کا افسر تھا۔ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پھر میں کیونکر حاضر ہوتا؟" اس پر کرنل نے مہربانی کے چند کلمے کہے اور مرزا کو رخصت کر دیا۔

مرزا نے ۱۸۵۷ء تک جو کچھ فارسی اُردو میں کہا تھا۔ اس آندھی میں سب اُڑ گیا۔ کچھ نہ بچا۔ اپنے کلام کی تباہی کی کیفیت خود مرزا کی زبان سے سنیئے۔ کہتے ہیں:" غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام کیا نظم کیا نثر۔ کیا اُردو کیا فارسی۔ میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو (رخشاں و نیّر) میرے سلطنی بھائی نیز شاگرد رشید اور ناصر حسین مرزا ہندی و فارسی

نظم و نثر کے سوالات مجھ سے کر کے اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن دونوں کے گھر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ نواب ضیاء الدین کا کتب خانہ بیس ہزار کی مالیت کا سب لٹ گیا ایک ورق نہ رہا۔ اسی میں میرے مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔ ایک دن ایک فقیر کہ خوش الحان بھی تھا اور زمزمہ پرداز بھی۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ یقین جانو کہ مجھ کو رونا آیا۔"

اس قیامت خیز زمانے میں اپنے عزیزوں۔ دوستوں اور شاگردوں کو وقتاً فوقتاً جو خطوط غالب نے لکھے اور اُن میں دلی کی تباہی اور بربادی اور اپنی معذوری و مجبوری اور پریشانی و بےکسی کے جو واقعات بیان کئے۔ وہ یکجائی طور پر غالب کے اپنے الفاظ میں مختصراً یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"اس فلک کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال۔ جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بےنوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیا کرتے تھے۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء دوپہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا قہر الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔"

"پانچ لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا حملہ باغیوں کا لشکر۔ اُس میں اس شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں (انگریزوں) کا۔ اُس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سب لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مر گئے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم۔ لیکن جس کو تپ آئی اُس نے اعضا میں طاقت نہ پائی۔"

"میرا حال سوائے میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں بھی فرق آ گیا تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ۔ غمِ فراق۔ غمِ رزق۔ غمِ عزت۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو غم مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریزوں کی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اُن میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق۔ کوئی میرا دوست تھا اور کوئی یار۔ کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ دوست کچھ عزیز۔ کچھ شاگرد کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اُس کی زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے ہائے اتنے یار مرے کہ جب میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہو گا۔"

"وہ دلی نہیں جس میں سات برس کے سن سے آتا جاتا تھا۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا۔ بڑے بڑے نامی بازار۔ خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور ہماری دکان کہاں تھی؟"

"بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرہ یا گراب۔ اکتوبر کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ تخت پر بیٹھے۔ ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینہ بعد دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ اُنہوں نے "دہلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے اسی زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ دونوں سکے سنے اور اُن کو یاد کیا۔ یہ

دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہنے گنگنداتے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ئے ہند میں" دتی اردو اخبار" ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پہ رہا۔ پنشن بھی گیا اور ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔"

"تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔"

"میری بریت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس میں پنڈ چھوٹا۔ میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار و خلعت جو معمولی مقرر تھا مسدود ہوگیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرٹر بھی مجھ سے نہ ملے۔ اور کہلا بھیجا کہ" غدر کے دنوں میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔"

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر پر انگریزوں کے دوبارہ مسلط ہونے کے بعد مسلمان خاندانوں پر جو دہلی میں تھے سخت تباہی پھیلی اور وہ ہزاروں کی تعداد میں دہلی دروازہ۔ ترکمان دروازہ اور اجمیری دروازہ سے شہر کے باہر نکل گئے اور جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا۔ سارا شہر آن کی آن میں ویران اور برباد ہوگیا۔ اس کیفیت کو غالب اس طرح لکھتے ہیں:۔

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار۔ پنشن دار۔ دولت مند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں رہا۔ مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

"میں اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے تو شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ شہر میں جرنیلی بند و بست (مارشل لا) جاری ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔"

شہر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کو دہلی کے اندر واپس آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس پر انہوں نے کچے پکے مکان شہر سے باہر بنانے شروع کر دیے۔ تاکہ سر چھپانے کا کھٹکا نہ تو ہو۔ لیکن ان کا جو کچھ حشر ہوا وہ غالب سے سنیئے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دوکان کیوں بنواتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انہیں گرا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیئے شہر کے بسنے کی کون سی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک للّٰہ والحکم للّٰہ۔"

"لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو آدمی باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آجاتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ اور آٹھ دن کی قید ہوتی ہے۔"

اپنے دوستوں اور عزیزوں کی تباہی اور ہلاکت پر یوں خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

"بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی ملک عدم ہوگئے۔ سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں۔ جو دو چار باقی رہے خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم اُن کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔"

"ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں .... ایک کونے میں بیٹھا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ اور "یا حافظ" "یا حفیظ" کا ورد کر رہا ہوں۔"

فتح کے بعد انگریزوں نے اپنا انتقام اہل شہر سے تو اس طرح لیا کہ سینکڑوں کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ بیسیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ہزاروں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور خود شہر سے اس طرح انتقام لیا کہ محلّے زمین کے برابر کر دیئے۔ ہزاروں مکانات ڈھا دیئے۔ بازار گرا دیئے۔ دکانیں مسمار کر دیں۔ مسجدیں منہدم کر دیں۔ اس تباہی کی کیفیت غالب اپنے دوستوں کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں:-

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ کی گولائی میں دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ۔ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھایا جائے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیریت ہے۔ حاکم اکبر کی آمد آمد سن رہے ہیں۔ دیکھئے دلّی آئیں یا نہ آئیں۔ آئیں تو دربار کریں یا نہ کریں۔ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہ بلایا جاؤں۔ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہ پاؤں۔ پنشن کا نہ کہیں ذکر ہے نہ کسی کو خبر ہے۔"

"کشمیری کٹڑہ گر گیا ہے۔ وہ اونچے اونچے درِ اور۔ وہ بڑی بڑی کوٹھڑیاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔"

"بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں۔ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ چاندنی چوک۔ ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں رہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

میر مہدی مجروح اسی زمانہ میں دہلی سے نکل کر پانی پت چلے گئے تھے۔ انہوں نے لکھا "میری آنکھیں دکھ رہی ہیں" جواب میں مرزا فرماتے ہیں:-

"تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور اُن سے جتنی گرد اُڑی اُس کو آپ نے ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔"

ایک دوسرے خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

"مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا میدان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس طرف کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ۔ دھوبی کٹڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹڑہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ اور حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر کا صحرا ہو گیا۔ اب کنوئیں بھی جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔"

"اے بندۂ خدا۔ اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔"

غرض دہلی کی تباہی پر غالب آٹھ آٹھ آنسو روئے ہیں۔ انہوں نے خطوط میں اس تباہی و بربادی کی کیفیت بیان

لکھنے کے علاوہ ایک کتاب بھی "دستنبو" کے نام سے خاص اس ہنگامہ کے حالات پر فارسی میں لکھی تھی۔

۲- غالب کے بعد سرسید کی بپتا سنیئے۔ سرسید اس وقت انگریزوں کے ملازم اور بجنور میں صدرامین (مجسٹریٹ) تھے۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو وہاں خبر پہنچی کہ ۱۰ مئی کو انگریزی عملداری دہلی میں ختم ہوگئی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی ہر طرف فساد اور بلوے شروع ہوگئے۔ اور جو ۲۰ انگریز اس وقت مع کلکٹر ضلع کے بجنور میں تھے۔ سب کی جانیں خطرے میں پڑگئیں۔ مگر سرسید نے حق نمک ادا کیا اور اپنی جان کو سخت خطرہ میں ڈال کر انگریزوں کی حفاظت کی۔ لیکن جب اُن کا بجنور میں رہنا ناممکن ہوگیا تو اُن کو رڑکی روانہ کردیا۔ جہاں انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ اس امداد کا فی الوقت سرسید کو یہ بدلہ ملا کہ نواب محمود خاں جو اس وقت موقع سے فائدہ اُٹھا کر بجنور کا خودمختار والی بننا چاہتا تھا۔ اور نہایت مُصر تھا کہ کلکٹر ضلع اور تمام انگریزوں کو فوراً قتل کر ڈالا جائے۔ نہایت ناراض ہوا۔ اُس نے اوّل سرسید کو سید ہونے کی وجہ سے تمام ضلع میں بااثر اور بارسوخ سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر جب سرسید اس پر راضی نہ ہوئے تو اُس نے اُن کو اُن کے مکان سے جبراً نکال دیا اور گھر کا سارا اسباب لُوٹ لیا۔ یہ بجنور کے قریب ایک موضع ہلدور میں چلے گئے۔ محمود خاں نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور بہت سے مکان جلا دئے سرسید بحال تباہ وہاں سے نکلے اور پیدل میرٹھ کو روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں مسلح گنواروں نے ان کو گھیر لیا اور پکڑ کر مار ڈالنا چاہا۔ بخشی نامی ایک شخص نے بڑی مشکل سے ان کی جان بخشی کرائی۔ وہاں سے چاندپور پہنچے۔ وہاں بھی ان کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا اور تلواروں اور برچھیوں سے بھرے ہوئے لوگوں نے ان کا خاتمہ کردینا چاہا۔ میر صادق علی خاں رئیس چاندپور کی بدولت ان کی جان بچی۔ یہ جھڑاؤں روانہ ہوئے اور وہاں بہت مشکل سے پہنچے۔ کیونکہ مسلسل تکلیفوں اور اذیتوں کے باعث نہایت مضمحل اور کمزور ہوگئے تھے اس لئے مجبوراً مولوی محمود عالم کے ہاں قیام کیا۔ جب کچھ چلنے پھرنے کی طاقت آئی تو پھر سفر پر روانہ ہوئے۔ غرض گرتے پڑتے ٹھیرتے ٹھیراتے بمشکل تمام میرٹھ پہنچے۔ جو اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کا سب سے بڑا فوجی مرکز تھا۔ جس وقت سرسید نہایت صعوبتیں اُٹھاتے ہوئے میرٹھ پہنچے ہیں اُس وقت اُن کی حالت یہ تھی کہ جسم پر (جگہ جگہ سے پھٹا ہوا) ایک کرتہ تھا۔ اور نہایت میلا چیکٹ کا ایک پاجامہ۔ مگر کرتے کی جیب میں البتہ چھ پیسے کی "گرانقدر رقم" تھی۔

بہزار خرابی مرمر کر سرسید میرٹھ پہنچے تھے۔ اس لئے پانچ مہینے تک صاحب فراش رہے۔ جب کچھ توانائی اور طاقت آئی تو اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے افراد کا حال معلوم کرنے کے لئے دہلی روانہ ہوئے۔ اُدھر ان کے گھر کا یہ حال ہوا کہ انگریزی فوج جب دوبارہ شہر میں داخل ہوئی تو فوج کے "بہادر" سپاہیوں نے ان کا گھربار مال و اسباب سب لُوٹ لیا۔ ان کے ماموں وحیدالدین اور ماموں زاد بھائی ہاشم علی کو مار ڈالا۔ اور سارے کنبے کو شہر سے باہر نکال دیا۔ صرف والدہ اور خالہ باقی رہ گئیں۔ مگر اُن کے لئے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ قریب ہی ایک کوٹھڑی میں ایک لاوارث بڑھیا زیبن نامی رہتی تھی۔ اُسی کے پاس یہ دونوں چلی گئیں۔ اور آٹھ دن تک بڑی سخت تکلیف کی حالت میں وہاں رہیں۔ نہ کھانے کو ٹکڑا۔ نہ پینے کو پانی۔ نہ سونے کو بستر۔ نہ بیٹھنے کو پلنگ۔ کوٹھڑی کی کچی زمین اور دو نازپروردہ عورتیں۔ نہ پوچھو کہ کس مصیبت اور تکلیف کے ساتھ اُنہوں نے یہ دن گزارے۔ اتفاق سے تھوڑا سا گھوڑے کا دانہ مل گیا۔ اس کو پھانکتی اور چباتی رہیں۔ تعجب ہے کہ ایسی حالت میں زندہ کس طرح رہیں۔ سرسید نے مولانا حالی سے بیان کیا کہ "جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو میری والدہ

نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "میں سید! تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں۔ تم فوراً چلے جاؤ۔ ہم پر جو گزرے گی گزر جائے گی۔" میں نے کہا۔ "آپ خاطر جمع رکھئے۔ میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔" تب اُن کی خاطر جمع ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے دو دن سے پانی نہیں پیا۔ تو میں پانی کی تلاش میں باہر نکلا۔ مگر کنوئیں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی۔ جس سے پانی نکالا جا سکتا۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ ناچار میں پھر قلعہ میں گیا۔ اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب کوٹھڑی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زیبن بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے۔ اور بہت بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ میں نے اُس کے آبخورہ میں پانی ڈال دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا۔ پھر کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں اُن کے لئے پانی لے جاؤں گی اور اسی لئے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں اُسے پانی دیا۔ وہ اُسے پی کر وہیں زمین پر لیٹ گئی۔ میں دوڑا ہوا کوٹھڑی کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو پانی پینے کو دیا۔ اُنہوں نے پانی پی کر خدا کا شکر کیا۔ میں باہر نکلا کہ سواری کا کچھ بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جاؤں۔ مگر باہر آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ زیبن مری پڑی ہے۔ پھر میں نے سواری تلاش کی اور حکام نے بھی میرے لئے سارے شہر میں احکام جاری کئے۔ لیکن کوئی بھی سواری نہ ملی۔ اس پر میں قلعہ کے اندر گیا۔ اور وہاں کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک روزانہ میرٹھ کو لے جاتی ہے وہ سید احمدؐ کو مل جائے۔ میں شکرم لے کر کوٹھڑی پر آیا۔ اور والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔"

چونکہ سرسید کی والدہ نے ان ایام میں بھوک اور پیاس کی سخت مصیبت اُٹھائی تھی۔ اس لئے اُن پر صفرا کا غلبہ ہو گیا تھا۔ کوئی غذا انہیں ہضم نہ ہوتی تھی۔ آخر اسی حالت میں میرٹھ آنے کے تھوڑے دنوں بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ سرسید کو والدہ سے بیحد محبت تھی۔ اُن کو نہایت سخت صدمہ ہوا۔ مگر چارہ کار بھی کیا تھا؟

کچھ دنوں بعد سرسید کو حکم ہوا کہ فوج لے کر جائیں اور ضلع بجنور کا انتظام کریں۔ یہ موقع اُن لوگوں سے بدلہ لینے کا بہت اچھا تھا جنہوں نے سرسید کا گھر بار لوٹا تھا۔ اُنہیں سخت تکلیفیں دی تھیں اور اُن کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرسید جس کی طرف اشارہ کرتے۔ فوراً بلا پوچھ اُسے پھانسی دے دی جاتی یا گولی سے اُڑا دیا جاتا۔ مگر سرسید نے عالی ظرفی سے کام لے کر کسی ایک شخص کے لئے بھی نہیں کہا کہ یہ بھی مجھ پر حملہ کرنے والوں میں سے تھا۔ مولانا نذیر احمدؐ اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں۔ "سید احمدؐ خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا۔ اس عرصی بدتمیزی میں خود سید احمدؐ خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے تھے بلکہ قریب تھا کہ ہلاک کردیں۔ عود تسلط کے بعد اُس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمدؐ خاں کی مٹھی میں تھی۔ اگر اُن کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر نیک طبیعت سید احمدؐ کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع ایسا تھا جو عواقب غدر سے محفوظ رہا۔"

انگریز بچوں اور عورتوں کی جانیں بچانے کے صلہ میں امن و امان ہو جانے کے بعد انگریزی حکام نے ایک بہت بڑی جاگیر ایک مسلمان رئیس کی ضبط کرکے بطور صلہ سرسید کو دینی چاہی مگر نواب محسن الملک لکھتے ہیں کہ "سید احمدؐ خاں نے صرف

اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کر دیا۔ کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی"۔

اس واقعہ کے متعلق ایک موقع پر خود سر سید نے کہا تھا "غدر میں جو حال انگریزوں اور اُن کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا۔ اور نامی خاندان برباد اور تباہ ہوئے۔ ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا۔ نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اُس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مسٹر شکسپیئر (کلکٹر ضلع بجنور) نے جن کی مصیبت میں ہم اور ہماری مصیبت میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ اس لئے میں نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔ اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں (بجنور سے تبدیل ہو کر) مراد آباد آیا جو ایک بڑا ماتم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں بلکہ مجھے اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑے اس کے دُور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ اس لئے میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"۔

۳۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مولوی فضل امام کے صاحبزادے اور عربی و فارسی کے بڑے زبردست فاضل تھے منطق۔ فلسفہ اور ادب میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اُن کے زمانے کا کوئی بھی شخص علم و فضل میں اُن سے بڑھا ہوا نہیں تھا۔ وطن خیر آباد تھا۔ مگر بچپن۔ جوانی اور بڑھاپا دہلی میں گذرا۔ دہلی کے معزز ترین افراد اور چوٹی کے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دلّی کی صدر الصدوری کے ساتھ ساتھ تعلیم و تعلم اور شعر و سخن کا چرچا بھی جاری رہتا تھا۔ کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

جن علماء نے اُس وقت انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ اُن میں مولانا کا نام سرفہرست تھا۔ پھر بھلا انگریز انہیں کیوں بخشتا؟ چنانچہ گرفتار کر لئے گئے۔ انہوں نے اپنی گرفتاری کے حالات۔ قید و بند کی صعوبتیں اور جزائر انڈیمان کی تکلیفوں کے واقعات مفصل طور سے عربی زبان میں لکھے ہیں۔ اس کتاب کا نام "الثورة الهندیہ" ہے۔ اُس سے بہت ہی مختصر طور پر کچھ اقتباس ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ جس سے مولوی فضل حق کے مصائب کا آپ کو تھوڑا سا اندازہ ہو گا۔

"جب شہر دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ تو مسلمانوں میں جو شہر کے اندر مقیم تھے سخت سراسیمگی اور پریشانی پھیلی۔ میرے اکثر اہل و عیال دہلی میں موجود تھے۔ میں فوراً جس طرح بھی ہو سکا دہلی پہنچا۔ دہلی میں اُس وقت غلہ اور ضروریات زندگی کی دستیابی ناممکن تھی۔ پانچ شبانہ روز فاقہ کی مصیبت میں گزارے۔ پھر اپنی عزیز ترین متاع یعنی کتابوں کو وہیں چھوڑ کر اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔ لکھنؤ پہنچ کر خاموشی اور عزلت گزینی کی زندگی اختیار کی۔ جب وکٹوریہ نے عام معافی اور امن و امان کا پروانہ جاری کر دیا

تو اس کے تھوڑے ہی دن بعد ایک انگریز حاکم نے مجھے گھر سے بلا کر قید کر دیا۔ مجھ پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ تمام جائداد۔ گھر بار اور ہر قسم کی میری ملکیت ضبط کر لی گئی۔ بھاری بھاری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں مجھے پہنا دی گئیں۔ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں مجھے تبدیل کیا جاتا رہا۔ میرا لباس اتار کر موٹے اور سخت کپڑے مجھے دے دیئے گئے۔ میرا نرم اور آرام دہ بستر چھین کر خراب۔ سخت اور تکلیف دہ بچھونا میرے حوالے کیا گیا۔ وہ بچھونا کیا تھا گویا میرے نیچے کانٹے بچھا دئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریوں پر مجھے لیٹنے کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا۔ لوٹا۔ پیالہ اور ہر ایک برتن سے بھی مجھے محروم کر دیا گیا تھا۔ ماش کی دال کھانے کو اور گرم پانی پینے کو مجھے دیا جاتا تھا غرض میری ذلت اور رسوائی میں میری عزت اور میرے بڑھاپے کے باوجود کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ان تمام تکلیفوں کے بعد مجھے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی جس کے بعد مجھے ایسے وحشتناک اور ہولناک جزیرے میں پہنچا دیا گیا جس کا سورج ہمیشہ نصف نیزے پر رہتا تھا۔ وہاں کی نسیم صبح ہماری گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت ہے وہاں جو غذا مجھے کھانے کو ملتی ہے وہ حنظل سے زیادہ کڑوی ہے۔ جو پانی وہاں ہمیں پینے کو دیا جاتا ہے وہ سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں ہے۔ اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا ہے۔ اس کی زمین آگ میں گرم کئے ہوئے لوہے کی مانند جلتی ہے۔ اس کی ہوا نہایت بدبودار اور امراض کی مخزن ہے۔ بے شمار بیماریاں یہاں ہر وقت آدمی کو چمٹی رہتی ہیں۔ ایک ہولناک قسم کی خارش یہاں عام ہے۔ جس سے بدن کی کھال پھٹنے لگتی ہے۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام ہے۔ سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ کئی مرض یہاں ایسے لاحق ہو جاتے ہیں جن کا طب کی کتابوں میں نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ جو طبیب اور ڈاکٹر یہاں ہیں سخت جاہل اور کندۂ ناتراش ہیں نہ مرض پہچانتے ہیں۔ نہ دوا دیتے ہیں نہ کوئی ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ نہایت غلط دوائیں دے کر نہایت، بے پروائی کے ساتھ مریض کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب مردے کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جاتا ہے۔ اور بغیر غسل اور کفن کے اس کے کپڑے اتار کر اسے ریت کے تودے میں دبا آتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے۔ نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ اگر مسلمان پر خودکشی حرام نہ ہوتی۔ تو کوئی ایک شخص بھی یہاں ایسی تکالیف نہ سہتا اور بڑی آسانی سے خودکشی کر کے ان روزمرہ کی مصیبتوں سے نجات پا جاتا۔ میں سخت امراض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ تمام بدن خارش اور زخموں سے چھلنی ہو چکا ہے۔ اور ان زخموں میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت تک پہنچا دیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مجھے ہر قسم کا عیش اور ہر طرح کی راحت حاصل تھی۔ اور بڑے امن و عافیت کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی۔ میں محسود خلائق تھا۔ نہایت مالدار اور غنی تھا۔ خوش و خرم اور تندرست تھا۔ یا یہ وقت ہے کہ اپاہج اور زخمی ہوں۔ بیسیوں مصیبتیں اور سینکڑوں صعوبتیں اٹھا رہا ہوں۔ میرے دوست میری مصیبتوں پر آنسو بہا رہے ہیں۔ لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے ہیں"

ان ہی مصیبتوں اور دکھوں کو سہتے سہتے آخر مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جس دن ان کا انتقال ہوا۔ اسی دن برسوں کی بھاگ دوڑ کے بعد ان کی رہائی کا حکم لے کر ان کے اعزہ انڈمن پہنچے۔

۴۔ مولانا امام بخش صہبائی دہلوی۔ فارسی کے نہایت مسلّم الثبوت استاد اور اپنے دور کے بے مثل فاضل تھے۔ سرسید کے نہایت گہرے دوست اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے استاد تھے۔ فن بلاغت کی بے مثل کتاب حدائق البلاغت

کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ سر سید کو اُن کی مشہور کتاب آثار الصنادید کے لکھنے میں بہت مدد دی۔ فرانس کا مشہور مستشرق گارسن دتاسی لکھتا ہے کہ صہبائی دہلی کا سب سے زیادہ قابل مصنف اور سب سے زیادہ فاضل ادیب ہے۔" ان کی بے جرم و بے خطا گرفتاری اور قتل کی کہانی ان کے بھانجے مولانا قادر علی کی زبان سے سنیئے :۔

"میں صبح کی نماز اپنے ماموں جان (مولانا صہبائی) کے ساتھ کٹڑہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی۔ امام کے سلام پھیرنے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور بہ قول حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ مخبروں نے ہماری بابت بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دیں اس لئے ہم سب گرفتار کرکے دریا (جمنا) کے کنارے لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے چپکے سے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پہ ہے۔ اور گولیاں تمہارے سامنے ہیں۔ دریا تمہاری پشت پہ ہے۔ اب بچاؤ کی صرف یہی شکل ہے کہ تم میں سے جو تیرنا جانتے ہوں وہ بلا تامل دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر ماموں جان (مولانا صہبائی) اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے۔ اس لئے میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں جان نے مجھے اشارہ کیا۔ اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ ابھی پچاس ساٹھ ہی گز پانی میں گیا ہوں گا کہ دنادن گولیوں کی آواز میرے کان میں آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو سب گر کر مر گئے تھے۔"

مفتی صدرالدین آزردہ صدرالصدور مولانا کے دوست تھے۔ اُن کی شہادت پر کس درد سے کہتے ہیں ؎

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو ۔۔۔ قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

۵۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۔ یہ فاضل اور ادیب ابوالحسن تانا شاہ والئ گولکنڈہ کی اولاد سے تھے۔ علم و فضل اور زہد و اتقاء کے علاوہ نہایت بہادر اور جری انسان تھے۔ انگریزوں کو اپنے ملک پر مسلط ہوتے دیکھ کر اُن کی غیرت اور خوددار طبیعت جوش میں آئی۔ انگریزوں نے اُن کی حب الوطنی کے پیش نظر انہیں قید کر کے فیض آباد کے جیلخانے میں ڈال دیا۔ جہاں اُن پر ہر قسم کی سختیاں کی گئیں۔ مگر قید و بند کی سختیاں اس اولوالعزم شخص کو اپنے عزم و ارادہ سے باز نہ رکھ سکیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جب فیض آباد میں انگریزی عملداری نہ رہی تو جیل خانہ بھی ٹوٹ گیا اور سب قیدیوں کے ساتھ یہ بھی آزاد ہو گئے۔ انہوں نے فوراً چند محب وطن اصحاب کو ہمراہ لے کر لکھنؤ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے محمدی پور گئے اور وہاں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مگر انگریزوں کے اشارہ پر راجہ بلدیو سنگھ نے دھوکے سے اپنی گڑھی میں بلایا۔ جب اس چال سے بے خبر مولانا وہاں پہنچے تو راجہ نے اپنی فوج کے ساتھ چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا۔ اور گولیوں کی باڑ سے ان کا خاتمہ کر دیا۔ بعد شہادت سر کاٹ کر تھانہ کے دروازہ پر لٹکا دیا۔ اور لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا ڈالا۔ انگریزوں نے اس خدمت کے صلہ میں راجہ کو پچاس ہزار روپیہ انعام دیا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا ایک نامور سپاہی جنرل ٹامس لکھتا ہے۔

"مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت اور قابلیت کا مالک تھا۔ وہ ایسا شجاع اور دلیر تھا کہ خوف اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ وہ عزم کا بڑا پکا اور ارادہ کا نہایت مستقل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ باغیوں میں اس سے بہتر سپاہی کوئی نہ تھا۔ وہ بہادرانہ اور اولوالعزمانہ طور پر اُن لوگوں سے معرکہ آرا ہوا جنہوں نے اُس کا ملک چھین لیا تھا۔"

۶۔ مفتی صدرالدین آزردہ ۔ کشمیری الاصل یہ فاضل یگانہ شخص اپنے زمانہ کے بے نظیر عالم تھے۔ اُس وقت کے تمام

متعارفہ علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے ۔ صرف و نحو ۔ معانی و بیان ۔ منطق و فلسفہ ۔ ہندسہ و ریاضی ۔ ادب و شعر ۔ فقہ اور حدیث ۔ غرض کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جس میں ان کی حیثیت ایک مجتہد العصر جیسی نہ ہو ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دنیوی عزت و وجاہت بھی کافی عطا فرمائی تھی ۔ دہلی کے صدر الصدور اور قاضی القضاۃ تھے ۔ ۱۸۵۷ء کی لپیٹ میں یہ بھی بہت بری طرح آ گئے ۔ ہوا یہ کہ دوسرے علماء کی طرح ان سے جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے کے لئے زور دیا گیا ۔ ان کا دل تو نہ چاہتا تھا مگر مجبوراً دستخط کرنے پڑے ۔ کیونکہ انکار کی حالت میں جان کا خطرہ تھا ۔ مگر انہوں نے یہ ہوشیاری کی کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کرتے وقت فقرہ آخر میں لکھ دیا کہ کتبت بالخیر ۔ یہ فقرہ عام طور سے خاتمہ عبارت پر لکھ دیا کرتے ہیں ۔ مگر مولانا نے یہ فقرہ لکھتے ہوئے عاقبت بینی یہ کی کہ بالخیر کے لفظ پر نقطے نہیں دیئے ۔ اُن لوگوں نے جو دستخط کرانے آئے تھے اس کو بالخیر ہی پڑھا ۔ اور خاموشی سے چلے گئے جب چار مہینے کی جنگ کے بعد تقدیر پلٹ گئی اور انگریز شہر پر دوبارہ قابض ہوئے تو اب اُن علماء کی کم بختی آ گئی جنہوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کئے تھے ۔ انہی علماء میں ہمارے مفتی صاحب تھے ۔ فوراً انہیں گرفتار کر کے جیل خانہ میں ٹھونس دیا گیا ۔ جب مقدمہ پیش ہوا ۔ اور مجسٹریٹ نے پوچھا کہ " مولوی تم نے یہ فتویٰ دیا اور اُس پر دستخط کئے ؟ " انہوں نے فوراً جواب دیا کہ مجھ سے تو فتوے پر نہایت جبر کے ساتھ دستخط لئے گئے ۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے فتوے کے آخر میں صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ کتبت بالجبر (یعنی جبر اور زبردستی سے میں نے یہ فتویٰ لکھا ہے ۔ خوشی اور رضامندی سے نہیں) حاکم نے یہ سن کر ان کو قید سے تو رہائی دے دی مگر مال و جائداد ۔ مکانات اور جاگیر سب ضبط کر لیں ۔ ۲۰ ہزار کا نہایت نادر کتب خانہ جس میں ہزاروں بیش قیمت کتابیں تھیں پہلے ہی لٹ چکا تھا ۔ بیچارے نہایت خستہ اور تباہ حال ہو کر لاہور پہنچے اور وہاں اپیل کی ۔ بمشکل تمام نصف جائداد واگذار ہوئی ۔ باقی عمر کتابوں کی بربادی ۔ مال و جائداد کی ضبطی اور اپنے مکانوں کے انہدام کے غم میں بہت تلخی سے گذری ۔ یہاں تک کہ فالج نے کام تمام کر دیا ۔

۷ ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ سرسید کے دوست ۔ غالب کے شاگرد ۔ حالی کے اُستاد کو کون نہیں جانتا ۔ آج بھی ان کا سکہ قلمرو ئے سخن پر چلتا ہے ۔ اپنے زمانہ کے بڑے پایہ کے عالم ۔ نہایت باخدا بزرگ ۔ فن شعر کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور تذکرہ گلشن بیخار کے مصنف ہیں ۔ یہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت اپنی جاگیر جہانگیر آباد تھے ۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :-

" جب فتنہ و فساد کی ہمہ گیری کے باعث جہانگیر آباد خطرہ میں پڑ گیا تو نواب صاحب سب کچھ وہیں چھوڑ کر اپنے دوست عبداللطیف خاں کے پاس خان پور چلے گئے ۔ ٹھاکروں نے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ جما لیا ۔ عالیشان محلوں میں آگ لگا دی اور سارا قیمتی سامان جلا کر خاک کر ڈالا ۔ حتیٰ کہ گراں بہا کتب خانہ بھی شعلوں کی نذر ہو گیا ۔ انہی دنوں میں رام پور کی فوج اس راستے سے گزری ۔ اُس نے ٹھاکروں کو شکست دے کر جہانگیر آباد پر نواب صاحب کو دوبارہ قبضہ دلایا ۔ لیکن نیرنگی دنگار ملاحظہ ہو کہ یہ تمام نقصان اُٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا ۔ چنانچہ اُن کو گرفتار کر لیا گیا اور نہ محض ان کی جائداد ہی ضبط ہوئی بلکہ سات سال کی قید کا حکم بھی ہو گیا ۔ مگر جنوری ۱۸۵۹ء میں اُن کی تقصیر معاف ہوئی ۔ غالب فرماتے ہیں :-

" نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے ۔ سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی ۔

صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ لاچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان پر ٹھیرے ہوئے ہیں۔"

بعد میں نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال کی کوشش سے جائداد واگذار ہوئی۔ اور جہانگیر آباد کی جاگیر ان کو پھر واپس مل گئی۔

۸۔ منیر شکوہ آبادی۔ ان کا نام محمد اسمٰعیل حسین تھا۔ یہ نہ صرف ایک بہت خوشگو شاعر تھے۔ بلکہ سیاست سے بھی بہت گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اور دل سے چاہتے تھے کہ انگریز کی غلامی کا جوا گلے سے اُتار پھینکیں۔ منیر نواب علی بہادر خاں نواب باندہ کے بڑے زبردست مددگاروں میں سے تھے۔ جب نواب نے باندہ میں علم آزادی بلند کیا اور راج گڈھ کے قلعے پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ تو انگریزوں نے باندہ پہ حملہ کیا اور نواب پر فتح پا کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد منیر فرخ آباد چلے گئے اور وہاں گرفتار ہو گئے مقدمہ چلا اور کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ جہاں اُن کو مولوی فضل حق جیسے فاضل یگانہ کی صحبت اور ہم نشینی حاصل رہی۔ اُن کی شان میں آپ نے ایک قصیدہ بھی کہا ہے۔ فرخ آباد سے کالے پانی تک جو کچھ ان پر گذری وہ انہی کی زبان سے سنیئے ؎

فرخ آباد اور یاران شفیق ۔۔۔ چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم ۔۔۔ سَو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھڑی تاریک پائی مثل قبر ۔۔۔ تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الٰہ آباد لے جائے گئے ۔۔۔ ظلم سے۔ تلبیس سے۔ تزویر سے
جو الٰہ آباد میں گزرے ستم ۔۔۔ ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں ۔۔۔ گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں ۔۔۔ ناتواں تر تھے کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے ۔۔۔ تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

چھ سال کے بعد نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور کی کوشش سے چھوٹ کر ہندوستان آئے۔ اور دربار رام پور سے متعلق ہو گئے۔ سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔

۹۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ یہ مولانا تحریک آزادی کے بڑے زبردست علمبرداروں میں تھے۔ حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک اور ۱۸۵۷ء کے حادثہ جانکاہ میں انہوں نے بہت زور سے حصّہ لیا۔ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے سخت دشمن تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ سلطنت برطانیہ کا وجود حرف غلط کی طرح ہندوستان سے مٹ جائے۔ اپنے وطن کو آزادی کے لئے انہوں نے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تو یہ ایک فوج لے کر دہلی پہنچے۔ اور جب مسلمانوں کو شکست اُٹھانی پڑی تو واپس تھانیسر چلے آئے۔ انگریز بھلا ایسے زبردست "باغی" لیڈر کو کس طرح بخش سکتے تھے؟ علیگڈھ سے گرفتار کر کے اُن کو دہلی لائے اور وہاں سے انبالے لے گئے۔ خود کہتے ہیں :-

"شکرم میں سوار کرنے سے پہلے مجھ کو بیڑی ہتھکڑی اور طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈور ایک اور زنجیر ڈال کر اُس کا سرا ایک مسلح سپاہی کے ہاتھ میں دے کر میرے پیچھے بٹھایا گیا۔ بھرا ہوا طمنچہ لے کر مسٹر پارسن میرے دائیں طرف اور ایک انسپکٹر پولیس میرے بائیں طرف میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ اور اپنے اپنے طمنچوں کا رخ میری طرف کر لیا۔ پارسن نے مجھ سے کہا۔ کہ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو اس طمنچہ سے تمہیں یہیں ڈھیر کر دیں گے۔ علیگڈھ سے دہلی تک کھانے پینے کا تو کیا ذکر ہے۔ پیشاب یا پاخانہ کے لئے بھی ہمیں نہ اُتارا گیا۔ اسی طرح جب لوہے میں جکڑا ہوا دہلی میں آیا تو ایک تہ خانہ میں زندہ درگور بند کر دیا گیا۔ ہم دوسرے دن دہلی سے انبالہ روانہ ہوئے۔ جہاں ہمارا مقدمہ پیش ہونا تھا۔ تمام راستہ کھانا تو درکنار پانی تک ہمیں پینے کے لئے نہیں دیا گیا۔ انبالہ پہنچ کر مجھے پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ اور کھانا پینا کچھ نہ دیا۔ دوسرے دن چند انگریز آفیسر میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے پوچھا کہ جہاد میں کون کون سے آدمی میرے ساتھ دہلی گئے تھے؟ جب میں نے نام بتلانے سے انکار کیا تو مجھے اُنہوں نے بہت بیدردی کے ساتھ بیدوں سے پیٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ دوسرے دن پارسن پھر آیا اور مجھ پہ مار پڑنی شروع ہوئی۔ مگر کچھ زدوکوب کے بعد مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں اور بھی انگریز موجود تھے۔ اُنہوں نے میری بڑی چاپلوسی کی اور کہا کہ "ہم تحریری وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم شرکائے جہاد کے نام بتا دو تو نہ صرف تمہیں رہا کر دیں گے بلکہ انعام و اکرام سے بھی سرفراز کریں گے اور کوئی بڑا عہدہ بھی تمہیں دے دیں گے۔ لیکن نہ بتانے کی صورت میں تمہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔" جب میں نے صاف انکار کیا۔ تو پھر مجھ پر بیدیں پڑنے لگیں۔ آٹھ بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک برابر مجھ پر مار پڑتی رہی مگر میں سب سہار گیا اور میں نے ایک نام بھی نہ بتایا۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گئے تو واپس لا کر مجھے جیلخانہ کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں اُس روز روزہ سے تھا۔ جب آٹھ بجے رات کے مجھے بنگلہ سے باہر لائے تو میں نے زمین پر سے درخت کا ایک پتہ اُٹھا لیا اور اُسے چبا کر روزہ کھولا۔ غرض دسمبر سے لے کر اپریل تک روزانہ مجھ پر مار پڑتی رہی۔ مگر میں نے نام نہ بتائے۔ جب میرا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے خلاف گواہی دینے کے لئے تھانیسر کے پچاس ساٹھ آدمی موجود ہیں انہی میں میرا حقیقی بھائی محمد سعید بھی تھا۔ جو میرے خلاف سرکاری گواہ بن کر آیا تھا۔ ان سرکاری گواہوں میں ایک نوجوان لڑکا عباس نامی بھی تھا۔ گواہی کے وقت اُسے اس بات کی شرم آئی کہ جھوٹا بیان میرے خلاف دے۔ چنانچہ اُس نے گواہی دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر پولیس نے اُسے اتنا مارا۔ اتنا مارا کہ بالآخر وہ مر گیا۔ اس کے بعد مجھے پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ میری تمام جائداد اور املاک ضبط کر لی گئی۔ اور مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہیں دی جائے گی۔ بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستانِ جیل میں گاڑ دی جائے گی۔ اور مجسٹریٹ نے یہ بھی کہا کہ "میں تمہیں پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔" ۲ مئی سے ۱۶ ستمبر تک میں پھانسی گھر میں بند رہا۔ اس عرصہ میں سینکڑوں انگریز زن و مرد مجھے دیکھنے آئے۔ اور جب مجھے خوش و خرم اور ہشاش بشاش دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ مجھ سے اُنہوں نے پوچھا کہ تمہیں تو پھانسی ملنے والی ہے تم اس قدر خوش کیوں ہو؟ میں نے کہا یہ شہادت کی موت ہے اور شہادت کی موت پر مسلمان کو خوش ہونا ہی چاہیئے۔ جب شہر میں اس بات کا چرچا ہوا تو ایک روز ڈپٹی کمشنر میری کوٹھڑی میں آیا اور کہنے لگا "ویل مولوی! تم پھانسی کو شہادت کی موت کہتا ہے اور اس پر خوش ہے۔ ہم من مانی موت تم کو نہیں دیں گے۔ اس لئے ہم نے چیف کورٹ سے تمہارے لئے حکم منگوا لیا ہے کہ تم کو بجائے پھانسی کے حبس دوام بعبور دریائے

شور کی سزا دی جائے۔ جہاں تم بڑی تکلیفوں اور عذابوں کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے"۔ چنانچہ مولوی صاحب کو انڈیمان بھیجدیا گیا۔ جہاں آپ اٹھارہ برس تک رہے۔ زاں بعد رہائی ملی اور ہندوستان آگئے۔ آپ نے کالے پانی کے دلدوز حالات میں ایک کتاب اُردو میں لکھی جس کا نام "تواریخ عجیب" ہے۔

۱۰۔ مولانا لیاقت علی۔ یہ الٰہ آباد کے ایک علمی خاندان کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ علم اور تصوف کی دولت سے مالامال تھے۔ الٰہ آباد اور اس کے قرب وجوار کے ہزاروں آدمی آپ سے بیعت تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں اپنے مریدین کے ذریعہ الٰہ آباد پر قابض ہو کر جہاد کا عام اعلان کر دیا۔ انگریزوں کی فوج مقابلہ کے لئے آئی تو ان کے لشکر کے بعض نمک حرام خفیہ طور پر جا کر انگریزوں سے مل گئے اور ان کی شکست کا باعث ہوئے۔ مولانا الٰہ آباد سے چلے گئے۔ آخر گرفتار ہو کر آئے اور کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ اور اسی جلاوطنی کی حالت میں انتقال کیا۔

۱۱۔ مولانا پیر علی۔ یہ بزرگ پٹنہ کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ وطن کی آزادی کے نہایت درجہ متمنی تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا۔ تو تجارت کو خیرباد کہہ کر جہاد کے وعظ میں مصروف ہو گئے اور جگہ جگہ پھر کر لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرنے لگے۔ بالآخر ۱۴ مجاہدین کے ساتھ گرفتار ہو کر پھانسی پا گئے۔ جب ان کو پھانسی دینے لگے تو انگریز حاکم نے کہا۔ کہ اگر تم اب بھی اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو تمہیں فوراً چھوڑ دیا جائے گا۔ مولانا پیر علی نے جواب دیا۔ "زندگی میں ایسے موقعے کبھی آتے ہیں۔ جب جان بچانا کار ثواب ہوتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسے موقعے بھی آجاتے ہیں۔ جب جان دے دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہوتی ہے۔ تم بیشک مجھے پھانسی دے دو۔ مگر یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ سرزمین ہند سے ایک دو نہیں ہزاروں سپوت ایسے اُٹھتے رہیں گے جو تمہیں کبھی اطمینان سے حکومت نہیں کرنے دیں گے (اور بالآخر تمہیں یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا)

۱۲۔ مولوی محمد شفیع۔ یہ مولانا علم وفضل کے ساتھ خاندانی رئیس بھی تھے۔ انہوں نے نہ جہاد کے فتوے پر دستخط کئے۔ نہ انگریزوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ نہ بہادر شاہ کی طرفداری کی۔ بلکہ انگریزوں کے خیرخواہ اور ایجنٹ گورنر جنرل کے میرمنشی تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو گھر میں خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ چھوٹے بھائی مولوی محمد نقی نے سمجھایا کہ بھائی جان دہلی کے اندر ایسے پُر آشوب وقت میں رہنا ٹھیک نہیں۔ چلئے کہیں باہر نکل چلیں۔ یہ فرمانے لگے" نہیں مجھے تجربہ ہے انگریز قوم بہت منصف مزاج ہے۔ یہ لوگ کسی کو ناحق دکھ نہیں دیتے۔ میں نہ باغیوں کا طرفدار ہوں۔ نہ انگریزوں کے مقابلہ میں لڑا ہوں۔ نہ کسی کو لڑنے پر آمادہ کیا ہے۔ ایسی حالت میں مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ میں تو یہیں رہوں گا۔ چنانچہ بھائی اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی دروازہ کے راستے باہر نکل گیا اور یہ شہر ہی میں رہے۔ ایک روز صبح ہی صبح باہر زور کی ایک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی کے زور سے گرنے کی آواز آئی۔ مولانا بھاگ کر دروازہ پر آئے۔ دیکھا کہ ایک گورے کی گولی سے اپنا جوان اکلوتا بیٹا خون میں لت پت سامنے مرا پڑا ہے۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ لاش کو اُٹھا کر گھر میں لائے۔ اور گھر ہی میں قبر کھود کر دفن کر دیا۔ اب بھائی کا کہنا یاد آیا۔ مجبوراً کنبے کو لے کر باہر نکلے اور بہزار خرابی مر مر کے پانی پت پہنچے اور وہاں حضرت قلندر صاحب کی درگاہ کے ایک حجرے میں بطور پناہ گزین رہنے لگے۔

۱۳۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی۔ یہ ابھی چھ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا ماں نے مرزا محمد سلطان عرف

مرزا فخرو ابن بہادر شاہ ظفرؔ سے نکاح کر لیا۔ اس لئے داغؔ کی تعلیم و تربیت قلعہ معلّٰی میں ہوئی اور عمر کے ۲۶ برس نہایت عیش و عشرت کے ساتھ گزرے۔ ۱۸۵۷ء کے حادثہ میں نہ قلعہ کی آبادی رہی۔ نہ بادشاہ۔ نہ شاہزادے۔ شاہزادیوں اور بیگمات کو بھی ننگے پاؤں ننگے سر قلعہ سے نکلنا پڑا۔ ایسے ہولناک وقت میں داغ قلعہ میں کس طرح رہ سکتے تھے۔ یہ بھی بحال تباہ قلعہ سے نکلے۔ ان کا بہت سا ابتدائی کلام وہیں رہ گیا۔ جس کا ساری عمر افسوس رہا۔ بڑی مصیبت کے ساتھ آنولہ (ضلع بریلی) پہنچے۔ جہاں اُن کے ایک دوست حکیم ولایت علی خاں رہتے تھے۔ کچھ دنوں یہاں رہے۔ پھر رام پور چلے گئے۔ اور بعد ازاں حیدر آباد دکن جا کر مقیم ہو گئے۔ دلّی کی تباہی پر ایک شہر آشوب کہا ہے۔ جس میں فرماتے ہیں:-

جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا ملا نہ تختہ تری تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا

آگے کس درد سے کہتے ہیں سے

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی کہاں تک آہ کہوں آسماں کی جلادی
کسی کو قید محن سے نہیں آزادی کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی

۱۴۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں۔ بڑے فاضل اجل اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ فن تاریخ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور شعر و سخن سے بھی نہایت ذوق تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ لوہارو کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب دہلی کو انگریزوں نے دوبارہ فتح کیا تو اہل شہر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بیدریغ اور بلا پوچھ قتل ہونے لگے۔ نواب ضیاء الدین نے اپنے خاندان کے لئے چالیس گھوڑوں اور تین دو بیکر ہاتھیوں کا انتظام کیا۔ اور اپنے گھروں کا تمام قیمتی سامان اُن پر لاد کر بڑی مصیبت کے ساتھ مع اہل و عیال کے شہر سے نکلے۔ پہلا پڑاؤ مہرولی میں کیا۔ جو دہلی سے دس گیارہ میل پر مشہور قصبہ ہے۔ رات کو لٹیروں نے سارا سامان اور سب مال و اسباب لوٹ لیا۔ گھوڑے بھی لے گئے اور صرف تین ہاتھی باقی رہ گئے۔ یہ لُٹا ہوا قافلہ بڑی بے سر و سامانی کی حالت میں دوجانہ پہنچا۔ دوجانہ کے رئیس حسن علی خاں نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور بڑی مدارات اور عزت سے پیش آیا۔ ابھی چند ہی دن یہاں کے قیام کو ہوئے تھے کہ کمشنر دہلی کا حکم ان کی طلبی میں پہنچا۔ مجبوراً پھر دہلی جانا پڑا۔ کمشنر شروع میں تو بڑی درشتی اور سختی سے پیش آیا۔ لیکن پھر نرم پڑ گیا۔ اور ان کو قلعہ میں ٹھیرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ ان کے مکانات اور محلات پہلے ہی زمین کے برابر ہو چکے تھے۔ اور جتنا روپیہ پیسہ اور زر و جواہر یہ چھوڑ کر گئے تھے سب پورے طور پر لُٹ چکا تھا۔

۱۵۔ مولوی محمد باقر دہلوی۔ دہلی میں شیعوں کے مجتہد اور بہت فاضل اور قابل شخص تھے۔ اردو میں سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار انہوں ہی نے جاری کیا۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ انہی کے لڑکے ہیں۔ بہادر شاہ کے بڑے زبردست معاون اور مددگار اور ہمدرد تھے۔ اور برابر اُن کی حمایت میں اپنے اخبار میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی لپیٹ میں یہ بھی ایسی بُری طرح پھنسے کہ جان ہی دے کر اُس سے چھوٹے۔ اس واقعہ کو مختلف لوگوں نے مختلف طرح سے روایت کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ "۱۱ر مئی (۱۸۵۷ء) پیر کا دن اور صبح کا وقت تھا۔ دلی کالج میں حسب معمول پڑھائی ہو

رہی تھی کہ ساڑھے آٹھ بجے چندلال ہانپتے کانپتے آئے - اُن کی سراسیمگی اور وحشت کا عجیب عالم تھا۔ دوڑے دوڑے آئے اور جماعتوں میں بے تحاشا گھس گئے اور اپنے لڑکوں سے کہا "گھر چلو۔ بھاگو۔ غدر مچ گیا۔ سپاہیوں اور سواروں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے"۔ یہ سنتے ہی لڑکے اپنے اپنے بستے سنبھال چمپت ہونے لگے۔ پرنسپل (مسٹر ٹیلر) حیران تھے کہ یہ کیا تماشا ہے - اتنے میں میگزین کا چپراسی کمانڈنٹ کا خط لایا۔ جس میں لکھا تھا کہ شہر میں شورش بپا ہو گئی ہے۔ اور حالت لمحہ بہ لمحہ خطرناک ہوتی جاتی ہے ——— آپ فوراً معہ تمام انگریزی سٹاف کے آکر میگزین میں پناہ لیں - اس پر سب یورپین پروفیسر میگزین میں چلے گئے۔ مگر فوراً ہی ہندوستانی سپاہیوں نے میگزین کو گھیر لیا۔ مسٹر ٹیلر کسی طرح میگزین سے نکل آئے اور کالج میں پہنچ کر اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھڑی میں گھس گئے۔ اُس نے اُن کو مولوی محمدؐ باقر کے گھر پہنچا دیا۔ ٹیلر اور باقر کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ اُنہوں نے ایک رات تو ٹیلر کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا۔ لیکن جب دوسرے روز اُن کے امام باڑہ میں چھپنے کی خبر محلہ میں مشہور ہو گئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ غریب بیرام خان کی کھڑکی تک پہنچا تھا کہ لوگوں نے پہچان لیا۔ اور اتنے لٹھ برسائے کہ بچارے نے وہیں دم توڑ دیا۔ بعد میں مولوی محمدؐ باقر اس جرم میں سولی پر چڑھائے گئے اور اُن کا کوئی عذر نہ چلا"۔ مگر جہاں آرا بیگم نقوی اپنی کتاب "محمدؐ حسین آزاد" میں لکھتی ہیں کہ "گھر سے روانگی کے وقت ٹیلر نے ایک لاکھ ۷۵ ہزار کے نوٹ مولوی باقر کو دئیے اور خود اُن کے گھر سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی مارا گیا۔ مولوی محمدؐ باقر یہ نوٹ ہڈسن کے پاس لے گئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ اُس نے پورا واقعہ سُنا بھی نہیں۔ صرف اتنا پوچھا کہ "ٹیلر کہاں ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ اُن کو تماشبیوں نے قتل کر دیا"۔ اس پر فوراً اس نے حکم دیا کہ "گولی مار دو" چنانچہ آن کی آن میں اُن کی لاش میدان میں تڑپنے لگی

۱۶ - ماسٹر رامچندر - قدیم دلی کالج کے پروفیسر۔ ریاضی کے زبردست ماہر اور اُس دور کے بہت مشہور مصنف ہیں۔ مولانا نذیر احمدؒ - مولانا ذکاءاللہ - اور مولانا محمدؐ حسین آزاد کے اُستاد تھے - اُنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے کالج میں ہر وقت بحث مباحثہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ تو یورپین عیسائیوں کے ساتھ دیسی عیسائیوں کی بھی کم بختی آگئی تقدیر اچھی تھی کہ ماسٹر رام چندر بچ گئے۔ ورنہ تبدیل مذہب کا سودا ان کو بہت مہنگا پڑتا۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ جب ۱۱ مئی کو دہلی میں ہنگامہ شروع ہوا تو ماسٹر صاحب اُس وقت دلی کالج میں طلباء کو پڑھا رہے تھے۔ فساد کی خبر آتے ہی یورپین پروفیسر تو فوراً بھاگ کر میگزین میں چلے گئے۔ رہے پروفیسر رام چندر۔ یہ پیدل چل کر پن چکی کی سڑک پر ہوتے ہوئے قلعے کے سامنے آئے اُنہوں نے دیکھا کہ چند ترک سوار یا مغلوں کا دستہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ہوئے لال ڈگی کی سڑک پر آ رہا ہے۔ یہ اُسے دیکھ کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئے اور چاندنی چوک کے کوٹھے پر پہنچ گئے (جہاں یہ رہا کرتے تھے) (چونکہ یہ محفوظ مقام نہیں تھا اس لئے) وہاں سے انہیں اُن کے بھائی رام شنکر داس اپنے ساتھ لے گئے اور کائستھوں کے محلے میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جا کر چھپا دیا۔ مگر اُن کے اقربا نے اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم پر آفت نہ آ جائے۔ اُن کا وہاں زیادہ قیام گوارا نہ کیا۔ ان کا ایک قدیم نوکر جاٹ تھا اُس نے اس موقع پر بڑی رفاقت اور وفاداری برتی۔ یعنی اُس نے انہیں جاٹ بنا کر گنواروں کے سے کپڑے پہنا کر اور موٹا سا پگڑ بندھوا کر اپنے ساتھ لیا اور گاؤں میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ کچھ دن وہاں رہنے کے بعد یہ باؤلی کی سرائے میں پہنچے اور انگریزی کیمپ میں داخل ہو کر اطمینان سے رہنے لگے۔ جب پوری طرح امن

ہو گیا۔ اور لوٹ مار اور قتل و غارت کا خطرہ نہ رہا تو دہلی چلے آئے۔

۱۷۔ راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی۔ دہلی کے بہت مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کے والد خوشنویسی میں بہادر شاہ ظفر کے اُستاد تھے۔ شعر و سخن کی مجلسوں اور عیش و نشاط کی محفلوں میں ان کے دن رات بڑے اطمینان سے بسر ہوتے تھے۔ کہ ۱۸۵۷ء کا خوفناک بم پھٹا اور سارا عیش و آرام خاک میں مل گیا۔ پریشان خاطر، خستہ حال اور سخت سراسیمہ ہو کر مجبوراً وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے دہلی سے نکلے۔ لٹتے لٹاتے جھجر پہنچے۔ وہاں سے سونی پت آئے۔ سونی پت سے نجیب آباد۔ پھر بریلی اور وہاں سے رام پور کا قصد کیا۔ رام پور میں چار برس رہے۔ جب کچھ امن و امان ہو گیا تو دہلی آئے۔ یہاں اب کیا رکھا تھا۔ مکانات کھد کر زمین کے برابر ہو چکے تھے۔ مال و اسباب لٹ چکا تھا یار و احباب چھٹ چکے تھے۔ عزیز و اقربا تتر بتر ہو چکے تھے۔ نہ کوئی ہمدم تھا نہ مونس نہ یار نہ غمخوار۔ اب ظہیر اپنے وطن میں بے وطن تھے۔ حیران پریشان کہاں جائیں اور کیا کریں۔ جب پیٹ کا دوزخ بھرنے کا کوئی اور وسیلہ نظر نہ آیا تو ناچار چنگی کے محکمہ میں چار پانچ روپیہ ماہوار کے نوکر ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد یہ ملازمت چھوڑ کر بلند شہر چلے گئے اور وہاں اخبار "جلوہ طور" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مگر یہاں بھی ٹکنا نصیب نہ ہوا۔ الور کے راجہ نے قدردانی کی اور بلا بھیجا۔ مگر ریاستوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت وہاں سے بھاگے۔ جے پور میں آکر پولیس میں ملازم ہو گئے۔ پھر ٹونک کے نواب نے بلا بھیجا۔ یہاں سے اُکھڑے تو قدردانی کی امید پر حیدرآباد دکن پہنچے۔ وہاں آٹھ مہینے تک بیکار دربار شاہی ڈیوڑھی پر پڑے عرضیاں گذرانتے رہے مگر کسی نے نہ پوچھا۔ اسی حالت میں مستقل طور پر سفر آخرت کیا۔ ظہیر نے مرنے میں جلدی کی ورنہ ریاست سے اُن کا وظیفہ ضرور مقرر ہو جاتا۔ یہ ہے حسرتناک انجام اس شخص کا جس نے قلعہ معلّٰی دہلی میں نہایت عیش و عشرت کے ساتھ پرورش پائی۔ غزلوں کے چار دیوان یادگار چھوڑے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات میں بھی ایک بہت ہی پُراثر کتاب "داستانِ غدر" کے نام سے لکھی ہے۔ جو اس عظیم الشان المیہ کی تاریخ کے متعلق ایک مستند تصنیف ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ بہادر شاہ کا نام لینا بھی جرم تھا۔ ظہیر نے کمال جرأت اور دلیری کے ساتھ اپنے ولی نعمت کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ نہایت عزت و احترام اور ادب و تعظیم سے کیا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ اپنی محبت، و عقیدت کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا۔

۱۸۔ مولانا یحییٰ علی۔ یہ پٹنہ کے ایک بڑے عالی خاندان بزرگ تھے۔ تمام علاقہ پر ان کے علم و فضل کا نہایت درجہ اثر تھا۔ انہوں نے بھی اپنے اثر اور رسوخ سے کام لے کر کچھ فوج جمع کی اور انگریزوں سے اپنے ملک کو چھڑانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے پوری جد و جہد کی۔ مگر حالات کی ناسازگاری کے باعث، کامیاب نہ ہو سکے۔ اور گرفتار ہو گئے۔ ایسے شخص کی سزا انگریزی عدالت میں سوائے پھانسی کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ مگر سر ہربرٹ ایڈورڈ کے یہ الفاظ سننے کے قابل ہیں جو اُس نے مولانا کو سزائے موت دیتے وقت اپنے فیصلے میں لکھے۔ یعنی "یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا بانی ہے۔ جو انگریزوں کے خلاف کی گئی۔ یحییٰ علی ایک خالص مذہبی انسان ہے اور مذہبی دیوانوں کا سردار ہے۔ یہ شخص پٹنہ کی جامع مسجد میں اسلام کے قابلِ نفرت مسئلہ جہاد کی اشاعت زور شور سے کرتا رہا ہے۔ اس نے اپنے ماتحت بہت سے لوگوں کو اس کام کے لئے تعینات کر رکھا تھا کہ وہ سارے علاقہ کا گشت لگا کر عوام میں جہاد کی تبلیغ کریں۔ اور مبلغین اور مجاہدین کے لئے روپیہ فراہم

کریں۔ اس شخص نے اپنی ہمہ گیر سازشوں اور اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار کی بدولت ہماری حکومت کو ایسی جنگوں میں دھکیل دیا جس میں ہماری سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ بہت تعلیم یافتہ اور فاضل شخص ہے۔ اُس نے جو کچھ کیا خوب سوچ سمجھ کر اور بحث باغیانہ طریق پر کیا۔ وہ موروثی اور پیشینی باغی ہے اور مولویوں کے بڑے متعصب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کی خواہش تھی کہ ملک میں ایک مذہبی مصلح کی حیثیت حاصل کرے۔ اسی لئے اُس نے ہماری حکومت کے خلاف سازش کی۔ اُس حکومت کے خلاف جس نے مسلمانوں کو تباہی سے بچایا اور سب لوگوں کو مذہبی آزادی بخشی۔ پس ایسے سخت باغی کے لئے موت سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی جا سکتی۔"

۱۹۔ مولوی سید نذیر حسین دہلوی۔ یہ دلی میں فرقہ اہل حدیث کے سب سے بڑے مولوی تھے۔ اور سارے ہندوستان میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھے۔ کفر کے فتوے دینے میں طاق تھے۔ مگر لطف یہ ہوا کہ خود بھی کفر کے فتوے سے نہ بچے۔ چنانچہ جب مکہ معظمہ حج کے لئے گئے تو ان پر بھی وہاں کفر کا فتویٰ لگا۔ اور بڑی اودھم مچی۔ لیکن انگریزوں کے خلاف آپ نے فتویٰ اس لئے نہیں دیا کہ اس میں جان جانے کا اندیشہ تھا۔ بلکہ ایک میم کو کئی دن تک اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ مگر یہ ہمدردی بھی مولوی صاحب کے کام نہ آئی۔ جس وقت انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ پایا۔ تو پنجابی کے کٹڑہ کو جس میں مولوی صاحب رہتے تھے بالکل مسمار کر دیا۔ ان کا مکان بھی ڈھا یا گیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ تمام مال و اسباب اور تمام بیش بہا کتابیں ہزاروں من ملبے کے نیچے دب گئیں اور مجبوراً مولوی صاحب کو وہاں سے نکلنا پڑا (قلعہ معلّی کی سڑک پر کشمیری دروازے کی طرف آئیں تو ریلوے کے پل کی بائیں طرف سٹیشن کو جو سڑک جاتی ہے۔ پنجابی کٹڑہ یہیں آباد تھا۔ آج کل قدیم صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا) پنجابی کٹڑہ سے نکلے اور شہر کے باہر پہنچے تو گوروں کی ایک پلٹن نے گرفتار کر لیا۔ کئی دن کے بعد بمشکل تمام رہائی ملی۔ واپس آئے تو ایک نئی مصیبت یہ پیش آئی کہ جس میم کو انہوں نے اپنے ہاں چھپایا تھا۔ مخبروں نے اس کے متعلق شکایت کر دی کہ میم کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کیا گیا ہے۔ فوراً پولیس دوڑ آئی اور مولوی صاحب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ جان جانے میں کچھ شبہ نہ رہا تھا کہ اُس میم نے آ کر گواہی دی کہ میرے ساتھ ان کے گھر میں کوئی بُرا سلوک نہیں ہُوا۔ جب جا کر بمشکل رہائی ملی۔

۲۰۔ مرزا قربان علی بیگ سالک۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت اور تعلیم پائی۔ غالب کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ سقوطِ دہلی کے بعد ان پر بھی آفت آئی۔ سب مال و متاع چھوڑ کر شہر سے نکلنا پڑا۔ ٹھوکریں کھاتے ہوئے الور پہنچے۔ کچھ دنوں یہاں رہے۔ آدمی بہت قابل اور ہوشیار تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر جب کچھ کام نہ چلا تو حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ اور وہاں سررشتہ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہو گئے۔ مخزن الفوائد نام ایک رسالہ کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اور وہیں انتقال کیا۔

۲۱۔ میر مہدی مجروح۔ مرزا غالب کے نہایت ہی محبوب اور ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ عود ہندی اور اردوئے معلّی میں بہت سے خطوط ان کے نام کے ہیں۔ بقول رام بابو سکسینہ "میر مجروح اُن لوگوں میں سے ہیں جو اردو شاعری کی آخری یادگار تھے۔ حالی کہتے ہیں ؎

داغِ مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ... نہ سنے گا کوئی بُلبل کا ترانا ہرگز

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کو بھی ان کے دوسرے ساتھیوں کے برابر مصائب اور تکالیف کا حصّہ ملا۔ سب گھر بار چھوڑ کر اور اپنی جان سلامت لے کر دہلی سے نکلے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے پیدل پانی پت پہنچے۔ اور محلہ انصار میں قیام کیا۔ پانی پت والوں نے ان سے بہت ہمدردی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ اور یہ عرصہ تک یہیں رہے۔ بہت مدت کے بعد وطن واپس آئے۔ مگر یہاں بھی کچھ زیادہ دن نہ ٹکے اور الور چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد رام پور کو اپنا مستقر بنایا اور زندگی کے آخری دن یہیں کاٹے۔

۲۲۔ مولوی فیض الحسنؒ۔ نہایت مشہور و معروف فاضل اور اعلیٰ درجہ کے ادیب اور مصنف تھے۔ عربی و فارسی کی متعدد کتابیں بڑی لیاقت کے ساتھ آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ سرسید۔ حالی۔ شبلی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی وغیرہ کے اُستاد تھے۔ سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ اور دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا۔ مجبوراً اپنی بیش قیمت کتابیں جو اُن کا تمام سرمایہ تھا۔ دہلی میں چھوڑیں اور خود شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ سواری کہاں سے ملتی۔ پیدل چلے اور راستے میں مصیبت اُٹھاتے۔ تکلیف برداشت کرتے بمشکل تمام سہارن پور پہنچے۔ بعد میں آپ اورینٹل کالج لاہور میں ادب فارسی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔

۲۳۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ۔ جس زمانہ میں دہلی میں ہنگامہ ہوا۔ آپ حصار میں تھے۔ دہلی کا اثر بہت جلد بلکہ فوراً وہاں جا پہنچا۔ اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ سرکاری عملداری اُٹھ گئی۔ اور لاقانونی ہر طرف پھیل گئی۔ مولانا ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اور اپنا ضروری سامان اُس پر لاد کر پانی پت کے قصد سے روانہ ہوئے۔ مگر ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ لٹیرے آن پڑے۔ گھوڑا اور سامان چھین لیا۔ ان کو بھی زخمی کیا اور اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مولانا اسی زخمی حالت میں بے یار و مددگار پیدل گھر کی طرف چلے۔ راستے میں اور ڈاکو بھی ملے۔ مگر ان کے پاس اب کیا رہا تھا کہ لوٹتے۔ بھوک پیاس کی شدت۔ راستے کی صعوبت۔ جان کا ہر وقت کا خوف۔ پیدل چلنے کی مصیبت۔ زخمی بدن۔ کمزور جان۔ بڑی تکالیف کے ساتھ یہ سفر طے کیا اور بمشکل تمام خدا خدا کر کے پانی پت پہنچے اور چھ مہینے تک برابر پلنگ پہ پڑے رہے۔ بعد میں پلنگ پر سے تو اُٹھ بیٹھے مگر راہ میں اتنی ناقابلِ بیان تکلیفیں اٹھائی تھیں کہ صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔

۲۴۔ حکیم محمود خاں۔ علاوہ طب میں ماہر کامل ہونے کے آپ ایک بلند پایہ فاضل بھی تھے۔ آپ کی اعلیٰ علمی لیاقت کے آپ کے تمام معاصرین معترف تھے۔ نہایت شریف الطبع۔ فقیر دوست اور درویش نواز انسان تھے۔ غریبوں سے بہت جھک کر ملتے۔ مگر امیروں کی پرواہ نہ کرتے۔ دہلی کے معزز ترین افراد میں سے تھے۔ جب دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوا اور شہر میں بھاگڑ مچ گئی۔ تو آپ کے مکانات پر مہاراجہ پٹیالہ نے فوج کا زبردست پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اس سہولت سے فائدہ اُٹھا کر محض ازراہِ ہمدردی آپ نے بہت سے مفلوک الحال اور ستم رسیدہ لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دی اور اُن کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا معقول انتظام کر دیا۔ مخبروں نے جو جھوٹی رپورٹیں کرنے اور بیگناہوں کو پھنسانے میں اُس وقت بڑی مستعدی کا اظہار کر رہے تھے۔ شہر کے انگریز حاکم سے جا کر کہا کہ محمود خاں نے بہت سے باغیوں اور انگریزوں کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ پھر کیا تھا۔ فوراً چند گورے آ گئے اور حکیم محمود خاں اور اس کے خاندان کے بہت سے لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔ حکیم صاحب کئی روز تک حوالات میں رہے۔ جب اُنہوں نے حاکم کو یقین دلا دیا کہ میرے گھر میں کوئی قاتل اور باغی نہیں صرف غریب اور بے یار و مددگار

لوگ ہیں۔ جب جاکر رہا ہوئے۔

۲۵۔ مولوی محمد حسینؔ آزاد۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں سب سے پہلی مصیبت تو ان پر یہ آئی کہ ان کے والد مولوی محمد باقر مسٹر ٹیلر پرنسپل دلی کالج کے قتل کے سلسلہ میں گرفتار کرئے گئے۔ اس کے معاً بعد حکم ہوا کہ ان کا مکان ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے یہ دوسری مصیبت تھی جو آزاد پر پڑی۔ ۲۲ آدمیوں کے کنبے کو لے کر کہاں جائیں اور کہاں سر چھپائیں۔ مگر قہر درویش بر جان درویش نکلنا پڑا اور گھر چھوڑنا پڑا۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیال آیا کہ اس بھرے ہوئے گھر میں سے کیا چھوڑ دوں اور کیا لے لوں؟ سوچتے سوچتے یہی سوجا کہ آزاد! اگر زندگی ہے تو سب چیزیں میسر آ جائیں گی مگر اُستاد (ذوق) کا کلام پھر نہیں مل سکے گا۔ لہٰذا سارا گھر اُسی طرح چھوڑ دیا۔ صرف اُستاد کی غزلوں کے مسودے ایک گٹھڑی میں باندھ سر پر رکھ لئے اور خالی ہاتھ گھر سے نکل آئے اور ایک قریبی محلہ میں جس کا نام دھوبی واڑہ تھا جا کر بیٹھ گئے۔ گلی میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک گولہ سنسناتا ہوا آیا اور قریب ہی زمین پر گر کر پھٹا۔ مولانا کی گود کی بچی چیخ مار کر ماں سے لپٹ گئی اور اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ دھوبی واڑہ سے اُٹھ کر برف خانہ پہنچے۔ اب حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ اتفاقاً دہلی اردو اخبار (جو ان کے والد نکالتے تھے) کے ایک کلرک بھی ہمراہ تھے جو سونی پت کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے وہاں جانے کا مشورہ دیا۔ مولانا کو غنیمت معلوم ہوا۔ منشی صاحب کے ساتھ اہل و عیال کو سونی پت روانہ کر دیا۔ اور خود اپنے والد کا حال معلوم کرنے کے لئے دہلی لوٹ آئے۔ ایک سکھ فوجی افسر مولوی محمد باقر کا دوست تھا اس نے یہ تدبیر بتلائی کہ سائیس کے بھیس میں میرے ساتھ چلو اور اپنے والد کو دیکھ آؤ۔ یہ پہنچے تو دیکھا کہ دہلی گیٹ کے باہر خونی دروازہ کے سامنے وہ تمام عمائدین شہر ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے بیٹھے ہیں۔ جن کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہے۔ انہی میں ان کے والد بھی تھے۔ اُنہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ سائیس کے لباس میں بھی بیٹے کو پہچان لیا اور ٹپ ٹپ آنسو اُن کے چہرے سے گرنے لگے۔ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ جاؤ۔ اب آخرت میں ملیں گے۔ یہ صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر چلے آئے۔ دو چار دن کے بعد سکھ سردار خبر لایا کہ تمہارے والد مار ڈالے گئے۔ یہ روتے دھوتے۔ اُستاد کے کلام کی گٹھڑی سر پر اُٹھا کر دہلی سے نکلے۔ دریا کے پل پر پہنچے تو ایک گورے نے للکارا کہ "ٹھیر جا"۔ مارے خوف کے گٹھڑی ان کے سر سے گر پڑی اور سارے کاغذات زمین پر بکھر گئے۔ گورے نے سنگین سے اُن کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہنے لگا "بھاگ جا"۔ انہوں نے جلدی جلدی بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹے اور بھاگ کر دریا پار ہو گئے۔ اب حیران پریشان۔ کہاں جائیں اور کہاں ٹھیریں۔ نہ جیب میں کوڑی۔ نہ پاس کچھ کھانے پینے کا سامان۔ مگر کیا کرتے۔ ناچار چلے۔ نہ یہ پتہ کہ کہاں جا رہے ہیں۔ نہ یہ معلوم کہ کیوں جا رہے ہیں۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ بدن دکھنے لگا۔ گٹھڑی کا بوجھ سر پر عذاب بن گیا۔ بھوک پیاس سے بُرا حال ہوا۔ کہیں مزدوری مل گئی تو کر لی۔ کسی گاؤں میں پہنچے تو گاؤں والوں نے مصیبت زدہ سمجھ کر دو تین وقت کا کھانا دے دیا۔ اسی طرح پھرتے پھراتے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کسی مخبر نے دہلی میں مخبری کی ہے کہ ٹیلر کے قتل میں محمد حسین کا بھی ہاتھ تھا۔ اس لئے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی پاؤں تلے سے زمین گئی۔ لکھنؤ سے بھاگے اور چھپتے چھپاتے بحال تباہ مدراس پہنچے۔ اور ایک سکول میں مدرس ہو گئے مگر تھوڑے دن بعد یہاں سے بھی بھاگے۔ بمبئی آئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہے۔ وہاں سے ملوہ آئے۔ اور پھر شہر شہر گھومتے ہوئے ریاست جیند کے قصبہ سنگرور میں آکر قیام کیا۔ پھر جگراؤں (ضلع لدھیانہ) چلے گئے۔ جگراؤں میں تھوڑے عرصہ قیام کے بعد

سیالکوٹ آئے وہاں سے کشمیر کا رخ کیا۔ کشمیر سے واپس سیالکوٹ آئے اور پرانی کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ پھر اس کام کو چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ اور آخر وقت تک یہیں رہے۔ وارنٹ کا پھر کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اُس کا کیا ہؤا۔ غالباً عدم پتہ کی وجہ سے داخل دفتر ہو گیا۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ وارنٹ کے خوف سے بھاگ کر ایران چلے گئے تھے مگر یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

۲۶۔ مولانا ذکاء اللہ۔ جب ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگامہ شروع ہؤا۔ اور ہر جگہ انگریز اور عیسائی بیدردی کے ساتھ قتل کئے جانے لگے تو مولوی ذکاء اللہ کو (جن کا مکان دہلی میں کوچہ چیلاں میں تھا) سب سے پہلے اس بات کی فکر پڑی کہ اپنے اُستاد ماسٹر رام چندر کو بچائیں (جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اس وجہ سے اُن کی زندگی اُس وقت سخت خطرہ میں پڑ گئی تھی) مولوی ذکاء اللہ ایسے پُر آشوب وقت میں جبکہ شہر میں چاروں طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور کسی شخص کی بھی عزت۔ ملکیت اور جان محفوظ نہ تھی۔ دیوانہ وار کالج کی طرف دوڑے کہ اپنی جان دے کر بھی اپنے اُستاد کو بچائیں اپنی جان کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے اپنے اُستاد کی جان بچانے کا یہ جرأت مندانہ اقدام واقعی حیرت انگیز تھا۔ چیلوں کے کوچہ سے سارے شہر کو عبور کر کے کشمیری دروازہ تک کالج میں جانا آسان کام نہ تھا۔ جبکہ قدم قدم پر جنونی اور خونخوار لوگ تلواریں ہاتھوں میں لئے انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ مگر اُستاد کی محبت میں ذکاء اللہ ان تمام خطرات کو بھول گئے۔ اور دوڑتے ہوئے کالج کو روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں ان کو معلوم ہو گیا کہ ماسٹر رام چندر کالج سے نکل کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ سن کر مولوی ذکاء اللہ کو اطمینان ہؤا اور گھر لوٹے۔ اب کوئی چارہ کار اس کے سوا نہ تھا کہ گھر کا دروازہ بند کر لیتے اور خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔ کیونکہ فی الحال امن کی صورت یہی تھی اور مولوی ذکاء اللہ نے یہی کیا۔ مگر بقول پادری اینڈریوز "گھر کی مشکلات میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا اور بسا اوقات اُن کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا کہ گھر کے تمام افراد اور دیگر متوسلین کے لئے کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے اور کس طرح حاصل کریں۔ اس لئے وہ چند ہفتوں تک سخت تکلیف اور مصیبت میں مبتلا رہے۔ افلاس اور بھوک پیاس نے اُن کو بہت ہی نحیف کر دیا۔"

چار مہینے اسی مصیبت میں گزرے اور مولوی ذکاء اللہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے مکان میں بند بھوک، پیاس کی تکلیف سہتے رہے۔ یہ مصیبت یہیں ختم ہو جاتی تب بھی خیر۔ لیکن ابھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہؤا تھا بلکہ تقدیر میں جلا وطنی بھی لکھی تھی۔ اس کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب انگریزوں کا شہر پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ اور اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ شہر کے مسلمانوں سے انتقام لینے اور اُن کو سزا دینے کے لئے اُس تمام علاقہ کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے۔ جو قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع ہے۔ کسی مکان کا کسی شخص کو معاوضہ نہ دیا جائے۔ اور مکانات کے مسمار کرنے کے وقت اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے کہ مکان مجرم کا ہے یا بے قصور کا۔ پادری اینڈریوز مولوی ذکاء اللہ کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔ "ذکاء اللہ کے خاندان کا قدیم مکان اور جائداد اسی علاقہ میں تھی۔ اس لئے ہزارہا دوسرے بے گناہ افراد کے ساتھ ان کے بوڑھے والدین اور تمام خاندان کو بے دردی سے باہر نکال دیا گیا۔ اُنہوں نے ایسے زمانہ میں اپنے آپ کو بے گھر اور بے یار و مددگار افلاس اور فاقہ کشی کی حالت میں پایا۔ جبکہ دوسرے افراد کی کثیر تعداد بھی اسی حالت میں تھی۔ خود شہر کے اندر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں وہ پناہ لے سکتے۔ لہذا اُنہیں خوفناک سفر طے کرنا پڑا۔ یعنی بھاگ کر مضافات میں جانا پڑا۔ تاکہ وہاں کسی پناہ گاہ کو ڈھونڈیں۔

تمام خاندان مقبرۂ نظام الدین کی طرف، جلا جو دہلی دروازہ کے باہر شہر سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ لوگ راتوں کو کھلے میدان میں فرشِ خاک پر سوتے اور دن کے وقت کسی ٹوٹے پھوٹے مقبرہ میں پناہ لینے کے لئے چلے جاتے تھے۔ ان کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ اب موت کا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ یہ وقت ان پر اتنا سخت اور ہولناک گزرا تھا کہ مولوی ذکاءاللہ صرف ایک مرتبہ مجھ سے اس کا ذکر کر سکے کہ کس طرح انہوں نے ان ایام میں بھوک۔ خوف اور دہشت کے مصائب برداشت کئے انہوں نے اس وقت کا مجھے ایک واقعہ سنایا کہ روز رات کو ایک ٹوٹے ہوئے مقبرہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ تمام شب سخت تکلیف میں جاگتا رہا۔ میرے بوڑھے والد مولوی ثناءاللہ نوافل پڑھتے اور دعائیں مانگتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد کا چہرہ رات کی تاریکی میں چمک رہا ہے۔ ایسی چمک جس کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل سے نکل رہی ہے۔ اسی حالت میں لٹیروں اور ڈاکوؤں اور قاتلوں کا ایک خوفناک گروہ ادھر سے گزرا تاکہ جو کوئی بھی ان کو ملے۔ اُسے لوٹ لیں اور قتل کر ڈالیں۔ ان لٹیروں نے مقبرہ کے اندر بھی جھانک کر دیکھا۔ لیکن جب اس بوڑھے درویش کو عبادت اور دعا میں مشغول پایا۔ تو نہایت خاموشی کے ساتھ سارے ڈاکو واپس چلے گئے۔ اور ہمیں بالکل نہیں چھیڑا۔ اور اس طرح سارا خاندان لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت سے محفوظ رہا" ذکاءاللہ کو پورا پورا یقین تھا کہ اس ہولناک موقع پر ان کے بچ جانے کی وجہ محض اور محض یہ تھی کہ ان کے والد کو اپنی دعاؤں کے قبول ہونے اور خدائی امداد پر بھروسہ اور بڑا پختہ ایمان تھا؟

۲۷۔ مولوی نذیر احمد دہلوی۔ جس محلہ میں مولوی نذیر حسین رہتے تھے اسی میں مولوی نذیر احمد کا بھی قیام تھا سقوط دہلی کے بعد ایک رات کو خبر لگی کہ صبح ہی انگریزی فوج اس محلہ پر حملہ کرے گی اور سارے مکان ڈھا دے گی اور جو آدمی ان میں پایا گیا اُسے قتل کر دے گی۔ لہٰذا محلہ کے سارے آدمی اپنے اپنے گھر والوں کے ہمراہ بہت ہی بدحواسی کے ساتھ اپنے گھروں سے نکلے۔ مولوی نذیر احمد بھی اسی قافلے میں تھے۔ سب لوگ ترکمان دروازے سے بحال تباہ نکل کر عرب سرائے پہنچے۔ اور وہاں سے شاہ نظام الدین۔ وہاں گوروں نے مولوی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اور کوتوالی لا کر حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی پکڑے ہوئے آئے اور حوالات میں ٹھونس دیئے گئے۔ ان سب کے متعلق انگریز حاکم نے حکم دے دیا کہ تمام کو گولیوں سے ہلاک کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے وہیں ایک انگریز مسٹر لوئیس نے ان کو دیکھ لیا بہت مدت ہوئی اُس نے ان سے اردو پڑھی تھی۔ اُستاد کو اس حالتِ قید میں دیکھ کر اُسے بڑا افسوس ہوا اور اُس نے پرزور سفارش کر کے ان کو قید سے رہائی دلائی۔ ورنہ مرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ اُسی لوئیس نے کوشش کر کے ان کو شہر دہلی میں آنے اور یہاں آباد ہونے کا سرٹیفکیٹ دلایا۔ جس کی بدولت مولانا دوبارہ شہر میں آ کر آباد ہوئے۔

یہ ہے مختصر کہانی ان مصائب و آلام کی جو علمائے کرام۔ شاعرانِ عظام اور ذی علم و معزز اصحاب پر ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ٹوٹے۔

ملک حبیب احمد خاں

غلام رسول ازہر

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَّ مَنْزِلِ

(دوستو، ٹھہر جاؤ۔ منزلِ حبیب آگئی ہے۔ ہاں یہ وہ مقام ہے جہاں اُس کا خیمہ نصب ہوا۔ آؤ ہم اُسکی یاد میں آنسو بہائیں!)

"ابتدائی دَور کے "ہم ادب" ساتھی سر عبدالقادر۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور میر[1] اعجاز حسین تھے۔ بعد میں خوشی محمد ناظر اور منشی سراج الدین کشمیری اسے بے تکلف ادبی دوست بنے۔ منشی سراج الدین کو حضرت علامہ (اقبال) "بزمِ ادب" کہا کرتے تھے۔ اور اُن کے ادبی ذوق کے بہت قائل تھے۔ اس دَور میں ایک صاحب ملک حبیب جالندھری تھے جن کے صاحبزادے حبیب صاحب ریڈیو اور فلم میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ میر غلام بھیک نیرنگ کی مشہور غزل میں اُنہی کی طرف اشارہ ہے۔ وہ جس کا ایک شعر ہے۔

اے وائے نامرادیٔ دستِ جنونِ شوق[2] | اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے" "اسمادالرجال اقبال"

(از ڈاکٹر تاثیر مطبوعہ تاثیر یادگار نمبر ۱۹۵۰ء۔ کریسنٹ:۔ ماہنامہ اسلامیہ کالج لاہور بابت فروری اپریل ۱۹۵۰ء)

جون ۱۹۵۵ء کی وہ حسین شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی جبکہ میٹرو ہوٹل لاہور میں مخدومی حکیم محمد حسن قرشی صاحب کے توسط سے میری ملاقات قبلہ ام "ملک حبیب احمد خان" صاحب سے ہوئی۔ اس ملاقات کی مختصر روداد یہ ہے :۔

"میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ میٹرو ہوٹل لاہور میں شام کی چائے کے سلسلہ میں موجود تھا۔ ہماری میز کے قریب ہی کچھ دیگر چائے نوش حضرات تشریف فرما تھے۔ وہ ہمارے بالمقابل یا پہلو میں نہ تھے بلکہ کچھ اس انداز سے میز پہ بیٹھے تھے۔ کہ ہم اُن کی تمام گفتگو تو بوجہ قربت سُن سکتے تھے مگر اُن کی صورتیں گردن پھیرے بغیر نہ دیکھ سکتے تھے۔ اسی اثنا میں ان میں سے ایک صاحب نے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ سب کے سب کچھ اس اشتیاق اور انہماک سے آپس میں گفتگو کئے جا رہے تھے۔ جیسے چائے نوشی تو محض بہانہ تھا۔ اور اُن کا اصل مقصد فقط مل بیٹھنا اور ایک دوسرے سے ہنسی خوشی سے باتیں ہی کرنا تھا۔ ان صاحبان میں سے ایک صاحب کچھ اس قدر دلپذیر اور بارغ و بہار پیرایۂ بیان میں ہم کلام ہوتے تھے کہ کئی مرتبہ لاشعوری طور پر میرے دل نے چٹکی لی۔ کہ میں اُن کی

---

[1] نام "مرزا" اعجاز حسین ہے "میر" اعجاز حسین نہیں۔

[2] اصلی شعر یوں ہے (غالباً تاثیر مرحوم نے محض حافظہ کے زور سے بے ارادہ تغیر کے ساتھ اسے یہاں نقل کر دیا ہے) ؎

اے وائے نارسائیٔ دستِ دراز شوق | اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے (ازہر)

باتوں کو توجہ سے سنوں مگر ساتھ ہی دل میں یہ خیال گزرتا کہ ایسا کرنا ضابطۂ اخلاق اور آداب کے منافی ہے۔ چنانچہ میں اس ذہنی کشمکش کے ابتلا میں بے دلی سے اپنے دوست سے باتیں کرنی شروع کر دیتا۔ جب چائے آئی تو اِن حضرات نے اِس درجہ گرمجوشی اور تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ جیسا کہ ہماری شاعری میں روائتی رند شراب کے باب میں کرتے ہیں۔ سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ فقرے پہ فقرے اور شعر پر شعر ہونے لگے۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے گردن پھیر کر اور نظریں بچا کر ان صاحبان کو دیکھ ہی لیا۔ اِس حال میں مخدومی شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میری خوش نصیبی سے قرشی صاحب اِن رندانِ باصفا کے رکن رکین تھے۔ انہوں نے اپنی دیدہ وری۔ نکتہ وری۔ مثالی وضعداری اور بزرگانہ شفقت کے سبب نہ صرف اِس نقیر کے من کی بات کو بھانپا بلکہ توجہ بھی فرمائی۔ اور اپنے اِس نیاز مند کو بہ کمال لطف و محبت اپنے احباب کے حلقہ سے متعارف کرایا۔ جو اُس وقت ملک حبیب احمد خان، شیخ عبدالشکور اور نواب سعادت حسن خان قزلباش پر مشتمل تھا۔ قبلہ حکیم صاحب علی الخصوص ملک حبیب احمد صاحب کے بارے میں عقیدتمندانہ سرخوشی اور گرمجوشی کے ساتھ رطب اللسان تھے۔ دریں اثنا ملک صاحب موصوف معصومیت کے ساتھ زیرِ لب مسکرائے جا رہے تھے۔ اور کبھی کبھی حکیم صاحب کو باز رکھنے کے لئے نہایت ہی خوش آئند اور دلپذیر پیرائے میں ایک آدھ فقرہ بھی فرما دیتے تھے۔ میں نے اسی دوران میں ملک صاحب کو ایک نظر دیکھا۔ اُن کا سن ستر بہتر کے لگ بھگ ہوگا۔ مگر اس کے باوجود وہ پیرِ سال معلوم نہ ہوتے تھے۔ وہ خوش گِل، جامہ زیب اور خوش نظر تھے۔ ان کا چہرہ گول اور صاف تھا۔ جو یقیناً کسی زمانے میں "حسنِ کتابی" کا منظر پیش کرتا ہوگا۔ ان کا جسم اب تک گداز اور متناسب تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ایک حسن گیر چمک تھی۔ جو محض "جستجوئے خوبتر" کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ بات کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ پھول جھڑ رہے ہیں۔ میں ملک صاحب سے مل کر فی الحقیقت بیحد خوش ہوا۔ یہ جان کر مجھے اور خوشی ہوئی کہ آپ حضرتِ علامہ اقبال کے اولین ملنے والوں میں سے تھے۔ اور یہ کہ آپ سر عبدالقادر۔ میر غلام بھیک نیرنگ۔ چودھری خوشی محمد ناظر اور سر راس مسعود کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ اب میرے لئے ملک صاحب کی شبیہہ اور بھی پر وقار۔ قابلِ احترام۔ جاذبِ نظر اور محبوب ہو گئی۔ وہ احباب کی بارات کے دُولہا معلوم ہوتے تھے۔ اُس خوشگوار شام کی یاد آج تک لوحِ دل پہ قوسِ قزح کے حسین رنگوں کی طرح نقش ہے۔

حکیم قرشی صاحب شروانی پہنے، سر پہ ترکی اوڑھے آرام و اطمینان سے تشریف فرما تھے۔ نواب سعادت حسن خان قزلباش کی کچھ بوجہ قزلباش ہونے کے اور کچھ حدتِ چائے سے آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور وہ میٹرو ہوٹل کے پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے کسی بہشت کے پلنگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ سگرٹ کا کش لگاتے تھے اور بس۔ ملک صاحب کی شگفتہ مزاجی اور شعریت آمیز دلپذیر اسلوب گفتگو سے ایک دلکش رنگِ محفل پیدا ہو گیا تھا۔ جس میں شیخ عبدالشکور باوجود سالخوردہ ہونے کے جوانوں سے ملتاز اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ وہ مجوزۂ ہزار شیوہ تھے۔ اور اُس وقت چہک چہک کر حضرتِ گرامی کی باتیں کر رہے تھے: "گرامی اصل میں جالندھر کے تھے۔ مگر اُن کی بیگم ہوشیار پور کی تھی۔ جو جالندھر سے اُن کو بیاہ کر ہوشیار پور لے گئی۔ اِس لئے ہوشیار پوری مشہور ہوئے۔" پھر انہوں نے حضرتِ گرامی سے اپنی ایک جوانی کی صحبت کا تذکرہ کیا۔ اور گرامی کے چند اشعار سُنائے جو خود حضرت گرامی نے اپنے دستِ مبارک سے اُن کو تحریر کر کے مرحمت فرمائے تھے۔

ماخویشتن را بہ نیم نظر ہاں فروختیم   خود را فروختیم و چہ ارزاں فروختیم

ما سبحہ را ز رشتۂ زنّار ساختیم — ایماں بہ کفر، کفر بہ ایماں فروختیم
دیوانگی نبود بلا سنج امتیاز — داماں بہ جیب، جیب بہ داماں فروختیم
قانونِ عقل، نسخۂ ایماں، کتابِ ہوش — در امتحانِ چشمِ سخن داں فروختیم

گرامی سے بات اقبال تک پہنچی۔ اقبال کے نام پر میں نے ملک صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتے دیکھی۔ اُن کا چہرہ یکایک تمتما اُٹھا۔ پھر یہ تمتماہٹ چشم زدن میں کافور ہو گئی۔ اب ان کے چہرے پر ایک عجیب سی افسردگی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی حسین یادیں ایک خوشگوار خواب کی طرح اُن کے قلب و نظر سے دفعتہً گزر گئیں پھر یکایکی وہ اِس خواب سے بیدار ہو گئے۔ اور اب ماسوائے احساسِ نامرادی و حرماں نصیبی کے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور وہ گویا کفِ افسوس مل رہے تھے اہلِ محفل میں سے حکیم قرشی صاحب ملک صاحب کے صحیح معنی میں نبّاض معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے ملک صاحب کی حساس طبیعت کو جب یوں بگڑتے دیکھا۔ تو انہوں نے اِس مرگ آسا سکوت کو توڑا۔ ملک صاحب جو لاشعوری طور پر دم بخود سے ہو گئے تھے۔ اب اُن کو بھی پاسِ خاطرِ احبابِ محفل ہوا۔ انہوں نے اضطراراً ایک لمبی سی سرد آہ کھینچی۔ جیسے تلخابۂ حیات کو ایک ہی جرعۂ نفس میں کشید کر کے پی گئے۔ فرمایا: "واقعی وہ دن مزے کے تھے۔ جالندھر میں حضرتِ گرامی کی ذات بڑی بابرکت تھی۔ پھر اقبال تو گویا اُن کے شیدائی تھے۔ غریب خانہ پر عجیب قسم کی محفلیں بپا ہوتی تھیں"۔ ملک صاحب کی آنکھوں میں معاً ایک چمک پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے وہ اپنی تخیلی دنیا میں آج بھی ان محفلوں کو دیکھ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھری ...... شیخ عبدالشکور نے بات کا رُخ کسی خوشگوار دھارے کی طرف بدلنے کے لئے جالندھر کی مشہور طوائف گوہی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اِس پر ملک صاحب نے فرمایا: "گوہی طوائف نہ تھی۔ رُکنِ محفل تھی۔ وہ بیحد شائستہ۔ خوش نظر۔ اور خوش دماغ تھی۔ وہ ہماری مجالسِ علم و ادب میں اکثر شریک ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ایک نجی محفل میں شیخ عبدالقادر نے اقبال سے گوہی پر شعر کہنے کو کہا تو اقبال نے ایک ہی نشست میں تقریباً بیس اشعار ارتجالاً کہے تھے۔ قافیہ بھولی۔ ڈولی۔ اور بولی ٹھولی وغیرہ تھا۔ ان میں سے چند اشعار اب تک میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔

لڑکپن[1] کے ہیں دن، صُورت کسی کی بھولی بھالی ہے — زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں، پیاری پیاری بولی ہے
ترا اے سیلِ دریائے محبت منہ تکوں کب تک — مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

---

[1] مذکورہ بالا اشعار "باقیاتِ اقبال" میں بھی بعنوان غزل (ص۳۰۰) طبع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس غزل میں مزید دس اشعار ہیں۔ اس غزل پر ایک نوٹ منقولہ از مخزن درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال نے یہ غزل سیالکوٹ کے رئیسِ اعظم آغا باقر خاں صاحب قزلباش کے فرزند ارجمند محمد ناصر کے ختنہ کے غسلِ صحت پر پڑھی تھی۔ اور اسے اس تقریب کا سہرا قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اِس غزل کے مقطع میں اشارہ ہے ؎

گلِ مضموں سے اے اقبال یہ سہرا ہے ناصر کا — غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

ممکن ہے کہ صاحبِ مخزن کا یہ نوٹ مبنی بر حقیقت ہو۔ مگر ماسوائے مقطع کے اِس ضمن میں اور کوئی داخلی اشارت مذکورہ نوٹ کی تائید میں میسّر نہیں آتی۔ غزل کے نفسِ مضمون، تیکھے پن۔ شوخیٔ بیان۔ رنگین اور بے تکلف لہجہ اور قوافی "انہ قسمے" بولی، ڈولی اور ٹھولی" سے بادی النظر میں یہ امر قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اشعار نوجوان اقبال نے "نوخیز گوہی" ہی سے متاثر ہو کر بداہتہً کہے ہوں گے جو بعد ازاں بعض مصالح کی بنا پر (جیسا کہ معاشرے کا تقاضا ہے) مذکورہ بالا تقریب سے منسوب کر دیئے گئے ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھا میرا کہا بے دردنے "کیوں آپ نے مالا پرولی ہے"
جفا جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے
شبِ فرقت تصور تھا مرا، اعجاز تھا کیا تھا تری تصویر کو میں نے بُلایا ہے تو بولی ہے
تبسم، چاکِ جیبِ گل، ترنم، نالۂ بلبل یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بیدردوں کی بولی ہے
مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اُس کے فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے
یہ ہو گئی شور خ اے صیاد مدت کی اسیری سے نیا قیدی ہوں میں - آواز میری بھولی بھولی ہے

پھر فرمایا: ایک مرتبہ میں شیخ عبدالقادر اور اقبال جالندھر میں غریب خانہ پر شام کے وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر کسی خوش گلو بے فکرے پنجابی نوجوان نے یہ مصرع الاپا: ع "جتھے تیری پب دھردی اوتھے اُگدا سرو دا بوٹا"

(جہاں میری محبوب پاؤں دھرتی ہے - وہاں ایک نخلِ سرو اُگ آتا ہے)

یہ مصرع سنتے ہی اقبال پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی - وہ اس مصرع کو برابر سنتے رہے اور سر دھنتے رہے - یہاں تک کہ اس نوجوان کی آواز ڈوب گئی - پھر فرمایا: "شیخ صاحب، دیکھا پنجابی زبان میں لطیف موضوعات کے لئے بھی کس قدر بھرپور پیرایۂ بیان ہے۔ بھلا اس چھوٹے سے سیدھے سادے مصرع میں تاثیرِ حسن کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔" پھر فرمایا۔ اقبال شیخ عبدالقادر کی طرح محفل طراز نہ تھے - وہ اپنی طبعی ظرافت کے باوجود زیادہ سنجیدہ تھے - وہ بہت نجی قسم کی محفلوں میں جہاں محض خالص احباب کا مجمع ہوتا۔ کھلتے تھے - مگر جونہی کوئی غیر آ گیا - وہیں چپ ہو گئے - اسی بنا پر شیخ عبدالقادر کی طرح وہ مجلسی طور پر متاثر نہ کرتے تھے۔ مگر جب اپنی آئی پر آتے تو پھر چٹکلوں پر چٹکلے چھوڑتے جاتے تھے - ہم نے اقبال کو بطور انسان دیکھا ہے - مگر معاشرے کا تقاضا ہے کہ اُن کو بطور فرشتہ پیش کیا جائے - افسوس پرانے لوگ اُٹھتے جا رہے ہیں - اقبال پر شاید اب کوئی شخص بطور انسان کچھ کہہ نہ سکے گا۔ حالانکہ یہ بھی "اصلی اقبال" کی ہمہ گیر شخصیت ہی کا ایک لطیف۔ دلپذیر اور خوش رنگ پہلو ہے۔ اور اس سے اُن کی عظمت میں کچھ فرق نہیں آسکتا۔" پھر ملک صاحب آبدیدہ ہو گئے - یہاں سے بات کا رُخ میرنیرنگ کی طرف پھر گیا۔ فرمایا:

اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے ایک جلسہ میں بیٹھے بیٹھے میرا مختصر سا تعارف میرنیرنگ سے کرایا تھا - مگر میر صاحب کو جلد انبالہ پہنچنا تھا - اس لئے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی - حسنِ اتفاق سے اس ورثہ کے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک کام کی غرض سے انبالہ جانا پڑا۔ رات میر صاحب کے ہاں بسر کی - تمام رات شعر و شاعری ہوتی رہی - دوسرے روز علی الصبح مجھے واپس جالندھر روانہ ہونا تھا۔ مگر میر صاحب کا تقاضا تھا کہ میں ان کے ہاں کچھ دن مزید ٹھہر جاؤں - بالآخر جب اُن کے اصرار کے باوجود اپنے جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔ اور گھر سے چل نکلا - وہ ساتھ ہو لئے - اور کہا لو بھئی حبیب، ایک شعر ہو گیا ؎

مانوس کیوں نہ ہو دلِ وحشی حبیب سے اک یارِ دلنواز ملا ہے نصیب سے

جب ہم انبالہ اسٹیشن پر پہنچے، تو وہاں پر بھی میر صاحب نے اصرار کیا کہ میں نہ جاؤں - میں خاصا پریشان سا تھا کیونکہ کام ہی کچھ ایسا آ پڑا تھا کہ اُس روز جالندھر جانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ الغرض میں نے ٹکٹ خریدا - اور ٹرین پر سوار ہو گیا، میرنیرنگ ٹرین کے باہر پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں - میں ٹرین کے دروازے کی آہنی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا ہے اور میرنیرنگ کے سامنے کھڑا

ہوں۔ گاڑی نے وِسل دیا۔ اب میر نیرنگ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ مجھے پکڑنے کے لئے بڑھایا اور پُراشتیاق آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "اب بھی اُتر آؤ"۔ مگر اسی اثناء میں گاڑی میں جنبش پیدا ہوئی اور میر نیرنگ کا ہاتھ میرے ہاتھ کے قریب سے خالی نکل گیا وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگے اور کہا۔ لو۔ ایک شعر اور ہو گیا ؎

اے وائے نارسائی دستِ دراز شوق　　　　اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے

میر صاحب اِسی عالم اضطراب میں واپس ہوئے۔ مَیں جالندھر پہنچ گیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے اطلاع ملی کہ لاہور سے شیخ عبدالقادر اور اقبال اور انبالہ سے میر نیرنگ میرے ہاں تشریف لا رہے ہیں۔ شیخ عبدالقادر اور اقبال کچھ پہلے آ گئے تھے۔ اب میر نیرنگ کا انتظار تھا۔ ہم تینوں جالندھر اسٹیشن پر انبالہ سے آنے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ وقفہ کے بعد وہ ٹرین آگئی۔ میر نیرنگ ایک ڈبہ کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے دُور سے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ ہم بھی اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ٹرین بھی کشاں کشاں اُن کو ہمارے قریب لا رہی ہے وہ بھی ساتھ ساتھ زیرِ لب مسکرا رہے ہیں۔ پلیٹ فارم پر اُترے اور کہا: "لو بھئی ایک شعر ہو گیا ؎

کہہ دے گی دُور سے نگہِ شوق وہ پیام　　　　الفاظ جس کو کہہ نہیں سکتے قریب سے"

اس پر اقبال اور شیخ عبدالقادر، مجھے اور میر نیرنگ کو بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس پر میر صاحب مسکرائے اور ان دونوں کو مخاطب کر کے بولے: "ایک اور شعر ہو گیا: ؎

ہم نے انہیں سُنا ہی دیا ماجرائے دِل　　　　حالِ مریض کیوں کہ چھپاتے حبیب سے

اس پر شیخ عبدالقادر بات کو پا کر، میری طرف اشارہ کر کے، فی الفور بولے: میر صاحب، آپ نے ان کی جوانی دیکھی ہے بچپن نہیں دیکھا۔ وہ ہم نے دیکھا ہے۔ اس پر میر صاحب نے لمحہ بھر کے لئے تردّد کیا اور کہا: "میں نے وہ بھی دیکھ لیا اور یہ شعر پڑھا:

اللہ رے اُن کی اُٹھتی جوانی کی شوخیاں　　　　بچپن میں تھے جو بھولے سے چپ چپ غریب سے

اب شیخ عبدالقادر اور اقبال، نیرنگ کا یہ رنگ دیکھ کر چُپ ہو گئے اور اسی عالم میں ہم سب گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

انبالہ میں میرے ایک اور دوست مرزا اعجاز حسین تھے۔ وہ رہنے والے دہلی کے تھے۔ مگر انبالہ میں مقیم ہو گئے تھے ان کو جب میر نیرنگ کی جالندھر والی غزل کے واقعات کا علم ہُوا تو جوشِ محبت اور احساسِ رقابت سے گویا برہم ہو گئے۔ اور جھٹ ایک غزل مجھ پر کہی جس کا مطلع یہ ہے ؎

رازونیاز، ظاہر و باطن رقیب سے　　　　کیا کہئے ہم کو شکوے ہیں کیا کیا حبیب سے

چنانچہ مذکورہ واقعہ کے بعد جب مَیں میر نیرنگ سے ملنے دوبارہ انبالہ گیا۔ تو مرزا اعجاز حسین بھی اُن کے ہمراہ مجھے لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر تشریف لائے۔ اِس پر میر نیرنگ نے ایک نظر مجھے اور ایک نظر مرزا اعجاز حسین کو دیکھا، اور پھر ایک معصوم شرارت سے یہ شعر پڑھا ؎

جلنے کے دِل کو اور سبب نا مزود تھا　　　　ہم نے نوازشیں تری کہہ دیں رقیب سے

اور کچھ اِسی عالم میں اپنا عدیم المثال مقطع کہا ؎

تحسینِ حسنِ یار میں میرا ہے ہم خیال　　　　نیرنگ مجھ کو کیوں نہ ہو الفت رقیب سے

اور اس طرح میر نیرنگ کی یہ مشہور غزل مکمل ہوئی ۔ اس غزل پر بعد ازاں خوب خوب غزلیں ہوئیں ۔ چودھری خوشی محمد ناظر جو ملک صاحب کے مشترک دوست تھے ۔ وہ اس زمانے میں کشمیر میں بندوبست کمشنر تھے ۔ ان کو جب میر صاحب کی اس غزل کا علم ہوا تو انہوں نے کشمیر میں بیٹھے ہوئے اسی زمین میں ایک غزل کہی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے :

مطلع : کہتا ہے شوق جلد ملیں گے حبیب سے ۔۔۔ کہتی ہے یاس بچھڑے ہیں ملتے نصیب سے

مقطع : ناظر زینِ شعر کا کچھ کیجے بندوبست ۔۔۔ کھیتوں کو جا کے ناپیے حضرت جریب سے

ملک صاحب کی طبیعت اب غائت درجہ موزوں ہو گئی تھی ۔ وہ گفتگو میں اُردو اور فارسی کے نادر اشعار ایسے برمحل استعمال کرتے کہ گویا یہ اشعار اسی موقعہ کے لئے ہی کہے گئے ہیں ۔ وہ بلبلِ ہزار داستان کی طرح اس شام نغمہ پیرا رہے انہوں نے لطائف و ظرائف سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موتی بکھیر رہے ہیں ۔ اور ہر شخص بقدر ذوق اُن سے جھولیاں بھر رہا ہے ۔ وہ شیخ عبدالقادر ۔ اقبال ۔ میر نیرنگ ۔ سر راس مسعود اور خوشی محمد ناظر کے نام پر لوٹ لوٹ جاتے تھے ۔ وہ گاہ احبابِ رفتہ کے اندوہِ مفارقت سے مغلوب ہو کر بعید آزردہ خاطر ہو جاتے ۔ اور شدتِ احساس سے آہیں بھرتے اور گاہ وہ ترنگ میں آ کر احبابِ حاضر کی ضیافتِ طبع کے لئے احبابِ رفتہ کے شگفتہ اور درخشندہ ماضی کو حال کی نقرئی طشتری میں پھولوں کی طرح سجا کر خوش سلیقگی اور حسنِ ادا سے پیش کرتے جاتے تھے ۔ اس شام ملک صاحب کی خوشدلی خوش دماغی ۔ اور خوش بیانی نے تو گویا میرے دل میں گھر کر لیا ۔ میں نے بصد ادب و اشتیاق اُن سے اُن کے دولتکدہ کا پتہ بھی پوچھ لیا ۔ اور اس طرح پر اُن کی خدمت میں آنا جانا ہوا ۔ جو تا دمِ زیست رہا ؂

الغرض اِن سے ملاقات بڑھی ۔۔۔ دِل بڑھا ۔ ربط بڑھا ۔ بات بڑھی

اور میں ہر مرتبہ ان کے دامِ محبت میں اسیر ہوتا چلا گیا ۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے "دِل شکستوں" کو محزون و دِل گرفتہ چھوڑ کر چلے گئے ؂

اکنوں بہ زلف یک دو گرہ ہم فزیکن ۔۔۔ بارِ دگر ز حلقہ زلفت رمیدہ ایم

ملک صاحب بعید متواضع ۔ عالی ظرف ۔ مہمان نواز اور وسیع المشرب تھے ۔ وہ محفل طراز اور داستان سرا تھے انہوں نے وطن اور وطن سے باہر اعلیٰ ترین ۔ ثقافتی اور تہذیبی مجلسوں میں عمر بسر کی ۔ وہ بعید خلیق مخلص اور احباب نواز تھے ۔ جلوت اُن کی زندگی ، عزلت اُن کی موت تھی ۔ محفل آرائی ۔ حسن آفرینی ۔ خوش کلامی اور خوش نظری میں میں نے کسی دیگر کو اُن کا مثیل نہ پایا ۔ ان کی شخصیت دلپذیر اور باغ و بہار تھی ۔ وہ ایک گلدستہ تھے ۔ جس میں آہنگ ۔ رنگ و نور نکہت اور نزاکت تھی ۔ بقول اُن کے قدرت نے اُن کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا تھا ۔ وہ عمر بھر صاحبِ جلال و جمال رہے ۔ اُس کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ نسبتاً کمسن تھے مگر اس کے باوصف اپنے دَور کے مشاہیر کے حبیب محبوب تھے ۔ اُن کو تا دیر مشاہیر کی ہم نشینی قربت اور معاصرت میسر آئی ۔ وہ حکیم اجمل خاں ۔ علی برادران ۔ ڈاکٹر انصاری ۔ علامہ اقبال ۔ شیخ عبدالقادر ۔ سر راس مسعود ۔ میر غلام بھیک نیرنگ ۔ چودھری خوشی محمد ناظر ۔ سید سجاد حیدر یلدرم ۔ لالہ سری رام ۔ مسٹر جسٹس شاہ دین ۔ میاں سر محمد شفیع ۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی - سر تیج بہادر سپرو - سر شاہ سلیمان - مسز سروجنی نائیڈو - مولینا حسرت موہانی - فانی بدایونی - ریاض خیرآبادی - خواجہ حسن نظامی - نیاز فتحپوری - مولینا مودودی - ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی وغیرہم کے ہم جلیس و ہمنشیں رہے - اُن کا سب سے بڑا کمال یہ تھا - کہ وہ نہ صرف ان اصحابِ کبار کی ذات سے بےحد محبت کرتے تھے - بلکہ اُن کی جلوت و خلوت اور اُن کی علمی و ادبی زندگی کے صحیح معنی میں دیدہ ور اور داستان سرا تھے - اُن کو اپنے احباب سے غایت درجہ محبت تھی - اور جب اُن کے احبابِ رفتہ میں سے کسی کا نام اُن کی زبان پر آجاتا - تو جذبات و احساسات سے مغلوب ہوکر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے - وہ قسّامِ ازل سے ایک حساس دِل لائے تھے - اور یادِ رفتگاں سے اُن کا دِل بھر آتا - اور اُن کے قابو میں نہ رہتا تھا اسی بنا پر وہ اکثر اُن کے بیان سے عمداً احتراز بھی کرتے تھے - کئی مرتبہ دورانِ گفتگو میں نے اُن کو شدّتِ احساس سے بادیدۂ نم دم بخود ہوتے دیکھا - اُن کی ذات جوہرِ احساس سے مالا مال اور متاعِ حسن و خوبی تھی - وہ وضعداری اور خوش اطواری سے عبارت تھے - وہ مشرقی تہذیب کا ایک ایسا دلپذیر نمونہ تھے - جو مغربی اقدارِ حیات کے محاسن کو بھی اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنی ذات میں سموئے ہوئے ہو - وہ شعر کی طرح موزوں تھے - اُن کی زندگی جو کسی زمانے میں دینوی وجاہت اور خوش خلقی کے سبب بہت پھیلی ہوئی ہوگی - گو اب سمٹ سمٹا کر بہت حد تک گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود ہوکر رہ گئی تھی - مگر پھر بھی اُن کی خلوت میں جلوت کا لُطف تھا - اُن کا دِل اب بھی ہمہ وقت مجلس آرا زندہ اور بے تاب تھا - انہوں نے اپنی خوش نظری سے اس چھوٹی سی دُنیا میں بھی رنگا رنگی - اور تنوع پیدا کر رکھا تھا - انہوں نے گھر ہی کو اب "انجمن خوش نفساں" بنا دیا تھا - اُن کی اولاد اُن سے بے پناہ محبّت کرتی تھی - اُن کا حلقہ احباب گو اب مختصر تھا - مگر وہ بھی اُن کی دلداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا - اولاد کے لئے وہ ایک محبوب - بے تکلف اور بقول اُن کے "یار باپ" تھے - اُن کی خوش دماغی - اور شگفتہ مزاجی کے سبب اُن کے گھر میں ہمہ وقت ایک دفترِ علم و ادب کھُلا رہتا تھا - اُن کا گھر نہ تھا بلکہ حکایاتِ مشاہیر" کا دبستان تھا اُن کی صحبت میں بیٹھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے ہم کسی علمی شہر میں آبسے ہیں - جس کا ہر شہری اپنی ذات میں آدابِ شہریت اور اقدار تہذیب و معاشرت لئے ہوئے ہے - ابھی وہ اپنے معاصرین کے کوائف و لطائف کہہ رہے تھے - تو ابھی اُن کا کوئی دوست یا عزیز اُن کی خدمت میں کوئی شعر یا غزل پیش کر رہا ہے - ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ اُن کا گھر پنجاب، لکھنؤ اور دہلی کی حسین معاشرت کے جملہ محاسن کا ضامن ہے - جہاں کوئی پاکیزہ ادبی محفل یا باوقار مجلسِ مشاعرہ منعقد ہو رہی ہے - جس کے وہ صدر نشین ہیں -

ملک صاحب کو کچھ عرصہ سے دِل کا عارضہ تھا - مگر کیا مجال کہ نازک سے نازک وقت میں بھی اُنہوں نے دِل کے ہاتھوں مجبور ہوکر کبھی ہتھیار ڈالے ہوں - کبھی کبھی ضعف و نقاہت کے سبب بے ہوش ہو جاتے - مگر اِس عالمِ بے ہوشی میں بھی وہ احباب کو فراموش نہ کرتے - انہوں نے خود مجھ سے تذکرہ فرمایا کہ ایک دفعہ جب اُن پر دِل کا شدید دورہ پڑا ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے - اُن پر بے ہوشی اور غنودگی سی طاری ہوگئی - ایسے میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی صاحب اُن کی عیادت کو میو ہسپتال میں تشریف لائے - انہوں نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور فرطِ محبّت سے دبایا - جس پر انہوں (ملک صاحب) نے بھی اُسی کیفیت غنودگی میں جواباً اُن کا ہاتھ دبایا - قرشی صاحب کوئی نصف گھنٹے کے قریب اسی حالت میں اُن کے پاس بیٹھے رہے اور جب اُٹھے اور اجازت چاہی تو ایک شعر پڑھا - تو قرشی صاحب کا بیان ہے کہ ملک صاحب نے بھی جواباً

ایک موزوں شعر پڑھا۔

میرے روبرو جب قرشی صاحب نے ملک صاحب کی صحتیابی پر یہ واقعہ سنایا اور انہیں بتایا کہ انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

نازم فریب صلح کہ غالب نگھئے تو ناکام رفت و خاطرِ امیدوار بُرد

اور یہ کہ آپ نے جواب میں چندر بھان کا یہ شعر پڑھا تھا:

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

میرے روبرو جب قرشی صاحب نے ملک صاحب کی صحتیابی پر یہ واقعہ اُن کو سنایا تو انہوں نے فرمایا اب میں اگر اسے جذبِ محبت اور پاسداری خاطر — باب نہ کہوں تو اور کیا کہوں' پھر آبدیدہ ہو گئے اور یہ شعر پڑھا۔

بہ دل گفتم کدامی شیوہ است انجام دشوارش نفس در خون طپید و گفت' پاس آشنائی ہا

ملک صاحب کو دوا سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ با مرِ مجبوری اپنے بچوں کے یا ڈاکٹروں کے اصرار پر دوا استعمال کرتے ہسپتال جانا اُن کو بحد ناپسند تھا۔ اس کی فضا ان کے لئے ساز گار نہ تھی۔ وہ ہسپتال میں پابندی اور عزلت کی زندگی سے بے حد گھبراتے اور اس کے خیال ہی سے پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کے اعزہ اور احباب ہزار ہزار جتن کر کے - دم دلاسے دیکر اُن کو مجلس آرائی کی ضمانت دے کر طرح طرح سے بہلا پھسلا کر ہسپتال لے جاتے تھے۔ ہسپتال میں وہ عام وارڈ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ کیونکہ وہاں پر ہمہ وقت اُن کے احباب ان کے پاس نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ Isolation Ward ہی کو مخصوص کرانے کی سعی کرتے۔ وہ وہاں پر احباب کے جلو میں جاتے۔ اوّل اوّل ڈاکٹر - سسٹریں اور نرسیں جو اُن کی صحتیابی کے پیشِ نظر اُن کے قریب مجمع حضار پسند نہ کرتیں۔ بعد ازاں خود بھی اُن کے حلقۂ ارادت و محبت میں شامل ہو جاتیں اور جب وہ ہسپتال سے لوٹتے تو گویا احباب کا ایک تازہ "قافلۂ گل" اُن کے دیدہ و دل کے ہمراہ جاتا۔ میو ہسپتال کے اسٹاف کو ایسا خوش نفس اور بہار آفریں مریض اب شاید و باید ہی کبھی میسر آئے۔

آخری دنوں میں ملک صاحب سمجھنے لگے تھے کہ وہ علاج معالجہ اور دوا دارو کی منزل سے آگے نکل گئے ہیں۔ ان کو اپنے دل کی کیفیت کا علم تھا کہ یہ ظالم تمام "تدبیروں" کے باوصف کسی وقت اُن کو دغا دے سکتا ہے۔ وہ کبھی کبھی متاسف ہو کر یہ شعر پڑھتے۔

کونسی کی نہ دوا کونسی مانگی نہ دعا ہم نے کیا کیا نہ کیا اپنے سنبھلنے کے لئے

مگر انہوں نے اپنے معمولات میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ اُن کا دسترخوان اُن کے دل کی طرح وسیع رہا۔ گھر میں ہر وقت احباب کے لئے ماکولات و مشروبات کا ہنگامہ رہتا۔ کبھی کبھی احباب سے یُوں مخاطب ہوتے۔

آؤ مجنونِ غمِ فرقت کی کریں کچھ باتیں دل بہل جاتا ہے بیمار کا بیمار کے ساتھ

اُن کے ہم عصر احباب، تقریباً سب کے سب اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ شاید چند ایک زندہ تھے مگر کوئی کہیں تھا کوئی کہیں۔ احبابِ رفتہ کی طرح وہ اُن کی یاد کو بھی ہمہ وقت سینہ سے لگائے رکھتے تھے۔ اُن میں سے جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو عمداً یہ خبر اُن سے کئی کئی دن پوشیدہ رکھی جاتی تاکہ خبر سن کر اُن کا دل بے قابو نہ ہو جائے۔ جب کبھی اتفاقی طور پر اُن کو اس کا علم ہو جاتا۔ تو وہ دنوں دل گرفتہ اور محزون رہتے۔ کبھی پریشان ہو کر مجھے اپنے پاس بلا لیتے۔ اور فرماتے چودھری صاحب، آج میرے ایک عزیز دوست کا انتقال ہو گیا ہے اس کے دم سے احبابِ رفتہ کا چراغ روشن تھا۔ مگر آج وہ بھی ہم کو ظلمات میں چھوڑ کر چل دیا۔ پھر آبدیدہ ہو جاتے

اور فرماتے: ہائے کیسے کیسے لوگ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں اور کیسے کیسے لوگ اپنے سامنے رخصت کئے ہیں ایسے موقعہ پر کبھی کبھی یہ شعر پڑھتے۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انقلاب دیکھا ۔۔۔ برائی دیکھی۔ بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

آخری عمر میں اُن کی صحبت بہت مختصر سے حلقۂ احباب پر مشتمل تھی۔ فطرتاً وہ احباب کے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ ویسے بھی وہ احباب کے بارے میں بیحد بالغ نظر اور نفیس الطبع تھے۔ عمر بھر اُن کی مشاہیر سے دوستی رہی۔ مگر حالات بدل چکے تھے۔ اس لئے اب وہ احباب کے انتخاب کے بارے میں کوئی خاص تفحص نہ کرتے۔ اُن سے جو بھی اشتیاق سے ملتا وہ محبت اور خلوص سے پیش آتے گویا احباب کے بارے میں اب اُن کی کیفیت کچھ اضطراری نوعیت کی سی ہو گئی تھی ؎

نگاہِ ناز کچھ ایسی بھری حرماں نصیبوں سے ۔۔۔ کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

اُن کو احبابِ رفتہ کی مفارقت کا داغ ہمہ وقت جلاتا رہتا۔ وہ بے چین سے رہتے اور اپنے گزرے ہوئے وقت اور صحبتوں کو یاد کرکے اکثر دل مسوس کر رہ جاتے جب کبھی کوئی محفل اُن کی مرضی کے مطابق مل جاتی۔ تو بیحد خوش ہوتے۔ اپنے معاصرین کے قصے بیان کرتے اور ان کو اپنا پُرانا رنگِ محفل تمامتر رعنائیوں کے ساتھ یاد آجاتا۔ اکثر فرماتے:

نظر سے جب گزرتا ہے کوئی پھولا پھلا گلشن ۔۔۔ تو پہروں ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے

اب شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی۔ شیخ عبدالشکور۔ خان سعد اللہ خاں اور نواب سعادت حسن خان قزلباش سے اُن کی بہت یاد اللہ تھی۔ وہ اپنے احباب کی بیحد عزت اور قدر افزائی کرتے۔ اُن سے مخلصانہ محبت کرتے اور اُن کی ہر طرح خاطرداری کرتے۔ .. وہ اپنے پاس اشعار کا ایک بے بہا خزینہ رکھتے تھے۔ جن کو وہ بے ساختہ موقع و محل کے مطابق حسن و خوبی سے انجمن احباب میں استعمال کرتے تھے۔ آہنگ اور شعریت اُن کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ صاحب عمل بھی تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ حوصلہ مند اور جواں ہمت تھے۔ وہ ہمت ہارنے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ وہ احباب سے پاسداری اور مروت سے پیش آتے اور اکثر انیسؔ کا یہ شعر پڑھتے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم ۔۔۔ انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

وہ انسان دوست تھے۔ احترامِ آدمیت ان کا مذہب تھا۔ انہوں نے زندگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پائے۔ وہ مجسٹریٹ سے لے کر گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسرِ اعلیٰ تک رہے۔ وہ ریاست بھوپال۔ خیرپور اور جوناگڑھ وغیرہ میں معتمد اور وزیر رہے۔ انہوں نے دورانِ ملازمت پورے ہندوستان اور یورپ کی سیاحت کی۔ اچھے سے اچھے احباب۔ اچھی سے اچھی مجلس اور اونچی سے اونچی سوسائٹی دیکھی مگر اس کے باوجود اُن کی طبیعت میں درویشانہ استغنا اور بے نیازی تھی۔ حالانکہ وہ بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ اور ایک عرصہ یورپ میں بھی رہے تھے مگر ان میں تمخسر یا غرور نام کو نہ تھا۔ وہ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے لطائف و محاسن کا ایک حسین امتزاج تھے۔ اُن کا ہر قدم ایک آہنگ اور ہر نفس ایک نغمہ لئے ہوئے تھا۔ میں نے اُن کو زندگی کے آخری سانسوں میں بھی اُکھڑا ہوا نہ پایا۔ اُنہوں نے آخری وقت تک گل گشت و غنا کو تر و تازہ اور بہارِ قلب و نظر کو برقرار رکھا۔ وفات سے ایک دو روز قبل نقاہت کے سبب جب اُن کو کبھی لغزش پا ہوئی اور اس نیازمند نے بڑھ کر اُن کو سہارا دیا تو انہوں نے اس سے لطف اُٹھایا اور سراپا سپاس ہو کر بے ساختہ یہ مصرع دُہرایا ؏

چہ دستے دہم بہ یار کہ بدست مے ردد

جس سے اُن کی امداد اُن کے دستگیر کی تمام کلفت دُور ہو گئی۔ میری کم نصیبی ہے کہ مجھے اُن کی باغ و بہار زندگی کے آخری ایک دو سال ہی میسر آئے۔ جبکہ بقول ان کے باب زندگی ہی بند ہو چکا تھا۔ "I have hirest loved + closed the door." مگر اس مختصر سی مدت میں بھی انہوں نے اپنے اخلاق اور محاسن سے اِس فقیر کو اپنا گرویدہ اور حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ انہوں نے پہلے روز ہی مجھے اپنا کہا اور پھر تا دمِ زیست اپنا ہی سمجھا۔ جب کبھی مَیں ایک روز بھی اُن کی خدمت میں حاضری سے ناغہ کرتا۔ تو بیحد پریشان رہتے۔ اور مجھے اُن کے حضور میں معقول سے معقول اعتذار کے باوصف ندامت ہوتی۔ جب کبھی مَیں ان کے ہاں کسی روز خلافِ توقع وقت سے پہلے حاضر ہوتا۔ تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اُن کی وحشت کم ہو جاتی اور وہ بھرپور خوشی سے میرا خیر مقدم کرتے۔ اکثر فرماتے: "خوب آئے!" اور پھر بے ساختہ کوئی نہ کوئی مصرع پڑھ دیتے۔ کبھی کبھی اپنا کلام بھی سُناتے جو اُن کو اب بہت حد تک فراموش ہو گیا تھا۔ بعض اشعار جو میں نے اِس ضمن میں اُن سے سُنے یہ ہیں ؎

کس کو یہ نہیں ہے کہ دیتا ہے تو فریب — یاں تو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں
قائل ہوں خوش کلائی واعظ کا مَیں ولے — پیرِ مُغاں سے مجھ کو عقیدت ہے کیا کروں

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا — زمین کا سخت ہو جانا فلک کا دُور ہو جانا
شبِ وصل اپنی آنکھوں سے عجب اندھیر دیکھے ہیں — نقاب اُن کا اُٹھنا رات کا کافور ہو جانا
عبث غم کرتے رہتے ہیں جو اپنے دلِ شکستوں کا — شگونِ نیک ہے شیشے کا چکنا چُور ہو جانا
امیدِ وصل کو اب آرزو جھوٹے جُھلاتی ہے — قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دُور ہو جانا
ہمارے زخمِ دل نے دل لگی اچھی نکالی ہے — چھپائے سے تو چھپ جانا مگر ناسُور ہو جانا

ایسے بندے بھی ہیں خدائی میں — مر گئے ہم اُنہیں خبر نہ ہوئی
آؤ میرا جنازہ اُٹھتا ہے — پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

وفات سے چند روز قبل تکلیف بڑھ گئی تھی۔ مگر بیحد ضبط سے کام لیتے تھے۔ ہمیشہ احباب اور اولاد کو حوصلہ دیتے اپنے صاحبزادے اور صاحبزادی کی اولاد سے بیحد محبت کرتے۔ اُن کو ہمیشہ اپنے پاس اور نظر کے سامنے رکھتے کبھی کبھی اپنے ایک نواسے کو یوں چھیڑتے: "چودھری صاحب، اِن کا نام آذر ہے۔ دیکھئے مسلمانوں کے گھر میں بُت گر اور بت پرست نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں"۔ کبھی کبھی اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے فرماتے: "اولاد اگر ہے تو بیٹی ہے۔ میری بیٹی تو ویسے بھی سب بیٹیوں سے اچھی ہے۔ جہاں آرا کو شاہ جہاں سے جو محبت تھی۔ ویسی ہی محبت میری بیٹی بلقیس جہاں کو مجھ سے ہے"۔ کبھی کبھی عالمِ یاس میں دردمندی سے بچوں سے فرماتے: "ہماری باتیں یاد رکھنا۔ ایسا "یار باپ" تم کو نہیں ملے گا"۔

ملک صاحب نے شب و روز احباب کے ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو کو پیار رکھا۔ ان کو زندگی کی ہما ہمی سے بیحد محبت تھی۔ وہ کسی رات بھی دوسرے دن کا پروگرام مرتب کئے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ بلکہ اکثر تو وہ ہفتوں اور مہینوں کے پروگرام بھی بڑی دلچسپی اور انہماک سے تمام تر تفاصیل و جزئیات کے ساتھ ترتیب دیتے۔ احباب کو ٹیلی فون کئے جا رہے ہیں۔ گھروں پر ملازم بھجوائے جا رہے

ہیں۔ اب کے جمعرات کو حکیم صاحب کے مطب میں یارانِ باصفا کا مجمع لگے گا۔ اتوار کو تمام احباب گھر (وارث روڈ) پر چائے پر مدعو ہوں گے۔ آئندہ اتوار کو Casino یا گوشۂ مسرت میں کھانا کھائیں گے۔ (گوشۂ مسرت کے نام پر میں "گوشۂ مسرت زیرِ سرپرستی جناب فضل کریم صاحب باورچی" کہہ کر گویا پورے کا پورا سائن بورڈ ہی پڑھ دیتا۔ جس پر وہ زیرِ لب مسکراتے اور اس سے پورا لطف اٹھاتے۔ علی الخصوص جب میں سائن بورڈ مذکورہ کے بارے میں کہتا کہ اس کا وزن وہی ہے جو حکیم صاحب کے سائن بورڈ کا ہے یعنی "قومی دواخانہ زیرِ سرپرستی عالیجناب شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی" اس وہ بے اختیار ہنسے اور مجھے سرزنش کرنے کے انداز میں فرماتے کہ وہ میری اس شرارت کی اطلاع حکیم صاحب موصوف کو ضرور کریں گے) مارچ میں راولپنڈی اور پشاور جائیں گے اور جون میں تفریحی گاڑی سے سوات چلیں گے۔ اکثر فرماتے "بھئی جب تک میں پروگرام کی جزئیات تک طے نہ کر لوں۔ مجھے کل نہیں پڑتی"

ایسے ہی انہوں نے وفات سے ایک شام قبل اتوار اور جمعرات کا پروگرام بنایا تھا" ہاں کبھی کل کا پروگرام کچھ مشروط ہے۔ اگر میری طبیعت اچھی رہی تو کل شام کے چار بجے "گوشۂ مسرت" میں چائے پئیں گے۔ ورنہ گھر ہی پر چائے کا اہتمام ہوگا۔ پھر حکیم صاحب اور شیخ عبدالشکور صاحب کو اپنے اس پروگرام سے مطلع کیا۔ خانساماں کو بلا کر اس سے شامی کباب French اور Finger chips Toast بنانے کی ترکیب پوچھی۔ گویا اس کا امتحان لیا اور اپنا اطمینان کیا۔ تاکہ احباب کی بہتر سے بہتر تواضع ہو سکے۔ مجھے فرمایا: کل اتوار ہے آپ کی تعطیل ہے۔ وقت سے ذرا پہلے آ جائیے" میں اس رات دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ تکلیف بڑھ گئی تھی۔ مگر ہم پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ وہ رات کے ایک بجے تک ہمارے پاس صوفہ پر بیٹھے رہے۔ پھر ہم نے ان کو بستر پر لٹا دیا۔ مجھ سے محبت سے فرمایا: "چودھری صاحب! آج رات بہت خنک ہے۔ میں بھی کتنا خود غرض ہوں کہ آپ کو بے وقت اتنا عرصہ اپنے پاس بٹھائے رکھتا ہوں، مگر کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مجھے تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ میرے پاس ہی رہیں۔ مگر خیر۔ گھر میں آپ کا انتظار ہوگا۔ گو دل نہیں مانتا مگر آپ اب جا سکتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں روکتا" میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا: پاپا (گھر میں تمام اعزہ و اقارب ان کو اسی پیارے لفظ سے خطاب کرتے تھے) آپ اطمینان سے بستر پر لیٹ جائیے۔ جب آپ کو نیند آ جائے گی۔ تو میں گھر چلا جاؤں گا۔" اس پر وہ خوش ہو گئے مگر ساتھ ساتھ دل ہی دل میں ان کو پریشانی رہی کہ میں فروری کی خنک رات کو کس تکلیف سے ایک بجے گھر پہنچوں گا۔ پھر ان کو خواب آور گولی دی گئی۔ وہ نصف گھنٹے کے اندر اندر کچھ سو گئے۔ گاہ گاہ وہ عالمِ غنودگی میں تکلیف سے کھانستے۔ کبھی خواب کی حالت میں ہائے ہائے کرتے۔ کبھی یہ مصرع پڑھتے: ؎

"حافظا وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس!"

وہ مجموعی طور پر بے چینی اور بے کلی سی محسوس کرتے۔ مگر ضبط سے کام لیتے۔ میں رات کے دو بجے وارث روڈ سے واپس آیا۔ دل میں عجیب عجیب وسوسے گزرتے تھے۔ چند روز سے ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار ہو گئی تھی۔ اور ہم سب بے حد پریشان تھے۔ وہ کبھی کبھی اشارۃً اور کنایوں سے بھی ایسی دلدوز باتیں کرتے۔ کہ پورے گھر پر مایوسی چھا جاتی اور ہم گویا عالمِ نزع کے کرب و درد میں مبتلا ہو جاتے۔

دوسرے روز (اتوار۔ دس فروری ۱۹۵۷ء) میں حسبِ ارشاد چار بجے کی بجائے ۳½ بجے سہ پہر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری آمد سے ایک لمحہ قبل وہ کوٹھی کے لان میں اپنے عزیزوں میں بیٹھے ہوئے ہنسی خوشی باتیں کر رہے تھے۔ اور ان کی عزیز بیٹی "گوشۂ مسرت" میں بچوں کو چائے پر ساتھ لے جانے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ کہ اچانک ان کو "اچھو" ہوا اور دم الٹ گیا۔

میں عین اُسی وقت اُن کی خدمت میں پہنچا۔ مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی حالت غیر ہو گئی۔ اُن کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ لاچار اور دم بخود سے ہو گئے۔ اگرچہ اُن کو فی الفور آکسیجن دیا گیا۔ ان کے ہمسایہ ڈاکٹر شفیق نے ان کو کورامین اور پنسلین کے انجکشن دیئے مگر کوئی چیز کارگر نہ ہوئی۔ اتنے میں بھاگم بھاگ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب بھی آ گئے۔ مگر ملک صاحب کی طبیعت بدستور بگڑتی گئی۔ انہوں نے بمشکل دو چار منٹ ہی اس حالت میں گزرے کہ اُن کی بہو کے ہاتھ سے اُن کی نبض چھٹ گئی۔ انہوں نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔ جس پر اُن کی عزیز بیٹی جو ابھی تک اِس "ناگہانی حملے" کی نوعیت کو بھی سمجھنے نہ پائی تھی۔ تیورا کر زمین پر گری اور گم سم ہو گئی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ملک صاحب کی رُوح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ اب وہی "انجمن خوش نفساں" یعنی ان کی بیٹی، بہوئیں اور صاحبزادے جو ایک لمحہ پہلے "خوش نوا طائرِ بلند بام" کی نغمہ سرائیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اب ان پر نوحہ کناں تھے۔ وہ بلبل ہزار داستان جو ابھی صحن چمن میں نوا سنج تھا۔ اور ہمصفیروں کے ہمراہ چلنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اپنے چمن کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اُڑ گیا۔ بیٹی کے لئے وقت کی رفتار تھم گئی۔ آٹھ روز تک اس پر مسلسل کیفیت جنون رہی۔ وہ عالمِ خود فراموشی میں رہی۔ وہ اپنے والد کی وفات کی خبر پر یقین کرنے سے قاصر رہی۔ اس کی ذہنی کیفیت کا محور یہ خیالات تھے: "آج اتوار ہے چار بج رہے ہیں۔ باپا نے مٹر چاول کھائے تھے۔ ابھی ابھی ہم سب گوشۂ مسرت میں چائے پینے جائیں گے۔" اس کے لئے اس کے والد اب بھی زندہ تھے۔ اُس نے نہ اپنے والد کا جنازہ اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ نہ اُن کو سوئے قبرستان جاتے ہوئے دیکھا اور نہ لحد میں اُترتے ہوئے دیکھا، وہ زمان و مکان کے تصور سے یکسر بیگانہ ہو گئی۔ اور بالآخر جب اسے ہوش آیا اُس کی آنکھ کھلی تو اُس وقت بہار رخصت ہو چکی تھی۔ "قافلۂ گل" جا چکا تھا۔ چمن خزاں دیدہ تھا۔ اُسے یُوں محسوس ہوا جیسا کہ اُن کے والد کا یہ شعر ؎

آؤ میرا جنازہ اُٹھتا ہے   پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

اُن کے لئے ایک تلخ پیشین گوئی تھی۔ جو اب اس کو برابر آواز دے رہا تھا۔ مگر اُس بے خبر کو خبر نہ ہوئی!

حکیم قریشی صاحب پروگرام کے مطابق جب اُس منحوس اتوار کی شام کو "گوشۂ مسرت" پہنچے۔ تو وہاں پر ملک صاحب کی بجائے اُن کی مفارقتِ دائمی کے پیغام نے اُن کا استقبال کیا۔ وہ بے حال ہو کر "یار" کے پاس آئے۔ وہ "یار" جو عالمِ بیہوشی میں بھی حکیم صاحب کو تعظیم دیتا۔ اب خوابِ ابدی میں بے خبر پڑا تھا۔ حکیم صاحب نے جب وفورِ محبت اور جوشِ جنون سے آواز دے کر ان کو جگانا چاہا۔ تو سب کے دل فرطِ الم سے پاش پاش ہو گئے۔ حکیم صاحب زبانِ حال سے گویا گلہ کرتے جا رہے تھے ؏

وہ مہمان ہوں جسے میزبان نہیں ملتا

اور میزبان تھا کہ اپنے احبابِ حاضرہ سے رخصت ہو کر احبابِ رفتہ سے جنت میں شریکِ "نائے و نوش" تھا!

ملک صاحب نے زندگی کو موت سے آگے بڑھا دیا۔ اُن کے پروگرام اُن کی موت کے بعد بھی چلتے رہے۔ "جمعرات کو "جمعراتیوں" کی جو مجلس حکیم صاحب کے مطب میں منعقد ہوتی۔ اب میانی صاحب میں اُن کے مزار پر ہوئی۔ محض "فنا و بقا" کی مجبوریوں کے سبب وہ "مزار" میں اور ہم "سرِ مزار" تھے۔ وگرنہ ہم میں اور اُن میں کوئی دیوار حائل نہ تھی ؎

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ایسے توبہ   کوئی مزار میں کوئی سرِ مزار رہے!

ملک صاحب بدستور صدرِ مجلس تھے۔ شیخ عبدالشکور نے پروگرام کے مطابق نظر امروہوی کی ایک غزل سنائی۔ جو اُنہوں نے

اِس مجلس کے لئے خاص طور پر صاحب موصوف سے حاصل کی تھی۔ شیخ صاحب نے ایک دلدوز ترنم کے ساتھ جب یہ مطلع پڑھا

عجب ہے وہ مقامِ جستجو بھی جہاں میں بھی نہیں ہوں اور تو بھی!

تو اب محسوس ہوا کہ ملک صاحب حسب معمول اپنے مخصوص انداز میں اپنے "شیخ ہرجائی" کو داد دے رہے ہیں۔ سب پر وہی مجدانی کیفیت طاری تھی۔ جو اکثر ملک صاحب کی زندگی میں اچھے شعر پڑھنے پر ہم سب پر طاری ہو جاتی تھی۔

بعد ازاں نیاز مند نے "بانگِ رحیل" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔ جو ملک صاحب کی وفات سے چند روز قبل اُن کے ساتھ ایک کرب انگیز اور اذیت ناک اُداس شام سے متاثر ہو کر اُن کی زبان ہی میں ارتجالاً کہی گئی تھی۔

آج پھر گھر میں مرے شامِ غریباں آئی لیلئ زیست در آغوشِ بیاباں آئی
پھر بہاروں نے دیا داغ چلی بادِ خزاں ہر کلی پھول کی پھر چاک گریباں آئی
دل میں پھر ہُوک اٹھی آنکھ ہوئی ہے پرنم سامنے کیسی یہ تصویرِ بیاباں آئی
پھر گجردم کی صدا کان میں آئی ہے کہیں جادۂ زیست کی وہ منزلِ ویراں آئی

زندگی اپنی کہ گلگشتِ تمنا تھی یہاں آنکھ تھی اپنی کہ اک دیدۂ بینا تھی یہاں
ہر قدم میکدہ بردار تھا گویا اپنا ہر نظر حاصلِ سرمستئ مینا تھی یہاں

آنکھ میں چبھتے نہ تھے پھول چمن زاروں کے باعثِ رونقِ کاشانہ تھے مہپاروں کے
بارشِ لطف و کرم ہم پہ سدا ہوتی رہی ہم عناں گیر رہے وقت کے رہواروں کے

نقش ہیں عالمِ اسباب پہ چھوڑے ہم نے دیدہ و دل میں در دوباب پہ چھوڑے ہم نے
عشق کی رسمِ وفا حُسن کے رنگیں نغمے آپ کے حُسنِ جہاں تاب پہ چھوڑے ہم نے

اب کہاں حسنِ نظر، ذوقِ نظر بھول گئے داغِ مہجوریٔ جاں دیدۂ تر بھول گئے
آپ کا حسن تو قائم رہے تا حدِ جہاں ہم ہی درماندہ ہوئے۔ آپ کا در بھول گئے

اتوار کو ملک صاحب کے دولتکدہ پر اُن کے پروگرام کے مطابق "یارانِ باصفا" نے شام کے وقت مجلس کی۔ چائے کے وقت وہ "رندِ لم یزل" ہم میں جسدی طور پر موجود نہ تھے مگر رند جانتے تھے کہ کائنات کے میخانوں کا اہتمام و انصرام اُنہی کے ذمّہ ہے، اور اس کی دلچسپیوں کے وہ نہ صرف ناظر بلکہ شریک بھی ہیں اور رند اُن کا جامِ صحت نوش کر رہے ہیں ؎

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم بعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی!

کل شام (۲۵ر فروری) جب یہ فقیر حضرتِ جوش ملیح آبادی کے آستانہ پر حاضری دینے گیا۔ اور اُن سے یہ کہہ کر اپنا تعارف

کرایا۔ کہ یہ فقیر ملک حبیب احمد خاں صاحب" کا نیاز مند ہے۔ جنہوں نے اب کے مرتبہ آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنی وفات سے دو روز قبل آپ کو اپنے ہاں ایک مجلس مشاعرہ پر دعوت دینے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ تو جوش صاحب کو گویا سکتہ سا ہوگیا۔ وہ جو اس وقت تک تقریباً ایک بوتل شراب آب گرم میں ملا کر نوش جان کر چکے تھے۔ اور ترنگ میں تھے۔ چوکڑی بھول گئے۔ اُن کا نشہ ہرن ہوگیا۔ انہوں نے انتہائی عالم کرب میں شراب کی بوتل کو پرے ہٹا دیا۔ ایک لمبی سی آہ کھینچی۔ اور فرمایا: ہائے، آپ نے کس کا نام میرے سامنے لے دیا۔ وہ جن کو میں پہروں یاد کر کے روتا ہوں۔ ہائے دیکھو' وہ مجھے آواز دے رہے ہیں۔ میں بدنصیب اکیلا یہاں کیوں رہ گیا۔ ہائے، طول عمر بھی کیا عذاب ہے کہ دوستوں کے مفارقت کے داغ دیکھنے پڑے ہیں" پھر انہوں نے اضطراراً درد دل میں ڈوبی ہوئی آغشتہ بخون آواز میں تانک لگا کر یہ دو رُباعیاں پڑھیں ؎

یاں میںئی دھوپ سے گلابی سایا | رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آ! کہ منتظر ہے بزم ارواح | آیا، یارانِ رفتہ، آیا، آیا!

ہیہات دلا کہ غمگساراں رفتند | شیریں بدناں و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند' برباد سوار | در خاک چوں قطرہ ہائے باراں رفتند

مجلس مشاعرہ، مجلس گریہ زیباں ہو کر رہ گئی۔ جوش کو جس قدر تکلیف اُس وقت ہوئی اس کے احساس سے ہی میں دل گرفتہ ہو جاتا ہوں۔ اور مجھے ندامت ہوتی ہے کہ میں نے ملک صاحب کی وفات کی یاد دلا کر حضرت جوش کو عالم نزع سے کیوں ہمکنار کیا! ملک صاحب ہماری صدی کے نامور ادبی مشاہیر کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ ان کے پاکیزہ ذوقِ نظر سے ہمہ وقت ادب کو بالیدگی نصیب ہوئی۔ بقول مولینا صلاح الدین" وہ بیسویں صدی کے اُردو شعر و ادب کی مجسم روایت کا درجہ رکھتے تھے ——— اُنہیں علامہ اقبال۔ شیخ عبدالقادر۔ اور میر نیرنگ مرحوم کی دوستی اور قرب کا شرف حاصل تھا۔ اور دور حاضر کے متعدد بلند پایہ شعراء و اُدباء اور سخن فہم و سخن سنج حضرات کے لئے خود اُن کی دوستی باعثِ فخر و ناز تھی"[1]

ملک صاحب مرحوم کے انتقال کے عین بعد قبرستان سے لوٹتے وقت مولینا صلاح الدین صاحب کی بھی حالت غیر ہوگئی تھی اور انہوں نے اسی کیفیت اندوہ میں یہ تاریخ وفات کہی ؎

دوستاں را بہ غم سپرد و برفت | سوئے جنت، ملک حبیب احمد
۱۳۷۹ھ

ملک صاحب فی الحقیقت اپنی ذات میں اک انجمن تھے۔ اُن کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک دور ایک دبستان اور ایک ادارہ کی موت ہے۔ فَمَا کَانَ قَیْسٌ هُلْکُهٗ هُلْکَ وَاحِدٍ (قیس کی مت فرد واحد کی موت نہیں ہے) حق تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ اُن کو کروٹ کروٹ نصیب کرے اس کے مرقد کو منور کرے اور ان کے اعزہ و اقارب اور احباب کو صبر آزمائی فرمائے۔ ؎

جدائی از تو تصور نہ مے تواں کردن | چرا ایں جانِ گرامی ز تن جدا باشد!

---

[1] ادبی دُنیا۔ اشاعت غیر معمولی، فروری ۱۹۶۰ء "بزم ادب" متعلقہ وفات کرنل ملک حبیب احمد خاں۔

۱۸۵۷ء کے تین بنیادی پہلو

غلام رسول مہر

اس روشن حقیقت کے اعتراف میں غالباً کسی کو بھی تامل نہ ہوگا کہ اہلِ پاکستان نے ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار انتہائی جوش و جذبے سے منائی یادگار کے لیے جو ہفتہ مقرر کیا گیا تھا اس میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا پاکستان زندگی کے نئے ولولوں سے معمور ہو گیا ہے۔ اس کے طول و عرض میں جوشِ حیات کے نئے چشمے پھوٹ نکلے ہیں۔ اس طرح ثابت ہو گیا کہ ہمارے دلوں میں ان مجاہدوں کے لئے بڑی قدر و منزلت ہے جنہوں نے سو سال پیشتر آزادی کیلئے جان کی بازی لگائی اور بے باکانہ اس اجنبی طاقت سے ٹکرا گئے جو سطوت و قاہری میں بے پناہ مانی جاتی تھی۔

عظمت کی بنیاد

بے شک وہ کامیاب نہ ہوئے لیکن ان کی عظمت و رفعت عزم کی پائیداری، عمل کی گرمجوشی، ہمت کی استواری اور ایثار کی فراوانی پر تھی۔ قومی زندگی کی اصل متاعِ فخر ان چیزوں کے سوا کیا ہے؟ جس قوم کے پہلو میں بلند انسانی مقاصد کی خاطر مجاہدانہ سرگرمیوں کے لئے سچی تڑپ موجزن ہو، جس قوم کا سینہ ان اولوالعزم جانبازوں کے جذبات احترام سے لبریز ہو، جنہوں نے بیچارگی کی ظلمت میں اپنے خونِ حیات سے حریت و استقلال کے چراغ جلانے کی کوشش کی، یقین رکھنا چاہئے کہ وہ قوم زندگی کی امتحان گاہ میں ہمیشہ کامیاب و فائز المرام رہے گی اور قدرت اس کے لئے دنیا میں عزت و عظمت کی اوج گاہوں پر مسند آراستہ رکھے گی۔

اظہارِ حقیقت

لیکن اگر میں یہ کہوں کہ انتہائی جوش و خروش کے باوجود ہم اس تقریب سے وہ سبق حاصل نہیں کر سکے جن کے لئے یہ منائی گئی تھی تو امید ہے مجھے معاف رکھا جائے گا۔ بلاشبہ ہم نے ۱۸۵۷ء کو جنگِ آزادی قرار دیا، ہم بڑے بڑے مجاہدوں کے تذکروں میں مشغول رہے، بلکہ ہم نے محبت کی گرمجوشی میں بعض غداروں کے خلاف نفرت و حقارت کے اظہار میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے بنیادی اور اساسی حقائق ہمارے دلوں میں اس طرح تازہ نہ ہو سکے، جس طرح تازہ ہونے چاہئیں تھے۔ اگر آج ہم سے پوچھا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک جہاد کے چند ایسے پہلو پیش کرو، جنہیں سن لینے کے بعد پوری تحریک کی حقیقی کیفیت اجمالاً سامنے آ جائے تو شاید ہم میں سے ہر ایک کو شافی جواب دینے میں خاصی دقت محسوس ہوگی حالانکہ اس تحریک کے متعلق مستقل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ نیز شاید ہی کوئی رسالہ و اخبار ہو جس نے اس سلسلہ میں خاص نمبر نہ نکالے ہوں اور شاید ہی کوئی

قابلِ ذکر مقام ہو جہاں اس یادگار کے متعلق جلسے منعقد نہ کئے گئے ہوں۔ اس کا سبب کیا سمجھا جائے؟ میرے نزدیک تو اس کے سوا کوئی سبب نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی صحیح اور مستند تاریخیں اب تک نہ لکھی گئیں۔ اس تحریک کے بنیادی حقائق کا جائزہ نہ لیا گیا اور ہماری عام معلومات یا تو بالکل سرسری اور سطحی تھیں یا ہم نے بعض یک طرفہ انگریزی بیانات پر انحصار کیا اور یہ نہ سوچا کہ ان بیانات کے محرکات کیا تھے۔ قومی اور وطنی تحریکوں کے سلسلے میں اغیار کے بیانات پر انحصار مناسب نہیں ہوتا۔

تین بنیادی نکتے

میں نے جہاں تک غور کیا ۱۸۵۷ء کے تین پہلو خاص توجہ کے طلبگار نظر آتے ہیں اور انہی کو اس تحریک کے بنیادی و اساسی نکات سمجھنا چاہیے یعنی:

۱۔ یہ تحریک عام و ہمہ گیر تھی۔ اس میں تمام طبقات نے بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا تفریق درجہ و منصب حصہ لیا یا زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ فی الجملہ حصہ لیا۔ البتہ مختلف طبقوں اور گروہوں کی حصہ داری کے درجے مختلف تھے اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اس تحریک میں مسلمانوں نے اکثر مقامات پر علمبرداری کا فرض انجام دیا اور وہ ملک کی آبادی میں بہ لحاظ تعداد کم ہونے کے باوجود اس تحریک میں اس کثرت سے شریک ہوئے کہ بعض انگریزوں کو اسے اسلامی تحریک قرار دینے میں بھی تامل نہ ہوا۔ پھر مسلمانوں نے جو جانی اور مالی قربانیاں کیں یا انہیں جن قربانیوں سے سابقہ پڑا ان کی مثال نہ صرف پاک و ہند کی تاریخ میں بلکہ اکثر بیرونی ملکوں کے مجاہداتِ آزادی میں بھی بہ آسانی نہ مل سکے گی۔

۳۔ انگریزوں نے تحریک کے دوران میں اور کامیابی کے بعد ملک کی آبادی پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً ظلم و ستم کی جو قیامت برپا کی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

میں ان تینوں بنیادی نکتوں کے متعلق اجمالاً چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تفصیلات کے بحر بیکراں کے لئے کتاب کا سفینہ درکار ہے مقالہ ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

جہاد کی تیاریاں

مستند تاریخی دستاویزوں سے ثابت ہے کہ ملک کے مختلف افراد و عناصر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے انگریزی اقتدار کے خلاف مؤثر جہاد کے منصوبوں کو لباسِ عمل پہنانے کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ یقیناً اس زمانے میں مخابرت یا نشر و اشاعت کے وہ وسائل موجود نہ تھے جو ہمارے زمانے میں عام ہو چکے ہیں۔ عوامی تحریکوں کی اس وضع و صورت سے بھی عام لوگ ناآشنا تھے جس سے ہم متعارف ہیں اور خود ہمارے سامنے بھی اس نے نشو و نما کی خاصی منزلیں طے کی ہیں لیکن مختلف کارفرما وعظ بھی کہتے تھے، دورے بھی کرتے تھے، اشتہار بھی چھاپتے تھے اور خفیہ نامہ و پیام کے سلسلے بھی انہوں نے جاری کر رکھے تھے۔

چونکہ اس تحریک کی کوئی ایسی سرگزشت مرتب نہ ہو سکی جس میں تمام کارروائیاں تفصیلاً بیان ہوتیں بلکہ وہ کارفرما ہی باقی نہ رہے تھے جو پوری تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے ذمہ دار تھے۔ ان میں سے بعض میدانِ جنگ میں شہید ہو گئے، بعض گرفتار ہو کر جزائر انڈیمان میں پہنچ گئے، بعض نے زندگی کے بقیہ اوقات جلاوطنی میں گزارے یا پھانسیاں پا گئے لہٰذا تفصیلات کی ترتیب کا کوئی امکان نہ تھا۔ نیز انگریزوں کی قاہری کا یہ عالم تھا کہ اسا کرنے

۱۹۱۰ء میں جو کتاب مرتب کر کے لندن میں چھپوائی تھی وہ بھی یہاں ضبط کر لی گئی تھی حالانکہ اس میں کوئی خاص نئی چیز نہ تھی صرف اسلوب بیان میں وطنیت کا رنگ پیدا کیا گیا تھا۔ پھر کچھ مرتب ہونے کی کون سی صورت تھی۔

خفیہ تنظیمات کی شہادتیں

بایں ہمہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں بھی خفیہ ترتیبات و تنظیمات کی خاصی شہادتیں موجود ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ۱۸۵۲ء میں معلوم ہوا کہ راولپنڈی میں ۴۲ پیادہ رجمنٹ کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کوشش کا ذمہ دار مذکورہ رجمنٹ کا منشی محمد ولی تھا۔ اس کے خلاف مقدمہ چلا اور ۱۲ مئی ۱۸۵۳ء کو فیصلہ ہوا کہ منشی پر الزام ثابت ہے۔ غالباً اسے موت کی سزا دی گئی۔

۲۔ اسی قسم کا ایک واقعہ غالباً ۱۸۵۵ء میں بمقام پٹنہ بھی پیش آیا تھا جس کے باعث رجمنٹ کے منشی اور ایک اور آدمی کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

۳۔ نانا راؤ نے پنڈتوں کی ایک خاصی بڑی جماعت اطرافِ ملک میں پھیلا رکھی تھی جو فوجوں میں قومی مقاصد کے لئے پروپیگنڈا کرتے تھے۔ معلوم ہے کہ ان میں سے ایک پنڈت مدراس میں گرفتار ہوا، دوسرا علی گڑھ میں اور تیسرا امرتسر میں۔ خدا جانے اور کتنے کام کرتے رہے یا گرفتار ہوئے۔

۴۔ ۵۵ پیادہ فوج مردان میں مقیم تھی، اسے جماعتِ مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی صادق پوری کے کارکنوں نے ہم نوا بنایا تھا۔

۵۔ پنڈتوں کے علاوہ مولوی صاحبان بھی تبلیغ و اشاعت کے کام پر متعین کئے گئے تھے۔

۶۔ مولانا باقر علی لکھنوی نے صرف تنظیم جہاد کی غرض سے اپنا وطن چھوڑ کر پٹنہ میں اقامت اختیار کر لی تھی اور پردہ داری کے لئے کتابوں کی تجارت شروع کر دی تھی۔ ان کا اصل وظیفہ یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف تنظیمات کو تقویت پہنچائیں۔

۷۔ اپریل ۱۸۵۷ء میں ایک درویش میرٹھ میں نمودار ہوا۔ اکثر فوجی اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ انگریزوں نے اسے میرٹھ سے نکل جانے کا حکم دے دیا لیکن وہ اس حکم کے بعد بھی ۲۰ پیادہ فوج کی لائنوں میں بیٹھا رہا۔

۸۔ عظیم اللہ خان کانپوری نے مصر کے ذریعے سے قسطنطنیہ کے ساتھ روابط پیدا کئے تھے۔

۹۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی تنظیمات کا ذکر انگریزوں کی تصانیف میں موجود ہے۔

۱۰۔ بعض حصوں میں چپاتی اور بعض حصوں میں سرخ کنول کی تقسیم بھی قومی تنظیم ہی کا نشان تھی۔

۱۱۔ ایک مستند انگریزی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ جنگِ آزادی کے آغاز کے لئے باہم طے ہو چکی تھی لیکن اتفاق سے میرٹھ میں یکایک ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ۱۰ مئی کو ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس بنا پر تمام کارکنوں کو اپنے اپنے حلقوں میں تیاری مکمل کر لینے سے پیشتر ہی قدم اٹھانا پڑا۔

نصب العین کی وحدت

یہ تو تنظیمات کی سرسری کیفیت تھی۔ انہیں پیشِ نظر رکھ لینے کے بعد ہر سلیم الفطرت آدمی کو یقین ہو جائے گا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ کارکنوں کی خاصی بڑی جماعت اس سلسلے میں پہلے سے سرگرمِ عمل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہنگامہ کا آغاز ایک مقام کی فوج سے ہوا تا ہم اس کے

تھے پے در پے جگہ جگہ بھڑک اٹھے اور معاملہ صرف خروج تک محدود نہ رہا بلکہ عوام و خواص بھی بے تکلف شامل ہو گئے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ بعض کارفرماؤں کے محرکات مختلف تھے۔ کوئی اس بات پر ناراض تھا کہ انگریزوں نے اس کی ریاست چھین لی، کسی کو یہ شکایت تھی کہ اس کی پنشن ضبط کر لی گئی، کوئی اعزاز چھن جانے پر بگڑا بیٹھا تھا۔ ہمیں اس اختلاف کے وجوہ کی حقیقی حیثیت یا تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں تاہم وہ سب ایک بنیادی مقصد پر متفق تھے اور وہ یہ تھا کہ انگریزی تسلط کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا جائے اور اجنبیوں کے اقتدار کا دھبہ ملک کے دامن سے دھو ڈالا جائے۔ اصل تحریک کے تحریک آزادی ہونے کی بنیاد و اساس یہی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس میں ایک دو نہیں ہزاروں کارکن اور کارفرما ایسے تھے جن کی اپنی کوئی غرض نہ تھی۔ وہ صرف ملک کی آزادی کے لئے میدان میں آئے تھے، ان کے خلوص، ان کی بے غرضی اور اعلیٰ مقصد کے لئے جانبازی میں کسے تامل ہو سکتا ہے؟ محض یہی نہیں بلکہ جن کارفرماؤں کو خاص ذاتی شکایات کی بنا پر انگریزوں سے بیزاری پیدا ہوئی تھی، اصل تحریک شروع ہو جانے کے بعد وہ بھی محدود شکایات کو پس پشت ڈال کر آزادی اور صرف آزادی کے لئے وقف ہو چکے تھے، مثلاً حضرت محل، رانی لکشمی بائی یا نانا راؤ اور اس کے متوسلین۔

تحریک کی عمومیت اور ہمہ گیری

یہ امر بھی کسی خاص تشریح کا محتاج نہیں کہ تحریک عام و ہمہ گیر تھی۔ ملک کے بعض حصے ایسے تھے جہاں قریباً ہر مقام پر یکایک ہنگامے شروع ہو گئے بعض حصے ایسے تھے جہاں ابتدائی تنظیمات وسیع پیمانے پر مکمل نہ ہو سکی تھیں لہٰذا ہنگاموں نے وسعت اختیار نہ کی تاہم اس میں کلام کی گنجائش نہیں کہ عوام کی ہمدردیاں ہر جگہ مجاہدین کے ساتھ تھیں نہ کہ انگریزوں کے ساتھ اور اس حقیقت کی شہادتیں بھی خود انگریزوں کے بیانات سے ملتی ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ آج سے سو سال پیشتر آزادی کے وہ تصورات عام ہی نہ ہوئے تھے جن سے ہم روشناس ہیں لیکن یہ فکر و نظر کی افسوسناک کوتاہی اور فہم و بصیرت کی رنج دہ نارسائی ہے۔ ایک شے ہے آزادی جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اجنبی اور غیر کی حکمرانی برداشت نہ کی جائے۔ ایک شے ہے جمہوریت جس سے مراد یہ ہے کہ حکومت کسی ایک مطلق العنان فرد یا مجموعہ افراد کا حق نہیں بلکہ عوام کا حق ہے اور عوام ہی اپنے نمائندوں کے ذریعے سے انتظام حکومت کے مجاز ہیں۔ پہلی شے انسانیت کے ابتدائی دور سے اب تک برابر چلی آ رہی ہے اور یہ ۱۸۵۷ء میں بھی موجود تھی۔ دوسری شے کا تعلق آزادی سے نہیں بلکہ طریق و وضع حکومت سے ہے۔ ہو سکتا ہے ایک ملک کی حکومت اجنبی تسلط سے آزاد ہو لیکن جمہوری نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت کو جمہوری کہا جائے لیکن اس میں جمہوریت کی کوئی بھی خصلت موجود نہ ہو۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک یقیناً آزادی کے لئے تھی، البتہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور کی جمہوریت کے لئے نہ تھی اور ایسا دعویٰ کبھی کسی نے نہیں کیا۔

مسلمانوں کی قربانیاں

مسلمانوں نے اس تحریک میں بڑا ہی شاندار اور قابل صد ستائش حصہ لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی دور میں قومی زندگی کی حقیقی روح سے محروم نہ ہوئے، ان کی حمیت برابر زندہ و پائندہ رہی۔ انسانیت کے مقاصد عالیہ کے لئے انہوں نے متواتر شاندار قربانیاں جاری رکھیں۔ یہ مقام عزت و برتری انہیں اسلام کی برکت سے حاصل ہوا اگرچہ وہ اسلام کے پورے پابند نہ رہے تھے۔ اسی روح آزادی کا ایک ولولہ افروز مظاہرہ انہوں نے قیام پاکستان کے سلسلے میں بھی کیا۔

۱۸۵۷ء میں ان کی قربانیوں کا معاملہ بڑی تفصیلات کا محتاج ہے۔ اجمالاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے، ہزاروں کی تعداد میں توپوں سے اڑائے گئے، ہزاروں کو پھانسیاں ملیں اور [illegible] ۔۔۔ صرف دہلی شہر میں ستائیس ہزار آدمیوں کو حکومت کے گھاٹ

آ نا پڑا گیا اور ان میں سے بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ان کے گھر بار لُٹے، جائدادیں تباہ ہو گئیں، جاگیریں اور ملکیتیں ضبط کر لی گئیں۔ مثلاً دہلی اور اطراف میں ان کے املاک شمار سے باہر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ اقتصادی لحاظ سے اتنے خستہ ہو چکے تھے گویا ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ خدا جانے کتنی ریاستیں، کتنی امارتیں اور کتنی ثروتیں خاک میں مل گئیں لیکن قدرت کی کرشمہ فرمائیاں ملاحظہ ہوں کہ جن مسلمانوں کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں پستی و بیچارگی کی آخری منزل پر پہنچا دیا تھا وہ تھوڑی ہی دیر بعد پھر اُٹھے اور ان کے جوشِ حمیت کا سیل اس درجہ بے پناہ تھا کہ مخالف قوتیں متحد ہو کر بھی اسے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

انگریزوں کے ظلم

انگریزوں نے اس تحریک ۔۔ کے دوران میں اور اس کے بعد ظلم و ستم کی جو قیامت برپا کی اس کا کوئی صحیح نقشہ لفظوں میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ اگر میں صرف ۵۵ پیادہ فوج، ۱۵ پیادہ فوج اور ۲۶ ... یہ وہ فوج ہی کی داستان سناؤں تو بقولِ غالب ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر خونناب ٹپکنے لگے۔ دہلی میں خوبصورت اور وجیہہ نوجوانوں کو اس کثرت سے موت کے گھاٹ اتارا گیا کہ مولانا ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق دہلی سے صباحت و خوش رُوئی رخصت ہو گئی۔

ایسے ہی حالات ہر مقام پر، ہر شہر اور ہر قصبے میں پیش آئے۔ ہزاروں اشخاص بخونِ شہادت میں تڑپے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا اور وہ بھی تھے جن کے خلاف کوئی الزام عائد نہ کیا جا سکتا تھا اور ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ دہلی میں چند بیراں فوجی کمیشن کے سامنے پیش ہوئے۔ اگرچہ ان سے کوئی جرم سرزد نہ ہوا تھا مگر کمیشن نے ان کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی اور بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ ان لوگوں نے کبھی تو ہتھیار اٹھائے ہی ہوں گے۔

ظلم کی ستائش

یہ نکلسن، نیل، ہڈسن وغیرہ نے کیوں خاص درجہ شہرت حاصل کی اور کیوں انگریزوں کے قومی ہیرو بنے؟ صرف اس لئے کہ وہ بڑے بے باک، بے درد اور ظالم تھے۔ ہڈسن نے کسی سول یا فوجی عدالت سے فیصلہ حاصل کئے اور کسی صاحبِ اختیار کو اطلاع دئے بغیر ان شہزادوں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار دی جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا تھا اور وہ نہتے ہو چکے تھے۔ نکلسن لوگوں کو پھانسیاں دینے میں اس درجہ سرگرم تھا کہ گورے فوجی راستہ چلتے چلتے دور سے درختوں پر لاشیں لٹکتی ہوئی دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ نکلسن پہنچا ہوا ہے۔ اس نے حکم دے دیا تھا کہ کوئی کالا گورے کے پاس سے گزرے اور سلام نہ کرے تو اس سے سلام کراؤ یا گولی مار دو۔ اگر کالا سوار ہو تو اسے سواری سے اتر کر سلام پر مجبور کرو۔ بریگیڈیئر نیل ان سب سے بڑھا ہوا تھا اور خدا جانے ایسے لوگوں کی تعداد انگریزی فوج میں کتنی زیادہ تھی۔

ضروری گذارش

میرا مقصد خدانخواستہ یہ نہیں کہ ایک سو سال بیشتر کے زخموں کو از سرِ نو تازہ کروں اور جو خون زمانے کے امتداد سے خشک ہو چکا ہے اسے از سرِ نو معرضِ سیلان میں لاؤں لیکن جب تاریخی حقائق کا معاملہ سامنے آئے گا تو پردہ داری اور پردہ پوشی واجباتِ راستبازی کے سراسر خلاف سمجھی جائے گی۔

۱۸۵۷ء کے سلسلے میں ان تین بنیادی نکتوں کو پیشِ نظر رکھئے۔ اوّل تحریک عام و ہمہ گیر تھی۔ دوم مسلمانوں نے اس میں قابلِ فخر حصہ لیا اور ان کی قربانیاں دوسروں کے مقابلے میں بدرجہا ممتاز تھیں۔ تیسرے انگریزوں نے اس سلسلے میں جو تعدیاں کیں وہ ان کی تاریخ کا تاریک ترین باب ہیں۔ ان نکتوں کی روشنی میں آپ ۱۸۵۷ء کے واقعات و حوادث کا مطالعہ کریں گے تو ان کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے میں کوئی بھی دقت پیش نہ آئے گی۔

مطبوعات

بے قاعدہ
شوکت تھانوی کی یہ نئے انداز کی تصنیف، اردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہوگی اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی، بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے کے حروف آپ کے تمام پسندیدہ ادیب ہیں، مثلاً اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آ نہیں پڑھایا گیا ہے۔ مصوّر۔ قیمت -/۲

نقوشِ لطیف
مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔ یہ کتاب زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے اس میں اردو کی تمام نمائندہ افسانہ نگار نے اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ مجموعہ اتنا دلچسپ اور اتنے کام کا ہے کہ کبھی بھلایا ہی نہیں جاسکتا۔ قیمت -/٦

قریباً تمام افسانہ نگار خواتین کے نوٹ بھی شامل ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے

مضامین جمال الدین افغانی
جمال الدین افغانی الیسا نڈر اور بے باک رہنما تھا جس سے انگریزوں کی سلطنت کانپ اٹھی تھی ان جیسا انگریزوں کا دشمن اور مسلمانوں کا خیر خواہ ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔

مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے انہوں نے عربی میں ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں جتنے آتشیں مضامین نکلے تھے۔ وہ سب اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر لاکر تمام دنیا کی سرداری کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ آج بھی پورا ہوسکتا ہے۔ قیمت -/۵

انتقاد
سید عابد علی عابد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ، عابد صاحب نامور شاعر، بہترین انشاپرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقیدیں روائتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یادہ گوئی نہیں ہوتی۔ یہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہیں اور جچی تلی بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں شعروں کی سی مٹھاس اور فیصلوں میں تلوار کی سی کاٹ موجود ہے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ کا غلط استعمال گناہ ہے اور یہ بھی گناہ ہے کہ نقاد اپنے ساتھ قاری کو بھی الجھا دے۔ قیمت -/۳

خلفائے محمدؐ
ابوالنصر شام کا سب سے بڑا مؤرخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں اُن کا ساری دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ خلفائے محمدؐ میں اس نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پہ دنیا جہان کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جو ان خلفا پر سب سے معیاری اور مستند کتاب ہے۔

ترجمہ بے حد سلیس۔ قیمت -/-/۱۰

صاحب
یہ کتاب اُن اسکیچوں کا مجموعہ ہے۔ جو محمد طفیل مدیر نقوش نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان اسکیچوں میں پورے خلوص اور پوری دیانت کے ساتھ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تمام اچھی اور بُری باتوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، عابد علی عابد اور احسان دانش کے اسکیچ شامل ہیں قیمت -/۳

شعلۂ طور
یہ جگر مرادآبادی کا وہ مقبول عام مجموعہ کلام ہے جسے اردو شاعری میں سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ ہمارے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور کئی کمزور اشعار کو حذف کر کے کئی ایک غیر فانی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ قیمت /۸/۷

سرکنڈوں کے پیچھے
یہ منٹو کی آخری کتاب ہے جو مرحوم کی زندگی میں چھپی تھی۔ منٹو ہی وہ بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہے جس نے بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر مقدمے چلے اور "زیادہ سنجیدہ" حضرات نے ناک بھوں چڑھائی مگر وہ لکھتا رہا۔ ادب کی بقا کی خاطر لکھتا رہا۔ اس کتاب میں بھی ان کے کئی زندہ رہنے والے افسانے شامل ہیں۔

قیمت -/-/۳

ادارۂ فروغ اردو۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

بازارِ حیات

یہ احمد ندیم قاسمی کے خوبصورت افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جتنے معیاری افسانے ندیم نے لکھے ہیں۔ اتنے اور کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ اس مجموعے میں ان کے وہ تمام تازہ افسانے شامل ہیں۔ جن پر ندیم کو اور اردو افسانے کو فخر ہونا چاہیئے۔ افسانوی ادب میں یہ مجموعہ ناقابلِ فراموش ہے۔ قیمت ۔ ۳/۸/-

اُردو غزل گوئی

اُردو تنقید میں غزل پر اتنی کام کی کتاب اور نہ ملے گی۔ اس لئے کہ اس کا مصنّف فراق گورکھپوری غزل کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ مغربی تنقید اور مشرقی تنقید کا جتنا رچا ہوا مذاق فراق کا ہے، اتنا اُردو کے نہ کسی شاعر کو نصیب ہوا اور نہ کسی نقاد کو۔ قیمت ۔ ۲/-

اندازے

مصنف فراق گورکھپوری۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے۔ اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ اندازے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں اردو کے تنقیدی سرمائے میں اس سے بہتر کتاب پیش نہیں کی جاسکی۔ اب اس مجموعہ کو بڑی اہم تبدیلیوں اور کئی نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۔ ۵/-/-

امراؤ جان ادا

اردو ادب میں سب سے دلچسپ اور سب سے معیاری ناول اگر کوئی ہے تو وہ صرف امراؤ جان ادا ہی ہے۔ یہ ایک بیسوا کی داستانِ حیات ہے جسے مرزا رسوا نے لکھ کر خود بھی دائمی شہرت حاصل کرلی اور ادا کے کردار کو بھی لافانی کرداروں میں شامل کردیا۔ اس ناول کو اگر زبان کے اعتبار سے ہی پڑھ لیا جائے تو بھی بہت سیکھا جاسکتا ہے یہ ناول اپنی تمامتر دلچسپیوں کے ساتھ لکھنوی معاشرت کا مرقع بھی ہے۔ خورشید الاسلام کا معرکۃ الآرا دیباچہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ قیمت ۔ ۴/-/-

منٹو

یہ سعادت حسن منٹو کی افسانوی رنگ میں سوانح ہے۔ جسے منٹو کے بچپن کے دوست ابو سعید قریشی نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں بڑا توازن اور بڑی کام کی باتیں ہیں۔ اس میں منٹو کی نہ تو بیجا تعریف ہے اور نہ ہی خدا واسطے کی دشمنی، منٹو جو کچھ اور جیسا کچھ تھا، اُسے ہو بہو ابو سعید قریشی نے پیش کردیا ہے۔ قیمت ۔ ۱/۸/-

قول و قرار

یہ عدم کا مجموعۂ کلام ہے۔ عدم اُردو کا ایک ایسا غزل گو شاعر ہے جو سیدھے سادے سے انداز میں عشق و محبت کے معاملات کو پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھاری بھرکم ترکیبوں اور استعاروں سے ان کا ذہن اور قلم بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل بناوٹ نہیں ہے۔ بلکہ فن کی تمام صداقتوں کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔ قیمت ۔ ۳/-/-

پیچ و خم

یہ بھی عدم کی ایک سرسے نازک ترنم دلآویز اور پیاری پیاری سی غزلوں کا ایک سادہ سا مجموعہ ہے۔ جسے اب پچاس نئی غزلوں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس کی ہر ہر غزل اور ہر ہر شعر پر جھوم جھوم اُٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ داغ کے بعد جتنی روانی اور سلاست ان کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو میسّر نہیں ہے قیمت ۲/-/-

تاملاتِ نیاز

اس مجموعے میں نیاز فتحپوری کے ایسے ایسے نادر مضامین ہیں۔ جو ان کے رسالے "نگار" میں چھپ کر دنیائے ادب میں تہلکہ برپا کرچکے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ لکھ لکھ کر رسم و رواج اور نظریات کی وہ وہ دھجیاں بکھیری ہیں کہ جھوٹے تقدس مآب اور رسم و رواج کے سہارے زندہ رہنے والے بوکھلا اُٹھے۔ قیمت ۔ ۲/۸/-

اصحابِ کہف

نیاز فتحپوری نے مصر کے ایک بڑے مشہور ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کے ایک نادر ڈرامے کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ڈرامہ قرآن کے ایک مشہور واقعہ سے متعلق ہے۔ جو قرآن سے قدرے مختلف ہے۔ لیکن جو کچھ اس میں ہے اور اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ بعید از عقل نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ مصر میں بے حد مقبول ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں بھی بڑی مقبولیت ہوئی۔

قیمت ۔ ۱/۱۲/-

ادارۂ فروغ اُردو، ایبک روڈ، انار کلی، لاہور

جھوم اٹھتا ہے، اور خواہش پیدا ہوتی ہے کہ خدا سب کو ایسی ہی سسرال بخشے۔ لیکن اس کتاب کا ہیرو تو سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہے۔ عجیب بات ہے

قیمت ۲/۴

کارٹون

شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں اس لئے ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام "کارٹون" ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی اوروں کا شکار نہیں ہوا ہے۔ وہی رواں دواں سبک وہی بے ساختہ اور بے تکلف۔ شروع سے آخر تک تبسم کی موجوں کا جال بچھاتا چلا گیا ہے۔ جو اس منفرد مزاح نگار کا طرۂ امتیاز ہے۔

قیمت ۳/۸

مابدولت

شوکت کی زد پر شوکت، شوکت تھانوی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔ "مابدولت" میں ایک نہایت نازک موقع پر خود اپنے متعلق لکھتے ہیں: "ادھر سے پسندیدہ نظریں ادھر سے ان کی پذیرائی۔ آخر شیطان نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے"۔ یہ اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک سچ شوکت تھانوی نے اپنی اس خود نوشت سوانح حیات میں لکھے ہیں۔

قیمت ۳/-

بقراط

یہ یونانی حکیم بقراط کا تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ شوکت تھانوی نے اپنے اس مزاحیہ ناول میں ایک ایسے کردار کو نمایاں کیا ہے جو ہر فن مولا کی حیثیت رکھتا ہے۔ شوکت تھانوی کا مزاح اپنے اندر قہقہوں اور کبھی کبھی قہقہوں میں ایک تعمیری نکتہ رکھتا ہے اس کا اندازہ اس ناول کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ قیمت ۲/۸

جوڑ توڑ

جوڑنا ایک مستقل کام ہے، توڑنا ایک دوسرا مستقل کام ہے۔ پھر توڑ کر جوڑنا اور جوڑ کر پھر توڑنا، یا اللہ یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شوکت تھانوی کا تازہ مزاحیہ ناول "جوڑ توڑ" ملاحظہ فرمائیے۔ جب تک یہ ناول آپ کے مطالعہ میں رہے گا آپ سوائے اس کے پلاٹ میں گم ہونے اور اس کے قہقہوں میں ہچکولے کھانے کے اور ہر فکر دنیا اور غم روزگار سے آزاد رہیں گے۔ قیمت ۴/-

مضامین شوکت

اگر کوئی شخص صرف شوکت تھانوی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلاشبہ اور کچھ بنے یا نہ بنے، زبان داں تو بن ہی جاتا ہے۔ آپ کو زبان میں دھلی ہوئی صفائی، پلاٹ کی دلآویزی، شگفتہ و لطیف پیرایۂ بیان ۔۔۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو شوکت تھانوی کے آرٹ کو زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔ مضامین شوکت میں جو مضامین شامل ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ قیمت ۲/۸

غالب کے ڈرامے

آپ حیران ہوں گے کہ غالب کا ڈرامے سے کیا تعلق۔ غالب کی نظم اور غالب کی نثر کا علم کس کو نہیں مگر شوکت تھانوی نے غالب کے ڈرامے بھی پیش کر دیئے۔ شوکت نے یقینی موضوع غالب کے کلام سے نچوڑے ہیں۔ اور دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ اس کو مرزا غالب کا کمال سمجھا جائے ۔۔۔ یا شوکت تھانوی کا۔

قیمت ۲/۸

قاضی جی (تین حصے) فی حصہ ۲/۸ **وغیرہ وغیرہ** قیمت ۳/-

کارآمد اور صد درجہ نازک اور علمی مسائل پر تبصرہ بھی ہے۔

قیمت ۳/-

پندرہ اگست

رشید اختر ندوی کا مقبول عام ناول۔ یہ ناول اس دور کی تاریخ ہے۔ جب انسان آزادی ایسی نعمت ملتے ہی حیوان بن گیا تھا۔ آزادی ملتے ہی مسلمانوں پر جو کچھ بیتی یہ ناول اس کی تفسیر ہے۔ جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنی زبردست قربانیوں کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں آج بھی بند ہیں۔ نہ جانے یہ ان کی کن تباہیوں کا پیش خیمہ ہے۔

قیمت ۳/-

پانچ ناولٹ

مرتبہ سید وقار عظیم۔ اس مجموعہ میں شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور انتظار حسین کے بہترین ناولٹ شامل ہیں۔ یہ مجموعہ بے حد مقبول ہوا ہے ۔۔۔ اس ایک مجموعے میں پانچ بہترین ناولٹوں کے علاوہ تین چار بہترین مقالے اور دو تین بہترین منظوم کہانیاں بھی شامل ہیں۔

قیمت ۳/-


تعلیم و تربیت کا اہم منصوبہ
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے۔

[illegible]

مکاتیب نمبر

مشاہیرِ ادب کے ہزاروں نایاب اور تاریخی اہمیت کے خطوط

[illegible]

غالب، سرسید، حالی، محسن الملک، وقار الملک، [illegible]
آزاد، اقبال، [illegible]، شبلی، سلیمان ندوی، [illegible] مولانا محمد علی،
شوکت علی، حکیم اجمل خان، [illegible] ابوالکلام آزاد، [illegible] ظفر علی خان،
نیاز فتحپوری، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک،
رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری،
حفیظ جالندھری، [illegible] قاسمی

اسی

سیکڑوں زندہ رہنے والے شاعروں اور ادیبوں کے غیر مطبوعہ خطوط

نقوش

کا آئندہ شمارہ مکاتیب نمبر ہوگا

یہ نمبر نقوش کے سابقہ تمام نمبروں سے زیادہ قابلِ قدر ہوگا

مدیر نقوش لاہور